دِلی تھا جس کا نام
انتظار حسین

دِلی تھا جس کا نام

انتظار حُسین

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

954.023 Intizar Hussain
Dilli Tha Jis Ka Naam/ Intizar Hussain.- Lahore : Sang-e-Meel Publications. 2003.
192p. + Photos
1. Social History - Muslim India.
I. Title.

2003
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1491-2

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

ترتیب

1-	معذرت	5
2-	اندر پرستھ سے دلی تک	6
3-	نئی تہذیب نیا شہر	14
4-	دلی سے آگرہ کی طرف	22
5-	شہر آباد جہان آباد	27
6-	یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا	35
7-	سحر ہونے سے پہلے	42
8-	کوچہ و بازار	53
9-	رسمیں ہی رسمیں گیت ہی گیت	63
10-	ایک شہر پانچ ہنگامے	72
11-	کتنے مشغلے کتنی بازیاں	84
12-	دس انگلیاں دس ہنر	91
13-	رنگ، خوشبوئیں، ذائقے	95
14-	بائیس خواجہ کی چوکھٹ	102

-15	بانکے، انوکھے نرالے	110
-16	جن و پری پیر فقیر	114
-17	یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا	119
-18	گیارہ مئی کے بعد	127
-19	کہاں گئے وہ لوگ	137
-20	فلک بالِ ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی	143
-21	اجاڑ شہر	150
-22	زمانہ بدلا شہر بدلا	158
-23	یادش بخیر دہلی کالج	164
-24	نیا راج نئی راجدھانی	168
-25	محبت کا آخری ابال	178
-26	کتابیات	190

معذرت

ناشر حضرات اپنے فکشن نگاروں سے بالعموم بکاؤ ناول لکھنے کی فرمائش کیا کرتے ہیں اور اس میں دونوں ہی کا بھلا ہوتا ہے۔ مگر نیاز صاحب نے اس کم مایہ سے اور ہی قسم کا تقاضا کر ڈالا۔ اصل میں انہوں نے 'اجمل اعظم' چھاپنے کے ساتھ اسے پڑھ بھی لیا۔ جانے کونسی شبھ گھڑی میں پڑھا کہ اس میں جو دلی کا بیان ہے وہ انہیں بھا گیا۔ کہا کہ دلی کا ایک پورا بیان ہو جائے۔ کتاب چھاپیں گے۔ میں نے اس فرمائش کو سرسری جانا۔ ہاں ناں میں جواب دینا ایسا ضروری نہیں سمجھا۔ مگر وہ تو اپنی فرمائش میں سنجیدہ نکلے۔ ایسے سنجیدہ کہ فوراً ہی کتاب کی آمد کا اعلان بھی کر دیا۔ نام بھی اپنی طرف سے تجویز کر دیا۔

اس طرح میں پکڑا گیا۔ اس گمشدہ نگر کا جادو اپنی جگہ' اس جادو کو جاننے اور بیان کرنے کی خواہش اپنی جگہ مگر آدمی کو اپنی بساط بھی تو دیکھنی چاہیے۔ کیسا کیسا دلی کا روڑا پچھلی ایک ڈیڑھ صدی میں پیدا ہوا اور کس کس کمال کے ساتھ اس نگر کو بیان کیا۔ ایک تو میں دلی کا روڑا نہیں۔ قصباتی کنکر ہوں۔ انہوں نے اس دلی کو کہ جہان آباد تھی برتا اور بسر کیا۔ جو بعد میں آئے۔ انہوں نے بزرگوں کے وسیلہ سے اسے بسر کیا اور اپنے اندر اتارا۔ میں قصباتی کنکر زمانی اور مکانی دونوں اعتبار سے بہت فاصلہ پر کھڑا ہوں۔ پھر ان کے جیسا قلم کہاں سے لاؤں۔ ناصر نذیر فراق' منشی فیض الدین' مرزا فرحت اللہ بیگ' اشرف صبوحی' شاہد احمد دہلوی' کس کس نے اس نگر کے نام کیسا کیسا سمان باندھا' کیسی کیسی تصویریں ہمیں دکھائی۔ مجھ مورکھ کو دیکھو کہ پھر بھی مچلا ہوا ہوں کہ اس شہر کو بیان کرنا ہے۔ مگر میں کیا کرتا۔ ایک طرف اس گم نگر کا جادو' دوسری طرف ان بزرگوں کے کھینچے ہوئے نقشے' اوپر سے ایک زوردار فرمائش۔ میں للچا گیا۔ قلم ہاتھ میں تھا' چل پڑا۔

تو یوں یہ نگر کتھا لکھی گئی۔ احسان سر آنکھوں پر دلی کے ان سب روڑوں بزرگوں کا جن کی تحریروں سے میں نے فیض پایا اور اپنی تحریر کو سجایا۔

انتظار حسین

14 جنوری 2003ء

لاہور

اندر پرستھ سے دلی تک

کوئی بھی بستی اپنا آپ آسانی سے نہیں دکھاتی۔ اور پھر دلی ایسی بستی جس کے متعلق میرؔ نے خبردار کیا تھا کہ اور بستی نہیں یہ دلی ہے۔ ہم آپ کس شمار قطار میں ہیں وہ جو دلی کے گلی کوچوں کی خاک پھانک پھانک کے دلی کے روڑے بن گئے تھے انہیں بھی اس بستی نے اپنا آپا کتنا دکھایا۔ جتنا دکھایا اس سے زیادہ چھپالیا۔ تو میری اس کوشش کو بس شوقِ فضول جانئے۔ سچ پوچھو تو مجھے تو دلی کی بس ایک شام نے باولا بنا رکھا ہے۔ بھادوں کی یہ اداس شام دم بھر کے لیے مجھ پر ظاہر ہو کر اوجھل ہو گئی۔ دوبارہ بیان کرنا اسے مقصود نہیں۔ پہلے بھی اسے کہاں بیان کر پایا تھا۔ بس اشارہ کر رہا ہوں۔ یہ تقسیم سے ڈھائی تین برس بعد کی ایک شام تھی۔ میں جتن کر کے دلی پہنچا ہوا تھا۔ جب ہم نے اس مبارک کوچے میں قدم رکھا جسے حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کہتے ہیں تو دونوں وقت مل رہے تھے۔ مگر وہ جو یہاں گہما گہمی نظر آتی تھی اور کھوے سے کھوا چھلتا تھا وہ غائب۔ وہ جو درگاہ سے باہر گلاب، اگربتی، موم بتی کی دکانوں پر خریداروں کا ہجوم ہوتا تھا وہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اندر خاموشی کا ڈیرا تھا۔ کسی سمت سے تین قوالوں کی ٹولی گلے میں ہارمونیم ڈالے نمودار ہوئی۔ ہارمونیم اتار کر سامنے رکھا اور فوراً ہی شروع ہو گئے ؎

گھر گھر میں اداسی چھائی ہے شبیر مدینہ چھوڑ چلے

ہم نے تھوڑی دیر انہیں سنا اور پھر باہر نکل آئے۔ ہم یعنی میں اور اپنے پرانے دوست جن کا میں مہمان تھا، ریوتی اور سنگھ۔ ریوتی نے کہا، تجھے پتہ ہے غالب کا مزار بھی یہیں ہے۔ چلو اس طرف بھی ہوتے چلیں اور ہم پگڈنڈی سے اتر کر لمبی لمبی گھاس کے بیچ چلنے لگے۔ جنم اشٹمی گذر چکی تھی۔ گھاس ساون بھادوں کے چھینٹے کھا کھا کر کتنی سبز اور کتنی لمبی ہو گئی تھی۔ اسی گھاس کے بیچ ایک اجاڑ چبوترہ نظر آیا۔ اردگرد کچی پکی

چہار دیواری۔ اندر تین خستہ حال قبریں۔ ایک قبر غالبؔ کی تھی۔ میں نے فاتحہ پڑھی۔ ہم باہر نکل آئے۔ پھر لمبی لمبی گھاس کے بیچ چلنے لگے۔ اردگرد خاموشی کا ڈیرا تھا۔ صرف دور سے آتی ہوئی ایک مور کی جھنکار نے اس خاموشی کو توڑا تھا۔ اس کے بعد خاموشی اور گہری ہوگئی تھی۔ میرے حافظہ میں امیر خسرو کا وہ دوہا منڈلانے لگا جو میں ابھی ان کے مزار پر پڑھ کر آیا تھا ؎

گوری سووے سیج پہ اور مکھ پہ ڈارو کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چوندیس

اس کے بعد مجھے دلی جانے کے لیے تیس سال تک انتظار کرنا پڑا۔ پھر کہیں اس بستی کے پھیرے کی صورت نکلی۔ ایک پھیرا۔ پھر دوسرا پھیرا۔ پھر تیسرا پھیرا۔ ہر پھیرے میں حضرت نظام الدین اولیا کے کوچے کا پھیرا ضرور کیا۔ مگر اب تو سارا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ گہما گہمی۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہوا۔ ہر دکان پر گلاب کے پھولوں کے ڈھیر کے ڈھیر۔ چوکھٹ کو پار کر کے مزار تک پہنچنے کے لیے دھکم پیل۔ اور ہاں غالب کی قبر والا چبوترہ غائب۔ گھاس ندارد۔ اب یہاں سنگ مرمر کا وسیع چبوترہ تھا۔ اس کے اردگرد خوبصورت جالی۔ اندر سنگ مرمر سے بنی ہوئی قبر۔ اس کے متصل ایک وسیع غالب ہال۔ ہر پھیرے میں گہما گہمی پہلے سے زیادہ نظر آئی۔ اور ہر مرتبہ مجھے بھادوں کی وہ اداس شام بے طرح یاد آئی اور جنگلی گھاس کے بیچ وہ اجڑی اجڑی کچی پکی قبر۔ یا اللہ وہ شام کہاں جا کر چھپ گئی اور وہ قبر کہاں گم ہوگئی۔ میں اسے کہاں ڈھونڈوں۔

اور اب جب میں اس خاموش اداس شام کو جو میرے لیے گمشدہ دلی کا استعارہ بن گئی ہے یاد کر رہا ہوں تو مور کی وہی جھنکار میرے حافظہ میں گونج رہی ہے۔ اور اس سے مجھے ڈی ایچ لارنس کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی۔ اس نے کہا کہ بعض پرندوں کی چہک مہک میں مستقبل کی نوید ہوتی ہے۔ بعض پرندوں کی اداس آواز ہمیں ماضی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس نے اپنے دیس کے پرندوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ کس پرند کی آواز میں مستقبل کی نوید ہوتی ہے اور کس کی آواز سننے والے کو ماضی میں لے جاتی ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ ہمارا مور عجب پرندہ ہے۔ اس کی جھنکار میں ماضی اور مستقبل دھوپ چھاؤں کی طرح اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ جب ساون سوکھا گذرتا چلا جاتا اور ایک روز اچانک گھٹا امنڈتی دکھائی دیتی اور دور سے موروں کی جھنکار سنائی دیتی تو میری نانی اماں کہتیں کہ مور بول رہے ہیں مینھ پڑے گا۔ پھر جب ساون کی جھڑی لگتی اور کسی شام دن بھر کی بارش کے بعد ایک وقفہ آتا' مینھ تھم جاتا اور کہیں دور سے کسی بھٹکے ہوئے مور

کی جھنکار سنائی دیتی تو اس میں کتنی اداسی ہوتی۔ لگتا کہ ماضی کے کسی دیار سے آ رہی ہے اور ہمیں ماضی کی طرف کھینچے لیے جا رہی ہے۔ اور اس گھڑی جب اس اکیلے بھٹکے ہوئے مور کی اداس جھنکار بھادوں کی اس اداس شام کے دھندلکے کو چیرتی ہوئی میرے کانوں میں آ رہی ہے تو لگ رہا ہے کہ یہ آواز مجھے ماضی میں جانے کہاں کہاں کھینچے لیے جا رہی ہے۔ اور میں حیران ہو رہا ہوں کہ صدیوں کے اس سفر میں دلی کتنی بار لٹی کتنی بار آباد ہوئی۔ مگر میں تو یہ جاننے کے درپے ہوں کہ یہ پہلی بار کب آباد ہوئی تھی۔ کون بسانے والے تھے، کون بسیا تھے۔ یہ کھوج کتنے محققوں کو اندر پرستھ تک لے گئی ہے۔ مگر وہ بستی دلی کب تھی، اندر پرستھ تھی، یا اندر پوری، یا اندر پت۔ مہا بھارت پڑھ لو پتہ چل جائے گا کہ کیسے آباد ہوئی۔ جیسے اب جھگڑا فساد پڑا اور بٹوارہ ہوا کہ دو ملک بن گئے ایسے ہی تب بھی ہوا تھا۔ دھرت راشٹر نے بھتیجوں سے کہا کہ روز روز کی تکا فضیحتی سے بہتر یہ ہے کہ تم اپنا حصہ لے کر الگ بیٹھو اور اپنا دیس آباد کرو۔ تو کھانڈو بن تمہیں دیا۔

تب پانڈوؤں نے ہستنا پور کو آخری سلام کیا اور کھانڈو بن میں آن براجے۔ مگر کھانڈو بن اجاڑ جگہ، گھنا جنگل، آدمی ندارد، سانپ ہی سانپ۔ مہا بھارت نے کیا کمال دکھایا ہے کہ ایک ایک سانپ کا نام لکھا ہے کہ کون کیسا زہری تھا اور یہاں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ ارجن تیر کمان لے کر کھڑا ہو گیا۔ کرشن جی اس کی کمک پر تھے۔ مگر یہ سانپ خالی ارجن کی تیر کمان سے نہیں سنگھوائے جا سکتے تھے۔ پانڈوؤں کے نصیب بھلے تھے کہ اگنی دیوتا کی کمک انہیں حاصل ہو گئی۔ اس نے سب سانپوں کو جلا کر خاک کر دیا۔ بس ایک سانپ بچ نکلا کہ وہ اس دن یہاں تھا ہی نہیں۔ دوسرے بن میں گیا ہوا تھا۔ اس نے بچ کر کیا کھیل کھیلا اور پانڈوؤں سے کیسے بدلہ لیا۔ یہ داستان الگ ہے۔ مطلب تو یہ ہے کہ یہ بن صاف ہو گیا اور ایک نئے نگر کا ڈول پڑ گیا۔ کیا نگر تھا جس کے گرداگرد ایسی فصیل کہ دور سے دیکھو تو لگے کہ سفید سفید دل بادل امنڈ رہے ہیں۔ ان فصیلوں پر قطار اندر قطار تیر تلوار سے مسلح سپاہی بیٹھے ہوئے۔ فصیلوں پر برجیاں اور پھاٹک ایسے جیسے پہاڑ کھڑے ہیں۔ فصیل کے گرداگرد سمندر کی سی وسعت رکھنے والی خندق۔ ان کے متصل قطار اندر قطار باغ جو کوئلوں کی کوک اور موروں کی جھنکار سے گونجتے رہتے۔

اس نئے نگر کی خبر دور دور پہنچی۔ دور دور سے ودھوان، کلاکار، پنڈت، جوتشی، بیوپاری، ہنرمند کھنچ کھنچ کر آئے اور اندر پرستھ ایک شاد آباد نگر بن گیا۔ مگر ایسا شاد آباد نگر اجڑ کیسے گیا۔ اس پر کوئی بڑی چڑھائی بھی نہیں ہوئی۔ ہوتی کہاں سے۔ ان کے سارے دشمن تو کوروکشیتر میں کھیت ہو چکے تھے۔ تاریخ تو اس زمانے کی ہے نہیں۔ ہاں روایتیں بہت ہیں اور جتنے منہ اتنی باتیں، اتنی روایتیں۔ ایک روایت بشیر الدین احمد

ڈھونڈ کر لائے اور اپنی تصنیف 'واقعات دارالحکومت دہلی' میں اسے درج کیا۔ اب میں تحقیق کرنے والوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اسے نقل کرتا ہوں۔ کوروں کا ٹنٹا ختم ہو چکا تھا۔ اب راوی پانڈوؤں کے لیے چین لکھتا تھا۔ یدھشٹر مہاراج راج گدی پہ بیٹھے راج کرتے تھے۔ پانڈو برادران چین کی بنسری بجاتے تھے۔ ساتوں نعمتیں انہیں میسر تھیں۔ اور دستر خوان کی کیا پوچھتے ہو۔ قسم قسم کا بھوجن قسم قسم کے ذائقے۔ مگر ایک دن کیا ہوا کہ جب بھوجن پروسا جا رہا تھا تو ایک منحوس مکھی کہیں سے اڑ کر آئی اور بھوجن پر بیٹھ گئی۔ اندر پوری کی پوتر فضا میں اور پھر وہاں کے راج محل میں جہاں کی صفائی کی دیوتا قسم کھاتے تھے مکھی۔ یدھشٹر مہاراج سناٹے میں آ گئے۔ ایسی گھن آئی کہ کھانا بغیر کھائے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر اندر پوری ہی سے ان کی طبیعت متنفر ہو گئی نہیں دنیا ہی سے جی بیزار ہو گیا۔ راج محل چھوڑا' اندر پوری کو آخری سلام کیا اور انتم یاترا پہ نکل کھڑے ہوئے۔ پانڈو بھائی اور دروپدی نے بھی ان کے ساتھ ہی اپنے نگر کو سلام کر لیا۔ اندر پرستھ کی ساری رونق' ساری شوبھا اس کے راج دلاروں کے ساتھ چلی گئی۔ وہ شاد آباد نگر دیکھتے دیکھتے ویران ہو گیا۔ اے منحوس مکھی تیرا برا ہو' کیا شاد آباد بستی تھی جسے تیرے ندیدے پن نے غارت کر دیا۔

پھر زمانے نے اس نگر کو ایسا فراموش کیا کہ کسی تذکرے میں پھر اس کا ذکر ہی نہیں آتا۔ آخر پانڈوؤں کے بعد اس پر کیا بیتی۔ بس جیسے یہ نگر صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ گیا ہو۔ ہاں اتنا ذکر آتا ہے کہ زمانے بعد یہیں کہیں کسی چھوٹے موٹے راجہ نے جس کا نام دہلو تھا ایک بستی بسائی۔ اس کے نام پر اس بستی کا نام دہلو پڑ گیا۔ دہلو ہی کا نام بگڑ کر رفتہ رفتہ دہلی اور پھر دلی بن گیا۔ لیجیے یہ ہے دلی کی اصل اور وجہ تسمیہ۔ اندر پرستھ اجڑا تو دلی آباد ہوئی۔ کہتے ہیں کہ دلی میں جہاں پرانا قلعہ ہے وہیں اصل میں اندر پرستھ کا راج نگر تھا۔

چلیے راجہ دہلو نے ایک نگر بسایا جس کا نام دہلو پڑ گیا اور پھر اسے لوگ دہلی کہنے لگے۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا۔ کچھ پتہ نہیں۔ ہاں بھاٹوں کے ایک کبت میں کچھ اس قسم کا ذکر آیا ہے کہ یہ نگر سات سو بانوے برس تک اجاڑ پڑا رہا۔ اس کے بعد جا کر کہیں آباد ہوا۔ کب آباد ہوا لیجیے اب تاریخ بولتی ہے اور یہ نگر گمنامی کے پردے سے نکلتا ہے۔ راجہ انگ پال نے 1052ء میں اسے اپنی راجدھانی بنایا اور دھوم کے ساتھ آباد کیا۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب محمود غزنوی ہندوستان میں مار دھاڑ کر کے واپس جا چکا ہے۔ اور اب تنوار خاندان کا راجہ انگ پال سکھ کا سانس لیتا ہے۔ دلی کو اپنی راجدھانی بناتا ہے' نگر کے گرد فصیل کھنچواتا ہے۔ مندر تعمیر ہوتے ہیں۔ بند باندھے جاتے ہیں۔ تالاب بنائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ لال کوٹ

نام کا قلعہ تعمیر کیا جاتا ہے۔ کیا رعب داب والا لال کوٹ ہے۔ پھاٹک کے دائیں بائیں پتھر کے دو شیر کھڑے ہیں جن میں زنجیر لٹکی ہوئی ہے۔ فریادیوں کو کھلی چھٹی ہے کہ آئیں، زنجیر کھینچیں۔ ان کی فریاد سنی جائے گی، انصاف کیا جائے گا۔ یہ تھی سرزمین ہند پر زنجیر عدل کی ابتدا۔

انگ پال نے جانے کتنے برس تک راج کیا۔ بہرحال اس کی نسل خوب چلی اور تنوار خاندان نے کم وبیش سو برس تک بلا کھٹکے راج کیا۔ کہیں سو سال بعد سمجھ لو کہ 1151ء میں چوہان خاندان نے زور پکڑا اور اس کے ایک راجہ بسال دیو نے دلی پر دھاوا بولا اور اسے فتح کرلیا۔ لیکن جلد ہی فاتح اور مفتوح میں ملاپ ہوگیا۔ صلح اس شرط پر ہوئی کہ تنوار کا راجہ چوہان خاندان کی راجکماری سے بیاہ کرلے۔ پھر اس سے جو بیٹا پیدا ہو وہ دلی کے تخت پہ بیٹھے۔ تو لیجئے بیاہ ہوگیا۔ جو بیٹا پیدا ہوا اس کا نام تھا پرتھی راج۔ یعنی وسال دیو کی بیٹی کا بیٹا۔ تنوار اور چوہان دونوں خاندانوں کا نور نظر۔

بسال دیو کے بیٹا کوئی نہیں تھا۔ اس نے اس نواسے کو گود لے لیا۔ سو جب اس کی آنکھ بند ہونے لگی تو اس نے اپنے راج پاٹ کا وارث اسے ہی بنایا۔ یعنی دلی اور اجمیر دونوں کی راج گدیاں پرتھی راج عرف رائے پتھورا کے نصیب میں لکھی گئیں۔

تو صاحبو اب رائے پتھورا کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ دو راجدھانیاں ایک راجہ۔ اس کا ایک قدم اجمیر میں ہے۔ دوسرا قدم دلی میں۔ اور راج ہمالہ پربت سے شروع ہوکر جنوب میں بندھیا چل کی پہاڑیوں اور نربدا ندی پر جاکر ختم ہوتا ہے۔ انگ پال کے لال کوٹ کو لوگ بھول لے۔ اب راج پتھورا نے یہاں اپنا لال کوٹ اس شان سے کھڑا کیا ہے کہ چار دانگ میں اس کی دھوم ہے۔ شہاب الدین غوری نے کس زور شور سے دھاوا بولا تھا۔ مگر رائے پتھورا سے منھ کی کھا کے گیا۔ رائے پتھورا کی دور و نزدیک دھاک بیٹھ گئی۔

لیکن برا ہو عشق کا۔ رائے پتھورا کو اس کا عشق لے بیٹھا۔ ذرا گوشِ ہوش سے سنو کہ یہ کمبخت عشق رائے پتھورا کی جان کو کیسے لگا اور اس نے پروان چڑھ کر کیا گل کھلایا۔ راجہ جے چند کی ایک بیٹی تھی سنجوگتا۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ بھاٹ اس کی سندرتا کے گیت گاتے پھرتے تھے۔ سب سے بڑھ کر رائے پتھورا کے دربار کا بھاٹ چندا تھا جس نے کچھ اس کمال کے ساتھ اس کی سندرتا کا نقشہ کھینچا کہ رائے پتھورا کے دل میں وہ تصویر کھب گئی۔ عشق کا تیر دل میں جا کر ترازو ہوگیا۔

مگر عشق میں ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے کہ بیچ میں کوئی پیچ پڑ جاتا ہے۔ وہیں سے خرابی کی داستان لکھی

جاتی ہے۔ یہاں پیچ یہ پڑا کہ سنجوگتا تو دشمن کی بیٹی تھی۔ یعنی راجہ جے چند کی۔ جے چند قنوج کا راجہ تھا اور رائے پتھورا کا حریف۔ وہ کیسے۔ ایسے کہ ہر چند کہ وہ راٹھور گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ مگر بسال دیو کی ایک بیٹی راٹھور گھرانے میں بھی تو بیاہی گئی تھی۔ جے چند اسی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ یعنی وہ بھی بسال دیو کا نواسہ تھا۔ بلکہ بڑا نواسہ وہی تھا۔ مگر نانا نے چھوٹے نواسے کو گود لیا اور اپنی گدی پہ بٹھایا۔ جے چند کو یہ بات کھا گئی۔

سو پھر سنجوگتا اور رائے پتھورا کا سنجوگ ہوتا تو کیسے ہوتا۔ ویسے تو رائے پتھورا کی ایک پرانی نوکرانی نے کٹنی کا کردار ادا کیا۔ ہزار جتن کر کے جے چند کے محل میں پہنچی اور سنجوگتا کا قرب حاصل کر لیا۔ آگے اسے زیادہ جتن کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سنجوگتا نے رائے پتھورا کی سورمائی کے قصے سنے تھے اور اس پر نادیدہ عاشق ہو چکی تھی۔ تو آگ تو دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔ بس بھڑکنے کے لیے بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ وہ بہانہ خود جے چند نے فراہم کر دیا۔

راجہ جے چند کو اب یہ دکھانا تھا کہ بڑا راجہ وہ ہے۔ اس ترمیں اس نے اشومیدہ یگیہ کی ڈونڈی پٹوا دی۔ اشومیدہ یگیہ یعنی گھوڑے کی قربانی کی تقریب جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ قریب و دور کے راجہ بلاوا پہنچنے پر اس تقریب میں آ کر شریک ہوں اور میزبان راجہ کی بڑائی کو تسلیم کریں۔ ہاں اسی کے ساتھ اس نے راجکماری سنجوگتا کے سوئمبر کا بھی اعلان کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سنجوگتا مالا لے کر بھری سبھا میں آئے گی اور راجوں مہاراجوں میں سے جو بھا جائے گا اس کے گلے میں مالا ڈال دے گی۔

راجہ جے چند نے دور و نزدیک کے راجوں مہاراجوں کو اس جشن میں مدعو کیا اور رسم کے مطابق ہر ایک راجہ کو کوئی خدمت سپرد کی۔ رائے پتھورا کو ذلیل کرنا مقصود تھا۔ سو اسے دربانی کی خدمت سونپی گئی۔

اشومیدہ یگیہ دھوم سے منایا گیا۔ سب راجہ آئے۔ رائے پتھورا نہیں آیا۔ راجہ جے چند نے کیا کیا کہ اس کا ایک سنہری بت بنوایا اور دربان کی جگہ دروازے پہ کھڑا کر دیا۔ ادھر رائے پتھورا نے اپنی ایک سکیم تیار کی تھی۔ اس نے ایک سو چوہان سورما ساتھ لیے۔ انہوں نے فقیروں کا بھیس بھرا۔ اپنے گھوڑوں کو قریب کے جنگل میں چھوڑا اور خود سوئمبر کے جشن میں جا شامل ہوئے۔ انہیں میں رلا ملا رائے پتھورا بھی تھا۔

راجکماری سنجوگتا مالا لے کر سبھا میں آئی۔ ایک ایک راجہ کے پاس سے گذری' ایک ایک کی صورت دیکھی۔ جس صورت کو نگاہیں تلاش کر رہی تھیں وہ ندارد۔ جب دروازے کے قریب پہنچی اور رائے پتھورا کی مورتی پہ نظر گئی تو اس نے جے مالا جھٹ اس کے گلے میں ڈال دی۔ بس سبھا میں تہلکہ پڑ گیا۔ ادھر رائے پتھورا نے جھرجھری لی۔ آگے آ کر سنجوگتا کی کلائی پکڑی۔ لپک جھپک باہر آیا۔ گھوڑے پہ ساتھ

بٹھا یہ جا وہ جا۔ پیچھے پیچھے چوہان سور ما۔ ادھر راٹھور سور ماؤں کو ہوش آیا کہ یہ کیا ہو گیا۔ ان کی غیرت نے جوش مارا۔ گھوڑوں پہ بیٹھ تلواریں سونت تعاقب میں چلے۔ تھوڑی دور پہنچ کر جالیا۔ خوب کھانڈا بجا۔ نو نیزے پانی چڑھا۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ مگر رائے پتھورا کے سامنے راٹھوروں کی کوئی پیش نہ گئی۔ مارتا کاٹتا وہ دلی جا پہنچا۔ اور دن سے لال کوٹ میں۔

جے چند کی کرکری ہو گئی۔ وہ تو انگاروں پہ لوٹنے لگا اور اب اس نے شہاب الدین غوری کی طرف دیکھنا شروع کیا کہ دشمن کو نیچا دکھانے کی اسے یہی راہ نظر آئی۔ کیسا کٹھور باپ تھا۔ مطلق نہ سوچا کہ بیٹی کا گھر اجڑ جائے گا۔ اور کیسا ناعاقبت اندیش راجہ تھا کہ یہ نہ جانا کہ باہر والے کو ایک مرتبہ اندر آنے کی راہ مل گئی تو پھر وہ دلی اور اجمیر ہی تک کیوں قناعت کرے گا۔ غوری کو ایسا موقع خدا دے۔ اس نے تو پہلے ہی اپنی شکست کا بدلہ لینے کی ٹھانی ہوئی تھی۔ اب گھر کے ایک بھیدی سے شہ ملی تو فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

مگر ٹھہریئے۔ اس بیچ ایک واقعہ اور بھی گذر گیا۔ مورخ تو اس واقعہ کو کاہے کو تسلیم کریں گے۔ خیر مورخ تو سنجوگتا سے عشق کو بھی کب خاطر میں لاتے ہیں۔ وہ تو واقعات کے حساب سے چلتے ہیں۔ مگر اس زمانے کی خلقت نے تو بہر حال اس عشق اور جو واردات اب میں بیان کرنے لگا ہوں دونوں ہی سے رائے پتھورا کی خرابی کو منسوب کیا تھا۔ تو واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ رائے پتھورا نے خالی راجہ جے چند ہی سے دشمنی مول نہیں لی تھی بیٹھے بٹھائے دھرتی کے راجہ باسک کو بھی اپنا دشمن بنالیا۔ باسک ناگ شیش ناگ کا بھائی۔ ہندو دیو مالا کہتی ہے کہ وہ دھرتی کا راجہ ہے۔ مگر طبیعت میں قرار نہیں۔ دھرتی تلے گھومتا پھرتا ہے۔ آج یہاں ہے تو کل لہر کھا کے کہیں اور نکل گیا۔ اگر کسی راجہ کے محل تلے جا براجا تو سمجھ لو کہ اس راجہ کے راج کو چار چاند لگ گئے۔ تو ہوا یوں کہ ایک دن دلی کے جوتشی دربار میں حاضر ہوئے اور ہاتھ جوڑ کر بولے کہ ہے مہاراج ہماری جوتش نے ہمیں بتایا ہے کہ ان دنوں راجہ باسک لال کوٹ تلے براجے ہوئے ہیں۔ کسی ترکیب سے اگر راجہ جی اسی استھان پر مستقل ٹک جائیں تو چوہانوں کے راج کو کوئی کھٹکا نہیں رہے گا۔ بس وہ سدا راج کریں گے۔

رائے پتھورا یہ سن کر خوش ہوا۔ پوچھا کہ پھر کوئی ترکیب بتاؤ۔ جوتشیوں نے کہا کہ ترکیب یہ ہے کہ لوہے کی ایک لمبی سی کیل بنواؤ اور اسے وہاں ٹھوکو جہاں راجہ باسک کا پھن ہے۔ پھن میں کیل گڑ گئی تو پھر راجہ باسک کیسے سرکیں گے اور کہاں جائیں گے۔ رائے پتھورا کو یہ ترکیب پسند آئی۔ جھٹ پٹ لوہے کی ایک کیل بنوائی گئی۔ کیل کیا تھی اچھی خاصی لوہے کی ایک لاٹھ تھی۔ جوتشیوں نے حساب کرکے اس جگہ کا

تعین کیا جہاں راجہ باسک کا پھن تھا اور کیل گڑوادی۔ جوتشی تو کیل گڑوا کے نچنت ہو گئے۔ مگر رائے پتھورا کو بہت بیقراری تھی کہ کیل پھن میں گڑی بھی ہے یا نہیں۔ اس نے کیل کو اکھڑوانے کا حکم دیا کہ اسے دیکھ کر اطمینان کر لیا جائے کہ پھن اس کی زد میں آیا بھی ہے۔ کیل جب اکھاڑ کے دیکھی گئی تو اس کی نوک خونم خون نظر آئی۔ رائے پتھورا نے حکم دیا کہ فوراً اسے اسی جگہ گاڑ دیا جائے کہ یہ تو سیدھی پھن میں جا کر گڑ گئی تھی۔ مگر جوتشیوں نے سر پیٹ لیا کہ مہاراج آپ نے کیا غضب کیا۔ اور اب کیل گڑوانے سے کیا ہوگا۔ راجہ باسک تو اتنی دیر میں لہر کھا کر کہیں آگے نکل گئے ہوں گے۔

اور اب سنو کہ شہاب الدین غوری ادھر غزنی سے آندھی دھاندی چلا اور مار امار کرتا ہوا چوہان راج کی سرحد پر آن دھمکا۔ ادھر رائے پتھورا محل میں سنجوگتا کے ساتھ مگن بیٹھا تھا۔ سنجوگتا مل گئی تو بس جیسے دنیا جہان کی دولت مل گئی۔ اب کس بات کی چنتا تھی۔ راج پاٹ سے بے نیاز محل میں سنجوگتا کے ساتھ عیش ہو رہے تھے۔ غوری کی چڑھائی کی خبر آئی تو دربار میں کھلبلی پڑ گئی۔ راجہ کو جا کر کون خبر کرے۔ تب چندا بھاٹ نے جو راجہ سے بہت قریب تھا یہ ذمہ داری قبول کی۔ سات ڈیوڑھیاں طے کر کے راجہ کے حضور پہنچا اور چڑھائی کی خبر سنائی۔ اب رائے پتھورا کو ہوش آیا۔

رائے پتھورا کے ایک اشارے پر کتنے سورما راجپوت اس کے جھنڈے تلے اکٹھے ہو گئے۔ قیامت کا رن پڑا۔ جب لڑتے لڑتے سورج سر پہ آ گیا اور دوپہر کا وقت ہوا تو لڑائی میں وقفہ آیا۔ رائے پتھورا نے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر دم لیا۔ ڈیڑھ سو راجہ مہاراجہ اس کے گرد اکٹھے تھے۔ سب نے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر پان کا بیڑا اٹھایا۔ منہ میں رکھا۔ شربت پیا۔ تلسی کی پتی زبان پر دھری۔ ماتھے پہ زعفرانی تلک لگایا اور آخر دم تک لڑنے کی قسم کھائی۔ اور سچ مچ وہ آخر دم تک لڑے اور تلوار کے جوہر خوب دکھائے۔ مگر آج کا دن رائے پتھورا پر بھاری تھا۔ دن ڈھلتے ڈھلتے بساط الٹ گئی۔ راجپوت فوج تتر بتر ہو گئی اور خود رائے پتھورا کی جان کے لالے پڑ گئے۔

ادھر مہارانی سنجوگتا ایک راجپوتنی کی شان کے ساتھ آنے والے وقت کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ پل پل کی خبر اسے پہنچ رہی تھی۔ جب جنگ کا نقشہ بدلا تو اس نے چتا تیار کرنے کا حکم دیا۔ ادھر رائے پتھورا کے انجام کی خبر آئی ادھر وہ راج سنگھاسن سے اتر چلتی چتا میں جا بیٹھی۔

یہاں آ کر عشق کی یہ داستان تمام ہوتی ہے اور اس کے ساتھ چوہانوں کا سورج غروب ہوتا ہے۔

نئی تہذیب نیا شہر

اے لو یہ تو دلی کا سارا نقشہ ہی بدل گیا۔ نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت۔ لال کوٹ کہاں گیا۔ مندروں کے جھمکڑے کو زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا۔ اب یہاں تعمیر کا رنگ ہی الگ ہے۔ ایک بلند و بالا مینار کھڑا ہے۔ ایک عالیشان مسجد۔ ان پر جو عبارتیں لکھی ہیں ان کا رسم الخط ہی مختلف ہے۔

پتہ چلا کہ وہ ساری راجپوتی دھوم دھام رائے پتھورا کے دم تک تھی۔ اس کا جانا خالی ایک راجہ کا جانا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک پوری تہذیب ڈوب گئی اور سارے راجپوتوں کا بیڑا غرق ہو گیا۔ وہ 1193ء تھا جب رائے پتھورا مارا گیا۔ برس نہ گذرا تھا کہ راجہ جے چند کی بھی موت کا پروانہ آ گیا۔ قنوج کو بھی غوری نے سنگھوالیا۔ پھر باقی راجپوت کس کھیت کی مولی تھے۔

بارہویں صدی تمام ہوئی۔ اب تیرہویں صدی شروع ہے۔ دلی اب اور ہی رنگ میں رنگی جا رہی ہے۔ جنہوں نے اس شہر میں فتح کے جھنڈے گاڑے ہیں وہ دور پار سے آئے ہیں۔ ان کے طور طریقے اور ہیں۔ ان کی زبان الگ، دین و مذہب الگ، رہن سہن الگ، تعمیر کے نقشے الگ۔ اسی حساب سے دلی بدل رہی ہے۔ شہاب الدین غوری تو مار دھاڑ کر کے چلا گیا مگر اپنے معتمد خاص قطب الدین ایبک کو یہاں انتظام کرنے کے لیے چھوڑ گیا اور جب شہاب الدین کی آنکھ بند ہو گئی تو وہ باقاعدہ بادشاہ ٹھہرا اور قطب الدین ایبک سے سلطان قطب الدین ایبک بن گیا۔ قطب مینار اسی نے کھڑا کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی تکمیل سلطان التمش نے کی۔ اصل میں دلی کا نیا رنگ و روپ تو التمش کے زمانے ہی میں آ کر نکھرا۔ اسی نے دلی کو اس نئی سلطنت کا صدر مقام بنایا۔ ورنہ قطب الدین ایبک نے تو لاہور کو آخر وقت تک چھوڑا ہی نہیں۔ اسی شہر میں اس کا انتقال ہوا۔ التمش نے جب اس سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے
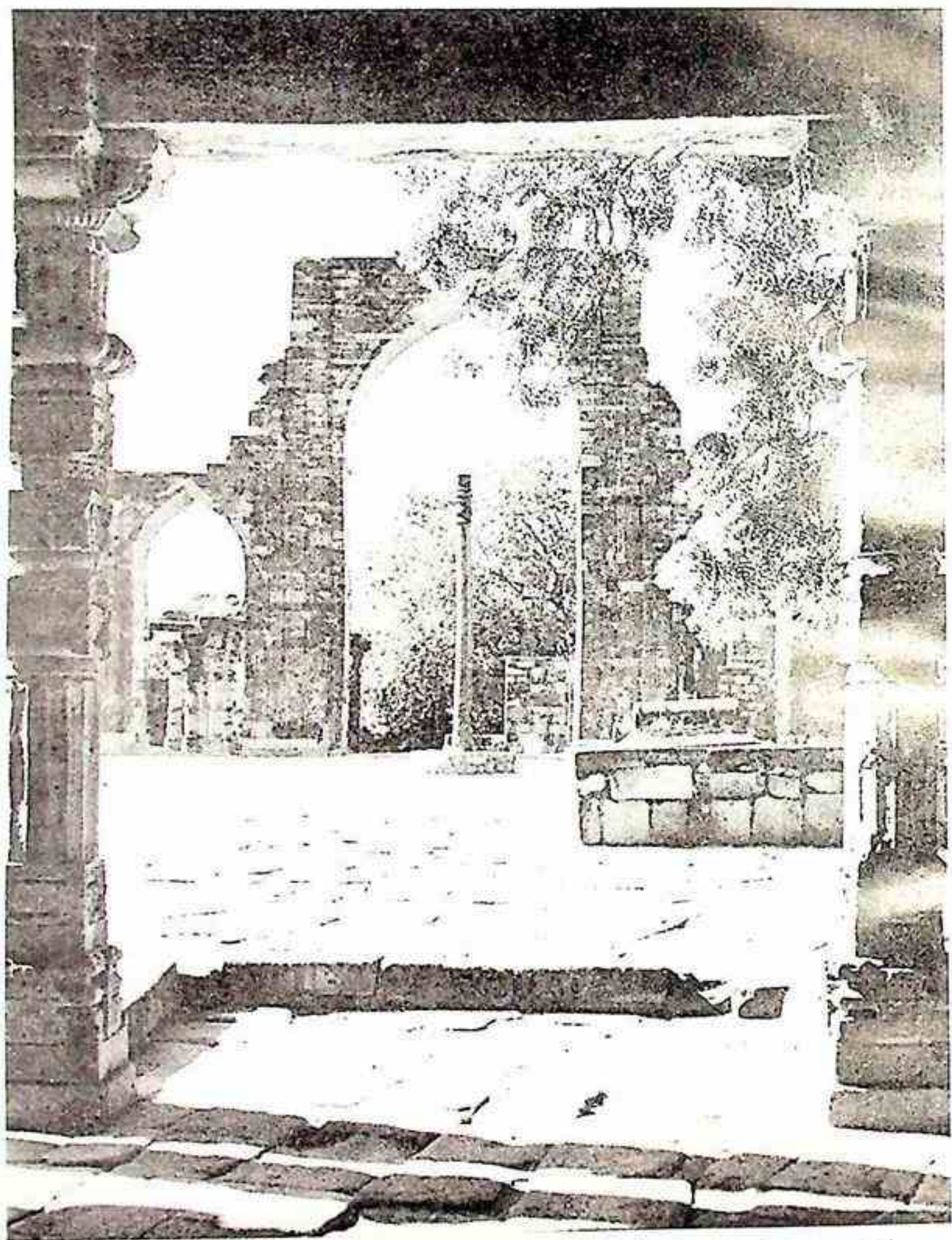
دہلی قطب مینار کے پاس لوہے کی لاٹھ جس پر تیسری صدی عیسوی کا ایک سنسکرت کا کتبہ کندہ ہے۔

۱۱۹۱ء کی بنا کردہ مسجد قوت الاسلام کے اوپر اٹھتے ہوئے قطب مینار کا نظارہ۔
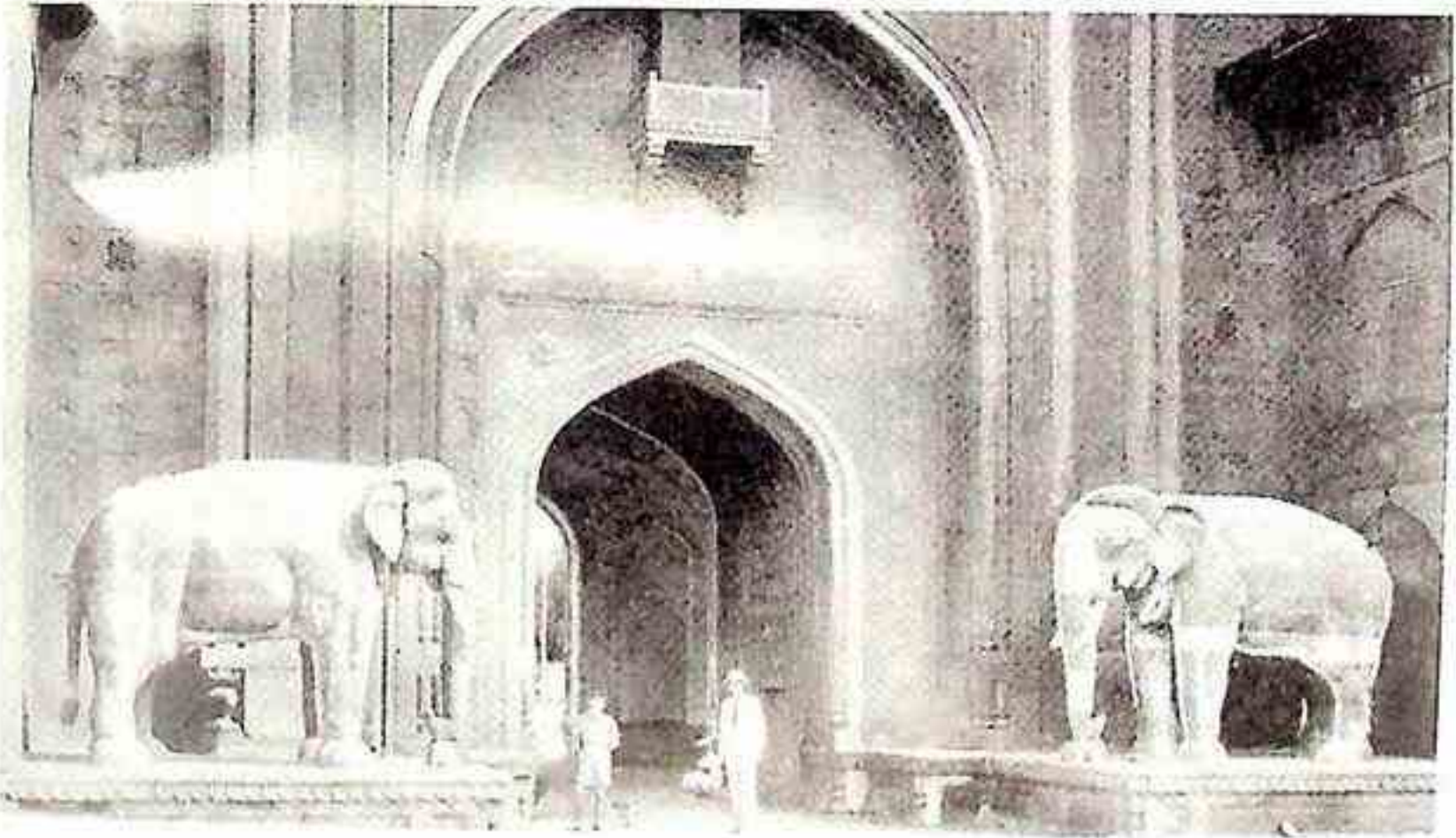
قلعہ کا دہلی دروازہ، ہاتھی جو پہلے ہٹا دیے گئے تھے۔ اب واپس کر دیے گئے ہیں۔

دلی کو دارالسلطنت بنایا اور پھر اس انداز سے اس شہر کو بنایا سنوارا کہ وہ ایک تمدنی مرکز بن گیا۔ قطب مینار اور مسجد قوۃ الاسلام کی تعمیرات کی تکمیل کی۔ حوض شمسی بنایا۔ نئے محلے نئی بستیاں آباد کیں۔ ہاں یہ مت سمجھئے کہ قطب مینار سلطان قطب الدین ایبک سے منسوب ہے۔ نہیں یہ نام خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے حوالے سے پڑا۔ جب ہی تو اسے عام لوگوں نے قطب صاحب کی لاٹھ کہنا شروع کر دیا تھا۔

ہاں دلی کا ایک اور کرشمہ دیکھئے۔ کیسا کیسا فاتح آیا اور اس نے یہاں اپنی فتح کا جھنڈا گاڑا۔ مگر اسی بیچ ایک حسین مہ جبین شہزادی تخت سلطنت پر رونق افروز ہوئی۔ اور اس نے بھی اپنے زمانے میں بڑے کروفر سے حکومت کی۔ یہ التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ تھی۔ مگر اس سلطانہ کو بھی اس کا عشق لے بیٹھا۔ اس کا دل یاقوت نامی ایک سردار پر آ گیا۔ اور ایسا آیا کہ اس سے بیاہ رچالیا۔ یاقوت بیچارہ ابی سینیا کی کالی مٹی۔ حیثیت غلام والی۔ ترک سرداروں کی ترکمانی غیرت نے جوش مارا اور بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ رضیہ اس عشق کے چکر میں تخت سے بھی محروم ہوئی اور جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔

رضیہ سلطانہ کا ذکر تو بیچ میں نکل آیا۔ ورنہ ذکر تو اصل میں کیقباد کا ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ذکر دلی کا مقصود ہے نہ کہ سلاطین کا۔ التمش کے بعد جس نے الگ دلی بسائی وہ تو کیقباد ہے۔ یہاں سے ایک عجب سلسلہ شروع ہوا کہ جو آیا اس نے اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کھڑی کی اور الگ اپنی دلی بسائی۔ قطب الدین ایبک نے اور اس سے بڑھ کر التمش نے رائے پتھورا کی دلی کو برباد کر کے اپنی دلی بسائی۔ التمش کی دلی کو کیقباد نے خیر باد کہا اور اپنے ڈھب کی ایک نئی دلی آباد کی۔ اس دلی کا نام کیلو کھری پڑا۔ جگہ پر فضا تھی۔ پاس ہی جمنا بہہ رہی تھی۔ سلطان کیقباد نے یہاں ایک عالیشان محل تعمیر کرایا۔ باغ لگائے۔ پھر دربار سے وابستہ امرا نے بھی یہاں اپنی اپنی حویلیاں کھڑی کر لیں۔ لیجیے دیکھتے دیکھتے پرانے دارالحکومت کی ساری رونق اس نئے نگر میں کھنچ آئی۔ مگر جب سلطان علاء الدین خلجی کا زمانہ آیا تو اس نے کیقباد کے اس شاد آباد نگر کو چھوڑا۔ قریب ہی ایک علاقہ تھا سیری۔ اس نے یہاں ایک نئے نگر کا ڈول ڈالا۔ لیجئے اب کیلو کھری کی رونق سیری میں منتقل ہونے لگی۔ کیلو کھری برباد سیری آباد۔ نئی راجدھانی بنی تو نیا محل بھی تو تعمیر ہونا تھا۔ تو سیری میں ایک شاندار محل تعمیر کیا گیا جسے قصر ہزار ستون کا نام دیا گیا۔ مگر سیری کی ساری رونق خلجیوں کے دم تک تھی۔ خلجی گئے تو ساتھ میں سیری اور قصرِ ہزار ستون کی رونق کو بھی لے گئے۔

خلجیوں کے بعد تغلق آئے۔ انہوں نے اپنی دلی بسائی۔ بس یوں سمجھو کہ غیاث الدین تغلق نے تخت پہ بیٹھتے ہی وہیں کہیں ایک نئے نگر کا ڈول ڈالا۔ تغلق آباد نام رکھ کر اس پر اپنے خاندان کی مہر لگا دی۔

اور کیا خوب محل تعمیر کیا کہ دھوپ میں سونے کی طرح چم چم چمکتا تھا کہ اس پر نظریں نہیں ٹھہر سکتی تھیں۔ اصل میں جن اینٹوں سے بنا تھا ان پر سونے کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ مگر تغلق آباد تغلق کو راس نہیں آیا۔ اِدھر شہر آباد ہوا اور محل تیار ہوا اُدھر بادشاہ کا بلاوا آ گیا۔ اور عجب طرح سے آیا۔ بنگال کی مہم پر گیا ہوا تھا۔ واپس آنے لگا تو بیٹے نے کہ جونا شاہ تھا اور بعد میں محمد بن تغلق کے نام سے مشہور ہوا شہر سے باہر ایک عارضی محل بنوایا کہ پہلے بادشاہ سلامت یہاں دم لینے کے لیے رکیں پھر تغلق آباد میں بصد کروفر داخل ہوں۔ مگر محل عجب طرح کا بنا تھا کہ بادشاہ سلامت نے ادھر اندر قدم رکھا ادھر پوری عمارت اڑڑا دھم کر کے نیچے آن پڑی۔

تو تغلق آباد بستے ہی بلکہ بننے سے پہلے ہی اجڑ گیا۔ اور بیٹے کو دیکھو کہ اس نے اس نئی راجدھانی اور اس نئے محل میں تخت نشین ہونا منظور نہیں کیا۔ پرانے شہر میں آ کر تخت پر بیٹھا اور فوراً ہی اپنے ڈھب کی دلی بسانے کی ٹھانی۔ مگر کیا خوب بادشاہ تھا۔ دلی کو خود ہی بسایا بھی اور خود ہی اجاڑا بھی۔ اور ایسا ویسا اجاڑا۔

اجڑنے بسنے کی داستان تو چلتی ہی رہے گی۔ مگر یہ بھی تو دیکھتے چلیں کہ اب دلی کا نقشہ کیا ہے۔ یہ تو بادشاہی چوچلے تھے کہ جو تخت پہ بیٹھا اس نے اپنا ایک محل کھڑا کیا۔ اردگرد امرا نے اپنی حویلیاں تعمیر کر لیں۔ اور بادشاہ سلامت نے سمجھ لیا کہ انہوں نے ایک الگ دلی بسا لی ہے۔ مگر واقعہ یوں ہے کہ ایک دلی وہ تھی جس نے رائے پتھورا کے ساتھ آخری سانس لیا اور اپنی ساری تہذیب کے ساتھ مٹ گئی۔ اس کے بعد باہر سے آنے والے فاتحین نے اس قدیم بستی میں قدم رکھا اور اسے ایک نئے سانچہ میں ڈھالنے کی طرح ڈالی۔ اور لیجئے اب دلی میں نیا نقشہ جم چکا ہے۔ شہر شاد آباد۔ اہل شہر خوش و خرم۔ خلقت رنگ رنگ کی۔ کوئی ہندو کوئی مسلمان۔ کوئی ترک کوئی افغان۔ کوئی ہندی کوئی ایرانی۔ معاشرتی زندگی میں رنگارنگی ہے۔ شہر میں امی جمی ہے۔ گلی کوچوں میں بازاروں میں گہما گہمی ہے۔ سرائیں آباد ہیں۔ سرایوں سے زیادہ چنڈو خانے آباد ہیں۔ پیاسوں کا ایک جھمگھٹا چنڈو خانوں میں۔ دوسرا جھمگھٹا کنوؤں پر، تالابوں اور حوضوں پر۔ بازاروں میں راہیں صاف شفاف۔ صراف کے مقابل صراف۔ ہر قسم کا دکاندار، ہر رنگ کا ہنرمند اپنی اپنی ٹھیک پہ جما بیٹھا ہے۔

تو اب مقامی اور بیرونی رنگ گھل مل کر ایک نئی وحدت میں ڈھل چکے ہیں۔ ایک نیا معاشرے کی نمود ہے۔ ایک نئی تہذیب ظہور کر رہی ہے۔ دربار کی اپنی شان و شوکت۔ خانقاہوں کا اپنا وقار۔ گلی کوچوں کی اپنی گہما گہمی۔ بازاروں کا اپنا بھیڑ بھڑکا۔ اور ایک شاعر ہے جس کا ایک قدم دربار میں ہے، دوسرا قدم خانقاہ میں۔ پھر شہر کے گلی کوچے اور بازار بھی اس کے قدموں کی زد میں ہیں۔ دربار میں اور دربار سے دور

شیراز تک اس کی فارسی شاعری کا طوطی بولتا ہے۔ اس زور پر طوطی ہند کا خطاب پایا ہے۔ مگر گلیوں بازاروں میں وہ دوسری ہی زبان میں رواں نظر آتا ہے۔ ایک نکڑ پہ ایک ساقن نے اپنا بھنگڑ خانہ سجا رکھا ہے۔ بھنگی چرسی یہاں آ کر پھڑ جماتے ہیں۔ شاعر کا ادھر سے گذر ہوتا ہے تو ساقن اٹھ کر سلام کرتی ہے۔ حقہ بھر کر پیش کرتی ہے۔ شاعر نے حقے کی نے منھ میں دبائی دو گھونٹ لیے، ساقن سے دو میٹھے بول بولے اور اپنی راہ لی۔ ساقن نے ایک روز عجب سوال ڈالا کہ اے امیر میں تیرے واری صدقے، تو نے کتنے راگ راگنی بنائے۔ غزلیں اور گیت کہے۔ اس بخت ماری بھٹیارن کے کہے پر اس کے لونڈے کے لیے خالق باری بھی لکھ دی۔ ارے کوئی چیز اس لونڈی کے نام پر بھی بنا دو۔ طبیعت رواں تھی۔ ساقن کی فرمائش فوراً پوری ہوئی۔

اوروں کی چوپہری باجے چمو کی اٹھ پہری
باہر کا کوئی آئے ناہیں، آئیں سارے شہری
صاف صوف کر کے آگے راکھے جن میں ناہیں توسل
اوروں کے جہاں سینگ سماوے، چمو کے وہاں موسل

اور اللہ جانے وہ بھٹیارن کون تھی کہ اس نے فرمائش کی اور ان حضرت نے پوری خالق باری لکھ ڈالی۔

خالق باری سرجن ہار
واحد ایک بڑا کرتار

چلتے چلتے پیاس لگی۔ دیکھا سامنے کنوئیں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی ہیں۔ قریب جا کر پانی مانگا۔ ایک بولی، واری جاؤں، تم امیر خسرو ہونا جنھوں نے گیت لکھے ہیں اور جن کی پہیلیاں کہہ مکرنیاں مشہور ہیں۔ ہاں بی بی میں خسرو ہوں۔ پیاس لگی ہے۔ پانی پلا اور ثواب لے۔ ناں، یوں نہیں۔ پہلے ہمارے لیے کچھ کہہ دو۔ ارے بی بی تیرے لیے کیا کہہ دوں۔ اچھا یوں کرو کہ کھیر پہ کوئی بول کہہ دو۔ دوسری بولی چرخے پہ بھی کوئی بول ہو جائے۔ تیسری بولی ڈھول پہ کوئی بات ہو جائے۔ چوتھی نے کتے پہ کچھ کہنے کی فرمائش کر ڈالی۔ شاعر بہت زچ ہوا۔ مگر فوراً ہی رواں ہو گیا۔

کھیر پکائی جتن سے، چرخا دیا جلا
آیا کتا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا
پانی پلا

پھر کسی ایرا غیرا نے فرمائش کی تو کوئی پہیلی بنا دی۔ کسی کے کہے پر انمل بنا ڈالی۔ یا کوئی ڈھکوسلا۔

بھادوں پکی پہیلی چوچو پڑی کپاس
بی مہترانی دال پکاؤ گی یا ننگا ہی سو رہوں

کیا یہ محض ہنسی دلگی ہے۔ یہ تو کسی نئی زبان کا ظہور ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ آخر کوئی تہذیب گونگی تو پیدا نہیں ہوتی۔ اپنی زبان اپنے ساتھ لاتی ہے تو دلی کی آغوش میں ایک نئی تہذیب کے ساتھ ساتھ ایک نئی زبان بھی پل بڑھ رہی ہے یعنی اردو اب اپنا قد نکالنے لگی ہے۔

یہ تو گلی کوچوں بازاروں میں ہو رہا تھا۔ دربار میں کیا ہو رہا ہے۔ غیاث الدین تغلق کا زمانہ گیا۔ اب محمد بن تغلق کا زمانہ ہے۔ پہلے دلی کو بسایا' پھر اسے اجاڑا۔ ہار جھک مار کر پھر بسایا۔ مختصراً یوں سمجھو کہ دلی کی حفاظت کے سامان کیے۔ اس کے گرداگرد فصیل کھنچوائی۔ ایک محل قصر ہزار ستون کے نام سے کھڑا کیا۔ اس طرح جو بستی بسی اس کا نام عادل آباد رکھا۔ خود کو بادشاہ عادل جو سمجھتا تھا۔ مگر پھر کیا ہوا۔ دکن پر چڑھائی کے دنوں میں وہاں کا ایک شہر دیو گیر ایسا بھایا کہ سوچا کہ اسے ہی دارالسلطنت بنایا جائے۔ دلی میں ڈونڈی پٹ گئی کہ دلی چھوڑو اور چلو دیو گیر کہ اب وہ دولت آباد ہے اور نیا دارالسلطنت۔ کہتے ہیں کہ حکم حاکم سے دلی اس طرح خالی ہوئی کہ آخر میں بس ایک لنگڑا رہ گیا تھا اور ایک اندھا۔ مگر خلیق احمد نظامی اپنی کتاب 'اوراق مصور' میں کہتے ہیں کہ یہ مبالغہ ہے۔ ''سلطان نے دیوگیر میں صرف ایک انتظامی مرکز قائم کیا تھا اور دہلی کی حیثیت بدستور وہی رہی تھی۔ یہاں محلات بھی تھے جن میں شاہی خاندان مقیم تھا' چھاؤنی بھی تھی اور ٹکسال بھی۔'' مگر اسی سانس میں یہ بھی کہتے ہیں کہ ''علماء' مشائخ اور اکابر شہر کے یہاں سے چلے جانے کے بعد ایک خلا پیدا ہو گیا تھا اور بقول سید محمد گیسو دراز یہاں کی خانقاہیں اتنی سونی پڑ گئیں تھیں کہ سوائے قطب صاحب اور شیخ نظام الدین اولیا کے مزارات کے کہیں چراغ بھی نہ جلتا تھا۔'' یعنی دلی اب شہرِ بے چراغ تھی۔ اس نگر کی دولت اور خلقت ڈھل کر دولت آباد پہنچ چکی تھی۔

مگر نیا نگر نہ خلقت کو راس آیا نہ بادشاہ کو۔ کال ایسا پڑا کہ خلقت میں تراہ تراہ پڑ گئی۔ پھر ڈھلائی شروع ہو گئی۔ مرتے گرتے دلی سے دولت آباد گئے تھے۔ وہاں سے مرتے گرتے پھر دلی واپس آئے۔ دلی دھیرے دھیرے پھر شاد آباد ہو گئی۔ پھر گلی کوچوں میں گہما گہمی۔ بازاروں میں وہی بھیڑ بھڑکا۔ اور ہاں ان روایتوں ان اداروں کو بھی تو دیکھو جنہیں اس نئی تہذیب نے جنم دیا۔ سب سے بڑھ کر خانقاہیں۔ محمد بن تغلق کے زمانے میں یہاں دو ہزار خانقاہیں تھیں۔ ان خانقاہوں کی اپنی ایک تہذیب تھی۔ دربار کا سایہ اس پر نہیں پڑا تھا۔ نہ راسخ العقیدہ علماء کے اندازِ فکر نے یہاں راہ پائی تھی۔ وہ اہل شریعت' یہ اہل طریقت۔

مذہبی اور تہذیبی تعصبات سے کوسوں دور۔ ہندو مسلمان امیر غریب جو اس دربار میں آنا چاہتا ہے آئے اور فیض اٹھائے۔ فارسی جاننے اور بولنے کی قید نہیں۔ یہاں تو ہندوی کا چلن تھا۔ فنون لطیفہ سے کوئی بیر نہیں تھا۔ موسیقی سماع کی صورت اختیار کر کے یہاں خوب رچ بس گئی تھی۔

ان خانقاہوں میں جس خانقاہ نے رفتہ رفتہ مرکزی حیثیت اختیار کر لی وہ شیخ نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی۔ کیا مقبولیت تھی کہ صبح سے رات گئے تک عقیدتمندوں کا ہجوم رہتا۔ اور ان عقیدتمندوں میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی تھے۔ شیخ ان کے درمیان کسی قسم کا امتیاز برتنے کے قائل نہیں تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک صبح جماعت خانے کی چھت پر ٹہل رہے تھے۔ جمنا کنارے جو قریب ہی بستی تھی کچھ ہندو گاتے بجاتے اور پوجا کرتے دکھائی دیئے۔ شیخ نے انہیں دیکھا اور یہ مصرعہ پڑھا ع

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

ان کے مرید امیر خسرو۔ یوں ترک نژاد مگر ہندی رنگ میں رچے بسے۔ بسنت کی صبح شیخ کے دربار کی طرف جاتے جاتے کالکا مندر کے پاس سے گذرے۔ اردگرد پھولی سرسوں کو دیکھ کر اور عورتوں مردوں کو بسنتی لباس میں دیکھ کر پہلے ہی خوش ہو رہے تھے۔ اب جو مندر میں پجاریوں کو بھجن گاتے دیکھا تو ترنگ میں آ گئے۔ اسی ترنگ میں شیخ کے حضور اس شان سے پہنچے کہ پگڑی میں پھولی سرسوں کی شاخ اڑسی ہوئی تھی۔ مرشد مرید کو اس ترنگ میں دیکھ کر مسکرایا اور پھر ہدایت کی کہ خانقاہ میں بسنت منانے کا اہتمام کیا جائے۔ لیجئے صوفی کی خانقاہ میں سال کے سال بسنت کا میلہ لگنے لگا۔ مرشد بھی خوش مرید بھی خوش۔ اور یہاں لنگر کی کیا پوچھتے ہو۔ جیسے سدا برت لگی ہوئی ہے اور جیسے شہر میں کوئی بھوکا نہیں سوئے گا۔ مگر شیخ خود روزے سے رہتے۔ اور ان کی خوراک کیا تھی۔ ایک روٹی، تھوڑی دال ترکاری۔

اپنی اس شان کے ساتھ یہ خانقاہ دربار کے لیے چیلنج بن گئی تھی۔ غیاث الدین تغلق کو دیکھو۔ اس کے دماغ میں کیا سمائی کہ بنگالہ کی مہم سے واپس ہونے لگا تو ہدایت جاری کی کہ شیخ نظام الدین کی عافیت اس میں ہے کہ مابدولت کے دلی پہنچنے سے پہلے دلی سے کنارہ کر جائیں۔ یہ پیغام شیخ تک پہنچا۔ اس بزرگ نے اطمینان سے کہا کہ ہنوز دلی دور است۔ اور لیجئے کیسی افتاد پڑی کہ غیاث الدین تغلق دلی پہنچ ہی نہیں پایا۔ بیٹے نے اس کے استقبال کے لیے دلی سے باہر جو محل بنوایا تھا وہ اڑاڑا دھم کر کے نیچے آ پڑا۔ سلطان دلی آتے آتے عالم جاودانی کو سدھار گیا۔

یہ تھیں اس زمانے میں دلی کی خانقاہیں۔ اب مدرسوں کی سنو۔ دلی میں اس وقت ایک ہزار

مدرسے تھے۔ بعض کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ بعض کے اخراجات امرا اٹھاتے تھے۔ پھر ایسے مدرسے بھی تھے جو حکومت اور امرا دونوں سے بے نیاز تھے۔ ان کا حال غریبانہ تھا۔ مگر وہاں استاد ایسے بیٹھے تھے جن کی کشش طلبا کو دور دور سے کھینچ کر یہاں لاتی تھی۔ اور ایک تھا مدرسۂ فیروزی جسے فیروز شاہ نے قائم کیا تھا۔ اس مدرسے کی کیا شان تھی گرداگرد سبزہ و گل۔ پیڑ پھلوں سے لدے ہوئے۔ بیچ میں مدرسے کی شاندار عمارت۔ متصل میں حوض جو حوضِ خاص کے نام سے مشہور تھا۔ اس سے ہٹ کر استادوں اور طالب علموں کی رہائش کے لیے کمرے۔ مہمانوں کے لیے مہمان خانہ۔ کھانہ دانہ حکومت کی طرف سے۔

سرائیں بھی شہر میں اچھی خاصی تعداد میں تھیں۔ اور پھر باغ بغیچے، حوض، کنوئیں، باولیاں۔ حوض شمسی کیا خوب حوض تھا۔ بیچ حوض میں ایک چبوترہ اور ایک بلند و بالا عمارت۔ آس پاس صوفیوں کے حجرے۔ یہ حوض یوں سمجھو کہ تہذیبی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا۔

باغ سب سے بڑھ کر فیروز شاہ تغلق نے لگوائے۔ دلی کے آس پاس اُس نے 1200 باغ لگوائے تھے اور خالی باغ تھوڑا ہی۔ اس سلطان نے تیس حوض، سو حمام اور ڈیڑھ سو پل بنوائے۔ ساتھ میں سو سرائیں، تیس دارالعلوم اور چالیس مسجدیں اور ہاں دریاؤں پر پچاس بند باندھے۔ یوں سمجھو کہ اپنے رفاہی کاموں سے محمد تغلق کی لائی ہوئی بربادی کی حتی الامکان تلافی کر دی۔ محمد تغلق عجیب بادشاہ تھا۔ مجموعہ اضداد۔ داد و دہش میں اپنے وقت کا حاتم، قتل و خون کے معاملہ میں اپنے زمانے کا ہلاکو خاں، سو نیک نامی اور بدنامی دونوں ہی قسم کی داستانیں اس سے وابستہ ہیں۔

اور ہاں اس فضا میں مذہبی تعصبات کا عمل دخل بہت کم نظر آتا ہے۔ سمجھ لیجئے کہ جو نئی تہذیب ظہور کر رہی تھی اس کی اساس مذہبی رواداری پر تھی۔ صوفیا تو خیر تھے ہی مذہبی رواداری کے سب سے بڑے علمبردار۔ شیخ حمید الدین ناگوری کی سنئے کہ ان کے ایک مرید نے ایک ہندو کو کافر کہہ دیا تو خفا ہو گئے اور بولے کہ اے عزیز تجھے کیا معلوم کہ اس شخص کی روحانی کیفیت کیا ہے۔ تو صوفیا تو خیر ہوئے مگر سلاطین کے رویئے میں بھی یہ رنگ اچھا خاصا نظر آتا ہے۔ جلال الدین خلجی کا ایک جملہ خلیق احمد نظامی نے برنی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

''ہر روز ہندواں، مندل زناں و بوق زناں درزیر کوشک من می گذرند۔''

اور اس بادشاہ نے ان کے اس طرح محل کے پاس سے گذرنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ بلکہ بعض ہندو تیوہار خود دربار میں منائے جاتے تھے۔ محمد تغلق کے دربار میں ہولی منائی جاتی تھی۔ اور اس بادشاہ

کا ایک مشغلہ یہ تھا کہ جوگیوں سے بہت بحث مباحثے کرتا تھا۔

فیروز شاہ تغلق نے محمد تغلق کی اچھی روایتوں کو نبھایا' جو بری روایتیں اس سے منسوب تھیں ان کی تلافی کرنے کا اہتمام کیا۔ بہرحال اپنی ایک دلی اس نے بھی آباد کر ڈالی۔ 1352ء میں ایک نئی بستی فیروز آباد کے نام سے آباد کی۔ لیکن اس بستی سے دلی کی رونق میں کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ واقعہ یوں ہے کہ شہر کی آبادی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ایک نئی بستی کی تعمیر ایک ضرورت بن گئی تھی۔ تعمیری کام اس بادشاہ نے بہت کیے۔ اور چونکہ شکار کا بہت شوق تھا' سو ایک عمارت اپنی شکارگاہ کے بیچ کوشک شکار کے نام سے بنوائی۔ اس میں محل تو تھا ہی۔ ساتھ میں ایک عجائب خانہ بھی تھا جس میں رنگ رنگ کے چرند پرند نظر آتے تھے۔

فیروز شاہ تو نیک نامی کما کر دنیا سے رخصت ہوا۔ مگر بعد میں آنے والے نااہل نکلے۔ پھر وہی عیش و عشرت۔ تخت کے لیے لڑائیاں مارکٹائیاں۔ اسی ہنگام میں باہر سے ایک بلا آئی اور دلی کو تہہ و بالا کر گئی۔ یہ تھی تیمور لنگ کی چڑھائی اس کے لشکر نے شہر میں قتل عام کیا اور بقول بشیر الدین احمد ''گلیوں میں اس قدر مردے ڈال دیئے کہ گلیوں میں چلنے کا رستہ نہ رہا۔''

امیر تیمور نے دلی میں پندرہ دن قیام کیا۔ یہ پندرہ دن قیامت کے تھے۔ شہر میں جھاڑو پھر گئی۔ جب وہ واپس ہوا تو شہر کی ساری دولت سمیٹ کر ساتھ لے گیا۔

اب چودھویں صدی ختم ہو رہی تھی۔ اس صدی میں دلی نے کتنا عروج پایا۔ نئی بستیاں آباد ہوئیں۔ محل دو محلے بنے۔ ایک سے بڑھ کر ایک' سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک نئے معاشرے نے جنم لیا اور ایک نئی تہذیب نے ظہور کیا۔ اس کے جلو میں ایک نئی زبان آئی۔ مگر صدی کے ختم ہوتے ہوتے شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ دلی کس شان سے آباد ہوئی تھی کس عبرتناک طریقہ سے برباد ہوئی۔ یہ 1398ء ہے۔ تیمور قیامت مچا کر واپس جا چکا ہے۔ دلی اب ایک اجڑی بستی ہے۔ دیکھا چاہیے کہ اب کب اور کس رنگ سے دوبارہ آباد ہوتی ہے۔

دلی سے آگرہ کی طرف

تیمور نے پندرہ روز تک دلی میں کوسِ لمن الملکی بجایا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔ دھڑی دھڑی کر کے لوٹا اور کھیرے ککڑی کی طرح گردنیں کاٹیں اور سر قلم کیے۔ پھر یہ جا وہ جا۔ آندھی آئی تھی، گذر گئی۔ اب شہر اجاڑ ہے اور نراج کا راج ہے۔ اندھیر نگری چوپٹ راج۔ تخت پر وہ بیٹھے جسے اپنی گردن عزیز نہ ہو۔ جو تخت نشین ہوگا اس کے خلاف ادبدا کر بغاوت ہوگی۔ اپنا سر سلامت لے کر نکل بھاگا تو سمجھ لو کہ نصیبوں والا تھا۔ خضر خاں خوش قسمت تھا کہ قتل نہیں ہوا، طبعی موت مرا۔ اس کا بیٹا مبارک شاہ تخت پر بیٹھا۔ اور اس تخت کی یہ پرانی ریت چلی آ رہی تھی کہ جو اس پر بیٹھتا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی دلی بساتا اور ایک محل بنواتا۔ مبارک شاہ نے بھی یہی کیا۔ بادشاہ بنتے ہی مبارک آباد کے نام سے ایک نئے نگر کا ڈول ڈالا۔ لیکن نیا نگر بننے اور بسنے میں وقت لیتا ہے۔ ادھر دلی میں وقت تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ مبارک شاہ کے حصے میں وقت بہت کم آیا۔ نیا نگر بسنے سے پہلے ہی اجڑ گیا۔ مبارک شاہ قتل ہوا۔ آدھ بنے مبارک آباد میں وہ تخت پر تو نہ بیٹھ سکا۔ ہاں قبر اس کی وہاں ضرور بنی۔

اس کے بعد محمد شاہ بن فرید خاں تخت پہ بیٹھا۔ اس کے بخت نے یاوری کی کہ قتل ہونے سے بچ گیا۔ اس میں کچھ دخل اس کی عقل کا بھی تھا۔ محاصرہ کرنے والوں کو ایک دروازے سے داخل ہونے کی اجازت دی اور خود دوسرے دروازے سے سٹک گیا۔ جان بچی بھئی لاکھوں پائے۔

دلی نے آدھی صدی اسی افراتفری میں گذار دی۔ اسی افراتفری میں ایک لودھی نے زور پکڑا اور تخت پہ قابض ہو گیا۔ اور لیجیے اب تھوڑے دنوں کے لیے دلی میں لودھیوں کا سکہ چلے گا۔ وہ اور کچھ کر سکیں یا نہ کر سکیں شہر میں ایک ڈیڑھ باغ اور ڈھائی تین عمارتیں تو اپنے پیچھے اپنی یاد دلانے کے لیے چھوڑ ہی جائیں

گے۔ مگر دلی سے دارالسلطنت کو منتقل کر کے آگرہ لے جانے کا کارنامہ بھی انہیں کے نام لکھا جائے گا۔ خیر یہ بعد میں ہوا۔ پہلے تو بہلول لودھی تخت پہ بیٹھا اور ایسا بیٹھا کہ سینتیس سال تک بیٹھا رہا۔ یعنی 1451ء میں بیٹھا اور 1488ء میں رخصت ہوا۔ مگر نہ قتل ہوا نہ اسے بھاگنا پڑا۔ طبعی موت مرا۔ اور فوراً ہی اس کا بیٹا سکندر خاں لودھی بلاتردد تخت پر بیٹھ گیا۔ خیر کہنے کو تو تخت پہ بیٹھ گیا۔ مگر چین کا ایک دن میسر نہیں آیا۔ آج یہاں بغاوت کل وہاں شورش۔ دلی میں ٹک کر بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس لیے دلی ہی سے اس کا جی بیزار ہو گیا۔ سوچا کہ اس نگر کو چھوڑو اور کسی اور نگر میں جا کر اپنی راجدھانی قائم کرو۔ قرعۂ فال آگرہ کے نام کا نکلا۔

تو لیجیے پوری صدی افراتفری میں گذر گئی۔ اور جب صدی ختم ہوئی تو یہ نیا گل کھلا کہ راجدھانی دلی سے آگرہ میں منتقل ہوگئی۔ یوں سمجھو کہ 1504ء میں یہ واقعہ گذرا۔ مگر سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ ایسا زلزلہ آیا کہ لگتا تھا کہ قیامت آ گئی۔ مگر سکندر لودھی دھن کا پکا نکلا۔ زمین پھر بھی نہیں چھوڑی۔ اور ایسی یہ زمین پکڑی کہ آگے چل کر مغلوں نے بھی ایک زمانے تک دلی کو منہ نہیں لگایا۔ آگرہ ہی کے گرویدہ رہے۔

دلی پھر بھی بادشاہوں کی مجبوری رہی۔ بقول 'واقعات دارالحکومت دہلی' ''جب تک تاج پوشی کی رسم باقاعدہ طور پر دلی میں ادا نہ کر لی جاتی تھی تخت نشینی مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی'' اور سکندر شاہ کو دیکھو کہ وہ سلطنت کے سارے کاروبار کو دلی سے اٹھا کر آگرہ لے گیا اور وہاں ایک نیا نگر سکندرہ کے نام سے آباد کیا۔ وہیں بیٹھ کر بادشاہی کی۔ وہیں بیمار پڑا۔ وہیں انتقال کیا۔ مگر اس کی لاش دلی لائی گئی۔ سکندر شاہ سکندرا چھوڑ کر دلی میں دفن ہوا۔

مگر آگرہ کے تخت پر لودھیوں کو کتنے دن بیٹھنا نصیب ہوا۔ سکندر لودھی کے بعد ابراہیم لودھی آیا۔ اور اس کے بعد کھیل ختم پیسہ ہضم۔ بابر کابل سے چلا اور مارامار کرتا ہوا دلی کی طرف بڑھا۔ ادھر سے ابراہیم ایک لشکر جرار لے کر مقابلہ کے لیے آگے بڑھا۔ پانی پت کے میدان میں رن پڑا۔ ابراہیم مارا گیا۔ بابر نے میدان مار لیا۔

تو لودھیوں کا دور ختم ہوا۔ اپنے باغوں اور مقبروں کے ساتھ لودھیوں کی دلی قصۂ ماضی ہوئی۔ اب یہاں مغل راج کریں گے اور اس شہر کو چار چاند لگائیں گے۔ 24 اپریل 1526ء کو ظہیر الدین بابر فتح کا ڈنکا بجاتا دلی میں داخل ہوا اور تخت پر رونق افروز ہوا۔

تخت نشینی کے بعد بابر نے شہر کو دیکھا بھالا۔ خواجہ بختیار کاکیں اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہوں پر حاضری دی حوضِ خاص اور حوضِ شمسی کی سیر کی۔ قطب مینار کا پھیرا لگایا۔ بہلول اور سکندر لودھی

کے باغ اور مقبرے دیکھے۔ اس کے بعد کشتی میں سوار ہو کر آگرہ چلا گیا۔ تیمور کے بعد بابر دوسرا مغل تھا جس نے دلی کی سرزمین پر قدم رکھا۔ مگر اس مغل کے تیور مختلف ہیں۔ وہ یہاں لوٹنے، کھسوٹنے اور لوگوں کے سر قلم کرنے کے لیے نہیں آیا ہے۔ ایک سلطنت قائم کرنے کے لیے آیا ہے۔ دلی کا اس کا پھیرا مختصر ہے۔ مگر اس کی آل اولاد اس ملک کو اور اس شہر کو بہت بنائے سنوارے گی۔ ان کے جداعلیٰ نے یہاں جو تباہی، بربادی پھیلائی تھی اس کی پوری پوری تلافی کرے گی۔

بابر نے جتنے دن حکومت کی اتنے دن آگرہ میں رہا۔ وہیں اس کا انتقال ہوا۔ مگر ہمایوں نے تخت پر بیٹھنے کے بعد دلی کو نوازا۔ یہاں اس نے اپنے مطلب کی ایک دلی بسانے کی ٹھانی۔ اس کا نام دین پناہ رکھا گیا۔ اور اس کے لیے جگہ وہ منتخب کی جہاں کہتے ہیں کہ اندر پرستھ آباد تھا۔ ساتھ میں قلعہ کی تعمیر بھی شروع ہوگئی۔ مگر ہمایوں کو اس نگر اور اس کوٹ میں رہنا بسنا نصیب نہ ہوا۔ یہاں تو شیر شاہ کو آ کر رہنا بسنا تھا۔ ہمایوں نے تو شیر شاہ سے ایسی شکست کھائی اور اپنے بھائیوں کے ہاتھوں ایسا خوار ہوا کہ دربدر پھرتا پھراتا ایران کی طرف نکل گیا۔ پھر اس قلعہ کی تعمیر میں جو کسر رہ گئی تھی اسے شیر شاہ نے پورا کیا۔ اور اپنی طرف سے اس میں وہ اضافہ کیا جسے شیر منڈل کا نام دیا گیا۔

پندرہ سال بعد ہمایوں کے دن پھرے۔ دشمن زیر ہوئے۔ وہ کامیاب و کامران ہوا۔ اور اب اس نے آگرہ سے منھ موڑا اور جم کر دلی میں بیٹھا۔ شیر منڈل کو اپنی لائبریری بنایا۔ مگر شیر منڈل پر تو شیر شاہ سوری کی مہر لگی ہوئی تھی۔ یہ عمارت اسے راس نہیں آئی۔ شیر شاہ نے اسے ہندوستان کی حکومت سے بے دخل کیا تھا۔ شیر منڈل نے اسے زندگی سے بے دخل کیا۔

اصل میں ہمایوں کو علم ہیئت سے بہت شغف تھا۔ اسی شوق میں ایک رصدگاہ کی تعمیر کا بھی منصوبہ باندھا ہوا تھا۔ ایک شام یہ سندیسہ لے کر آئی کہ آج مشتری اور زہرہ کا سنجوگ ہوا چاہتا ہے۔ یہ منظر دیکھنے کے لیے ہمایوں شیر منڈل کی بالائی منزل پر گیا۔ مشتری اور زہرہ کے سنجوگ کا نظارہ کیا۔ واپس اترنے لگا تو قریب کی مسجد سے اذان کی آواز کان میں پڑی۔ احتراماً سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ اذان کے ختم کے بعد عصا ٹیک کر اٹھنا چاہتا تھا کہ سنگ مرمر کی چکنی سیڑھی پر عصا رپٹا اور اس کے ساتھ شہنشاہ سیڑھیوں پر لڑھکتے پڑھکتے نیچے آ رہے۔ چوٹ شدید آئی۔ جانبر نہ ہو سکے۔ 24 جنوری 1556ء کو پیغام اجل آ گیا۔

ہمایوں ہر پھر کر دلی میں آ کر بیٹھا۔ پھر یہیں جیا یہیں مرا۔ یہیں دفن ہوا۔ ہمایوں کا مقبرہ دلی کی مشہور عمارتوں میں سے ہے۔ دلی میں اگر کسی مغل بادشاہ کا مقبرہ ہے تو بس یہی ہے۔ اصل میں نامی

گرامی مغلوں نے دلی میں مرنا اور دفن ہونا پسند ہی نہیں کیا۔ بابر نے آگرہ میں انتقال کیا اور کابل میں جا کر دفن ہوا۔ اکبر نے بھی آگرہ ہی میں مرنا اور دفن ہونا پسند کیا۔ جہانگیر لاہور میں دفن ہوا۔ شاہجہاں کے لیے آگرہ ممتاز محل کے انتقال کے بعد مجبوری بن گیا۔ تاج محل میں اس کے پہلو میں جا سویا۔ اورنگ زیب اللہ میاں کے پچھواڑے جنوب میں جا کر اورنگ آباد میں خاک کا پیوند ہوا۔ بعد کے جو مغل بادشاہ دلی میں سوتے ہیں وہ کسی شمار قطار ہی میں نہیں۔ ان میں سے کسی کا ایسا مقبرہ تعمیر نہیں ہوا کہ دلی کے مقبروں میں اس کا شمار ہوتا۔ رہ گیا آخری مغل بہادر شاہ ظفر۔ وہ آخری عمر میں مقید ہو کر رنگون سدھارا اور یہ کہتے کہتے کہ

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

اسی دیار میں آسودۂ خاک ہو گیا۔

ہاں بات ہمایوں سے چلی تھی جس نے دلی کو اپنا ٹھکانا بنایا تھا۔ مگر بیٹا باپ کی روش پر نہیں چلا۔ اکبر نے آگرہ کو نوازا اور یہاں شاندار قلعے کھڑے کیے۔ کوئی آگرہ میں کوئی فتحپور سیکری میں۔ پھر آگرہ اس کے نام کے حوالے سے اکبر آباد بن گیا۔

تو دارالسلطنت کی منتقلی کے بعد دلی کی ساری رونق ڈھل کر آگرہ چلی گئی۔ دلی میں بقول بشیر الدین احمد ''اب صرف ہمایوں کے وقت کے چند بڈھے ٹھڈے رہ گئے جو یہاں رہ پڑے۔ یہیں مرے اور یہیں زمین کے پیوند ہوئے۔''

آگرہ کو دلی کی سوکن جانو۔ ویسے تو دلی کی کئی سوکنیں ہوئیں مگر دو سوکنیں بہت بھاری پڑیں۔ ایک دیوگیر اور دوسری آگرہ۔ مگر دیوگیر کے ساتھ تو یہ ہوا کہ نئی نو دن پرانی سو دن۔ بس نو دنوں میں سلطان محمد تغلق بھر پائے۔ سارے شوق سارے ارمان ان نو دنوں میں پورے ہو گئے۔ خلقت کو دلی سے ڈنڈا ڈولی کر کے لے گئے تھے۔ شتابی سے الٹے پھرے اور پھر خلقت کو ڈنڈا ڈولی کر کے لائے۔ مگر آگرہ کے نو دن لمبے کھنچ گئے۔ اکبر نے دلی کو فراموش کر کے آگرہ کو اس طرح اپنایا کہ اسے آگرہ سے اکبر آباد بنا دیا۔ اس عرصے میں تیرہ برس تک لاہور میں بیٹھ کر حکمرانی کی۔ یک نہ شد دو شد۔

خیر اس کے بعد شہنشاہ جہانگیر آئے۔ انہوں نے اکبر کی ریت کو اپنایا اور اکبر آباد میں جمے بیٹھے رہے۔ پھر تخت پہ بیٹھے شہنشاہ شاہجہاں۔ اس شہنشاہ نے تو اکبر آباد کو چار چاند لگا دیے۔ سب سے بڑھ کر وہ عجوبۂ روزگار عمارت کھڑی کی جسے تاج محل کہتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ شہنشاہ کا اکبر آباد سے جی بھر گیا۔

دماغ میں ہلہلا اٹھا کہ بہت محل مقبرے تعمیر کیے۔ کوئی شہر بھی تو تعمیر کر کے دکھاؤ۔ بس اسی کے ساتھ اس بھولی بسری بستی کی یاد آئی جسے کسی بھلے وقت میں پردادا نے نوازا تھا۔ تو لیجیے تاج محل بن چکا۔ اب جہان آباد کی تعمیر ہونے لگی ہے۔ اور کیا خوب تعمیر ہوئی ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اگلی پچھلی سب دلیاں پس منظر میں چلی گئیں۔ بس اب شاہجہاں کی دلی راج رچے گی۔

شہر آباد جہاں آباد

آگرہ میں بہت رہ لیے۔ چلو واپس دلی چلیں۔ جانے وہ کیسی گھڑی تھی جب سکندر شاہ نے دلی کو سلام کر کے آگرہ کا رخ کیا تھا۔ پھر جو بادشاہ آیا اس نے آگرہ ہی کو پایۂ تخت بنایا۔ پہلے مغل بادشاہ بابر نے بھی یہیں بیٹھ کر حکمرانی کی۔ ہمایوں نے البتہ دلی کو نوازا اور اس قدیم شہر کے بیچ اپنا نیا شہر دیں پناہ کے نام سے آباد کیا۔ مگر ہمایوں پھر کتنے دن جیا اور کتنے دن اس شہر میں جم کر بیٹھا۔ اکبر نے پھر آگرہ ہی کو اپنا ٹھکانا بنایا اور اس شان سے بنایا کہ آگرہ اکبر آباد بن گیا۔ پھر جہانگیر آیا۔ اس نے بھی اکبر آباد ہی میں بیٹھ کر بادشاہی کی۔

اور اب شروع ہوتا ہے شاہجہانی دور۔ ویسے تو شاہجہاں بھی اکبر آباد ہی میں تخت نشین ہوا۔ کتنا زمانہ اس نے اسی شہر میں گذارا اور کس طرح اسے بنایا سنوارا۔ سب سے بڑھ کر تاج محل کی عمارت کھڑی کی۔ گویا اس طرح اس شہر پر اپنی مہر لگا دی۔ مگر اکبر آباد تو پھر بھی اکبر آباد ہی رہا۔ دادا اپنے نام کی ایسی پکی مہر لگا گیا تھا کہ تاج محل کی مہر کے بعد بھی وہ مہر اپنی جگہ برقرار رہی۔ بس پھر شاہجہاں کا جی اس نگر سے سیر ہو گیا۔ تب پردادا کے شہر کی یاد آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی لہر آئی کہ چلو دلی چلتے ہیں اور وہاں اپنے مطلب اپنے مزاج کا ایک شہر آباد کرتے ہیں۔

تو صاحبو اب دلی کے دن پھرنے لگے ہیں۔ پرانی دلی کے بیچ ایک نئی دلی بسا چاہتی ہے۔ اور یہ دلی ایسی رونق پکڑے گی کہ اگلی پچھلی سب دلیاں اس کے سامنے ماند پڑ جائیں گی۔ شاہجہاں آباد اس کا نام ہوگا جو مختصر ہو کر جہاں آباد بن جائے گا۔ مگر دلی کا نام بھی چلتا رہے گا۔ چاہو تو اسے دلی کہو چاہو جہاں آباد کہو۔

تو لو نقشے تیار ہو گئے۔ منصوبہ پروان چڑھنے لگا ہے۔ نئے شہر کا ڈول پڑا چاہتا ہے۔ بسم اللہ قلعہ

سے ہوگی۔ بادشاہ شہر کا ڈول ڈالے گا تو ظاہر ہے پہلے اپنا گھر بنائے گا۔ تو قلعہ کی تعمیر شروع ہوگئی۔ پہلے عزت خاں میر عمارت مقرر ہوئے۔ اس عہد کے نامی گرامی معمار استاد حامد اور استاد احمد نگران بنے۔ 1638ء اور ایک روایت کے مطابق وہ 1639ء تھا مطابق 1049ھ 9/محرم کی مبارک تاریخ۔ اس دن قلعہ کی بنیاد رکھی گئی۔

یہ تو ہوا تاریخی بیان۔ اب سنو روایتیں کہ قلعہ کی تعمیر میں کیسے کیسے اہتمام ہوئے اور کیا کیا گل کھلے۔ ناصر نذیر فراق نے دلہن نانی سے کہ قلعہ سے وابستہ رہی تھیں سنا اور یوں بیان کیا کہ ملکوں ملکوں سے سنگ مرمر، سنگ سرخ، سنگ سیاہ اور ہر طرح کا مال مسالہ آنے لگا۔ میر عمارت نے چنیا اینٹ کا پیمانہ ایک ٹھیکیدار کو دیا اور کہا' ایسی اینٹ تیار کرو۔ کچی نہ رہے' لاکھوری ہو۔ ٹھیکیدار نے حامی بھری' لاکھ روپے لیے اور کام میں جت گیا۔ کچھ دنوں بعد روتا بسورتا آیا اور بولا" میں لٹ گیا۔ ہزار دے کی آنچ تیز ہوگئی۔ اینٹوں کا کھنگر بن کر رہ گیا۔ بادشاہ تو اس بندے کا زن بچہ کولھو میں پلوا دے گا۔

میر عمارت نے ڈھارس بندھائی کہ فکر مت کر۔ فوراً بادشاہ کے حضور عرضی بھیجی کہ بنیادوں میں بجائے سنگ خارہ کے کھنگر بھرا جانا چاہیے کہ کھنگر پانی کو خوب جذب کرتا ہے اور بنیاد مضبوط رہتی ہے۔ عرضی منظور ہوئی۔ ٹھیکیدار خوش ہو کر کام میں جت گیا۔ آگے دلہن نانی سے سنو۔ "بڑے بڑے لوہے کے کڑھاؤ اور تانبے کی ناندوں میں چربی کھولائی جاتی تھی اور پھلکیوں کی طرح اس میں کوری اینٹیں ڈالی جاتی تھیں اور اینٹیں جب خوب چربی پی لیتی تھیں تو نکال کر ٹھنڈی کی جاتی تھیں اور گچ کے ساتھ بنیاد میں رکھی جاتی تھیں۔ گچ میں سفیدی نارنول کے پتھر کی' ماش کا آٹا' مردار سنگ' گوڑ' السی کا تیل سن مقرض ڈال کر بیل گری کا پانی چھان کر دیا جاتا تھا۔"

اس شان سے دن رات کام ہو رہا تھا۔ "لال قلعہ' اس کے اندرونی مکان' قصر و ایوان بن رہے تھے۔ تخت طاؤس کے لیے جواہر تراشے جاتے تھے۔ جنگل میں منگل تھا۔ ہزاروں مزدور' معمار' کاریگر خیموں میں' چھولداریوں میں' جھونپڑیوں میں پڑے تھے۔ دور دور کے پہاڑوں سے چھکڑوں میں پتھر لدھے چلے آ رہے تھے۔ ایک چھکڑے میں سو سو پچاس پچاس بیل جوتے جاتے تھے۔ سنگ تراشوں کی چھینیوں اور ٹانکیوں کی دھڑ ادھڑ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔"

دس برس میں تعمیر کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس وقت میر عمارت مکرمت خاں تھے۔ انہوں نے اطلاع پہنچائی۔ تب 24/ربیع الاول 1057ھ مطابق 1648ء بادشاہ سلامت اپنے شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ تشریف لائے اور قلعہ کو ملاحظہ کیا۔ "سر سے پاؤں تک سنگ سرخ سے گل رنگ۔ اس پر سنگ مرمر کے

حاشئے کا نرالا ڈھنگ۔ برجیاں، فصیلیں اور مرغولیں خوش نما۔ عمارتیں اور باغ اور باغوں کی نہریں ایسی دل کشا کہ اگر بے مبالغہ ایک ایک کی مفصل تفصیل کی جائے تو ایک دفتر آراستہ ہو جائے۔ کل قلعہ کا نقشہ دیکھو تو کاغذ پر ایک ہشت پہلو پھول نظر آتا ہے۔"

تب دربار کا اہتمام ہوا۔ دربار دیوان عام میں آراستہ ہوا۔ جشن کا اہتمام ہوا۔ دیوانِ عام کے سامنے وہ شامیانہ جس کا نام 'دل بادل' تھا تانا گیا۔ اور دیوان خاص کے سامنے وہ خیمہ جس کا نام سہا منڈل تھا نصب کیا گیا۔ یہ شامیانہ اور یہ خیمہ دونوں سات برس کی محنت سے تیار ہوئے تھے۔ تخت کی جگہ وہ تخت بچھایا گیا جسے بطور خاص تیار کیا گیا تھا۔ تخت طاؤس اس کا نام رکھا گیا۔ کیا شاندار تخت تھا۔ چھ فٹ لمبا چار فٹ چوڑا۔ چھ بھاری بھاری پائے۔ پائے اور تخت سب سونا ہی سونا۔ عقب میں دو مور دم پھیلائے کھڑے ہیں جیسے اب ناچنے کو ہیں۔ دموں میں نیلم، یاقوت، ہیرے، لعل، زمرد، پکھراج جڑے ہوئے۔ موروں کے بیچ ایک طوطا زمرد سے ترشا ہوا۔ تخت کے اوپر شامیانہ جواہرات سے جگمگاتا ہوا۔ آگے تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر چاندی کا کٹہرا۔ 'واقعات دارالحکومت دہلی' میں یوں بیان ہوا "کٹہرے کے باہر اول یمین و یسار شہزادگانِ والا تبار۔ ان کے بعد راجہ مہاراجہ، ملک ملک کے حاکم، امیر وزیر اپنے اپنے مراتب سے کھڑے۔ مگر تمام فرمانبرداروں کی آنکھیں زمین پر اور گوشِ دل اپنے فرمانروا کے حکم پر لگے تھے۔ ہر ایک در میں دو دو خاص بردار مخمل کی غلاف دار بندوقیں کندھوں پر، بادلے کی جھنڈیاں ہاتھوں میں لیے بت بنے ہوئے قائم تھے۔ باہر کے دالان اور عہدہ دار جاگیردار منصب دار حکم کے منتظر حاضر تھے۔ اس سے آگے کے دروں میں تین تین حبشی جیسے کالے دیو، آنکھیں لال لال، زربفت کی وردیاں پہنے، ہتھیاروں میں اینچی بنے، گرزہائے فولادی کندھوں پر، بادلے کی بیرقیں ہاتھوں میں۔ تیسرے درجے میں اہلکار اور ہر کارخانے کے کاردار، منشی متصدی، قلمدان کمر میں، بستے آگے رکھے موجود تھے۔ اور دروں میں سپاہی ننگی تلواریں علم کیے، قد آدم چاندی کے کٹہرے سے لگے خاموش کھڑے تھے۔ باہر تیس تیس گز کا فاصلہ دے کر پھر چاندی کا کٹہرا تھا۔ اور اس کے برابر بہادر سپاہی خاص بادشاہی جن میں دائیں پر ترک، بائیں پر افغان، سامنے راجپوت، اپنی زرق برق وردیاں پہنے، سنہری روپہلی بیرقیں ہاتھوں میں لیے جمے تھے۔ یہاں سے دروازے تک سواروں کے پرے دو رستہ پابستہ آراستہ تھے۔ جو درباری لوگ آتے پہرے پہرے پر اپنے نام و نشان بتاتے اور آگے چلے جاتے۔ مگر دبدبہ و دہشت کا یہ عالم تھا کہ ہوش و حواس کے قدم تھراتے تھے۔ دربار میں پہنچ کر تین سلام گاہوں پر تسلیم بجالاتے تھے۔ جب نقیب آواز دیتا تھا کہ آداب بجالاؤ۔ جہاں پناہ بادشاہ سلامت۔ عالم

پناہ بادشاہ سلامت۔ ادب سے' تفاوت سے' تو دل سینوں میں دہل جاتے تھے۔ کٹہرے کے پاس کورنش کا آداب ادا کرتے تھے۔''

یہ دن کا نقشہ تھا۔ رات کو جشنِ ماہتابی برپا ہوا۔ اس جشن کی اپنی دھوم دھام تھی۔

جشن نو دن چلا۔ لیجیے قلعۂ شاہجہانی کا افتتاح ہوگیا۔ اب یہ لال قلعہ کا نام پائے گا اور شہرت دوام کی سند حاصل کرے گا۔

بادشاہ کا گھر بن چکا۔ اب اللہ کا گھر بننے لگا ہے۔ یعنی شاہجہانی قلعہ۔ اس کے بالمقابل شاہجہانی مسجد۔ قلعہ 1648ء میں بن کر کھڑا ہوا۔ مسجد 1650ء میں بن کر تیار ہوئی۔ مگر یہ مسجد ایسے ہی تھوڑا ہی بن گئی۔ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ ناصر نذیر فراق کی نانی دلہن تو ہر واقعہ کو ایک کہانی بنا دیتی تھیں۔ تو اب یہ انہیں کی زبانی ہے کہ مسجد کی نیویں بھری گئی تھیں کہ معمار نقشہ سمیت ایسا غائب ہوا کہ کنوؤں میں اس کے لیے بانس ڈلوادیئے مگر اس کا پتہ نہیں ملا۔ ایک برس گذرا' دوسرا برس گذرا' تیسرا برس گذرا۔ معمار ہے کہ اس کا اتا پتہ ہی نہیں۔ تین برس پورے ہوگئے تب وہ اچانک نمودار ہوا اور دربار میں پہنچ کر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''جہاں پناہ' جان کی اماں پاؤں تو عرض کروں کہ مسجد کی عمارت بھاری ہوگی۔ نئی بنیاد پر ایسی بھاری اور اونچی عمارت کا لے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ برسات کا پانی نیو میں مرتا اور اس کے ساتھ در و دیوار نیچے کھسکتے اور ڈاٹیں' کمانیں' محرابیں جھک جاتیں۔ یہ سوچ کر فدوی روپوش ہوگیا تھا۔ اب اس نیو پر سے تین برساتیں گذر گئی ہیں تو سمجھو کہ وہ لوہا لاٹ ہوگئی ہے۔ اب جو عمارت اس پر کھڑی ہوگی وہ صدیوں کھڑی رہے گی۔''

بات بادشاہ کی سمجھ میں آئی۔ قصور معاف ہوا۔ خلعت عطا ہوئی۔ تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔ 1650ء میں بن کر کھڑی ہوگئی۔ لیکن بیچ میں پھر ایک کہانی آپڑی۔ اتنی اونچی کرسی' اور اتنی بلند و بالا عمارت جس نے دیکھا وہ حیران ہوا۔ مگر کسی کو شک ہوا کہ مسجد پوری طرح قبلہ رخ نہیں ہے۔ قطب نما رکھ کر قبیلہ کا رخ جانچا گیا۔ مسجد واقعی قبلہ رخ نہیں تھی۔ اس پر منتظمین پریشان ہوئے۔ مگر اسی ہنگام کسی سمت سے ایک درویش نمودار ہوا۔ پوچھا کیا قصہ ہے۔ لوگوں نے قصہ بتایا۔ بولا ''کوئی مضائقہ نہیں۔'' یہ کہہ کر آگے بڑھا۔ مسجد کے ایک کونے سے پشت لگائی اور پھر تھوڑا زور لگایا۔ اے لو یہ تو پوری مسجد سرک گئی اور قبلہ رخ ہوگئی۔ خلقت میں شور پڑ گیا کہ درویش کی کرامات سے مسجد قبلہ رخ ہوگئی۔ کرید ہوئی کہ یہ درویش کون ہے۔ مگر وہ درویش پھر ایسا غائب ہوا کہ کسی کو نظر نہیں آیا۔
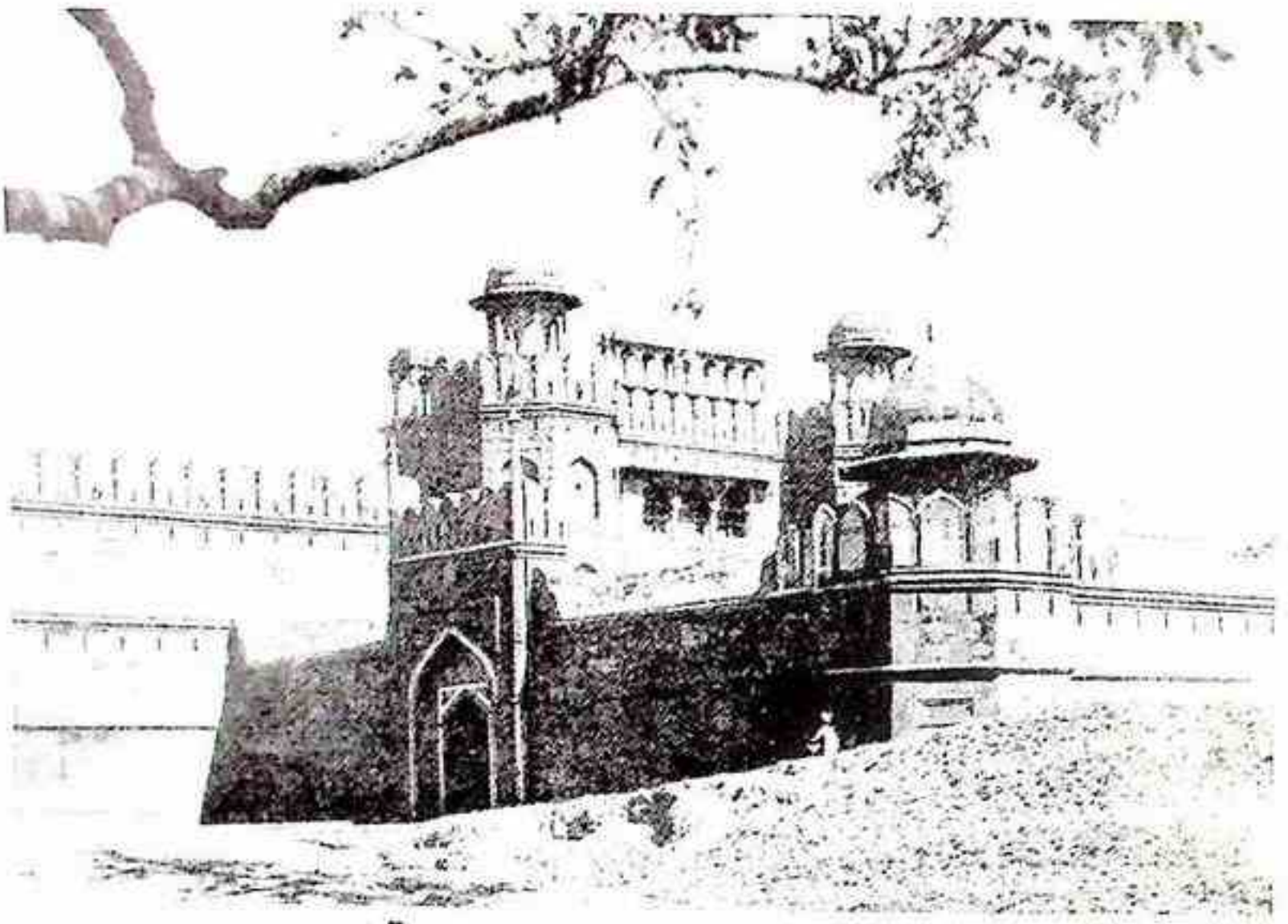
دہلی کا قلعہ جس کو شہنشاہ شاہجہان نے ۱۶۳۹-۴۸ء میں تعمیر کرایا تھا۔
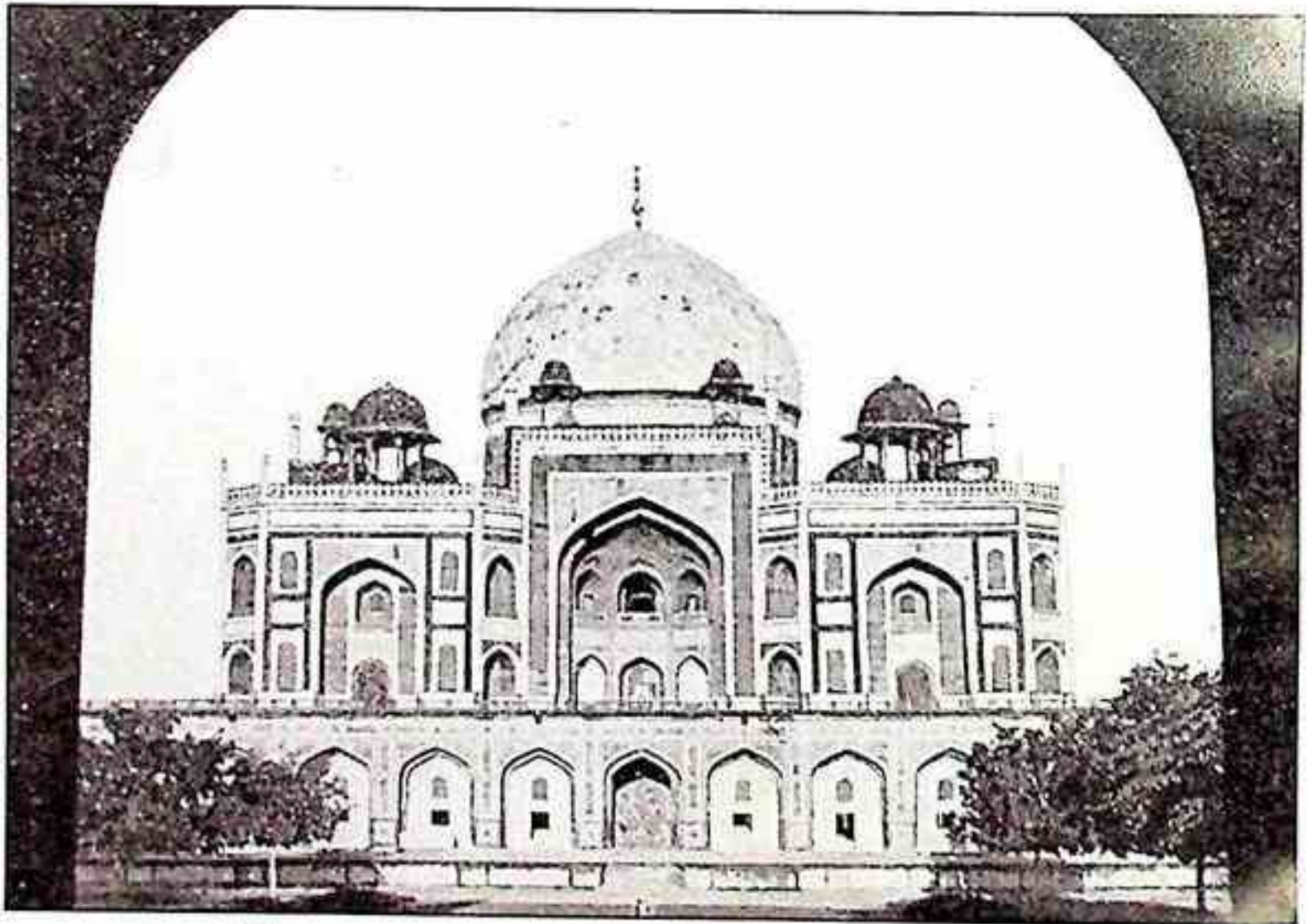
شہنشاہ اکبر کے باپ شہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ جو اُس کی بیوہ ملکہ نے ۱۵۷۰ء میں تعمیر کرایا تھا۔
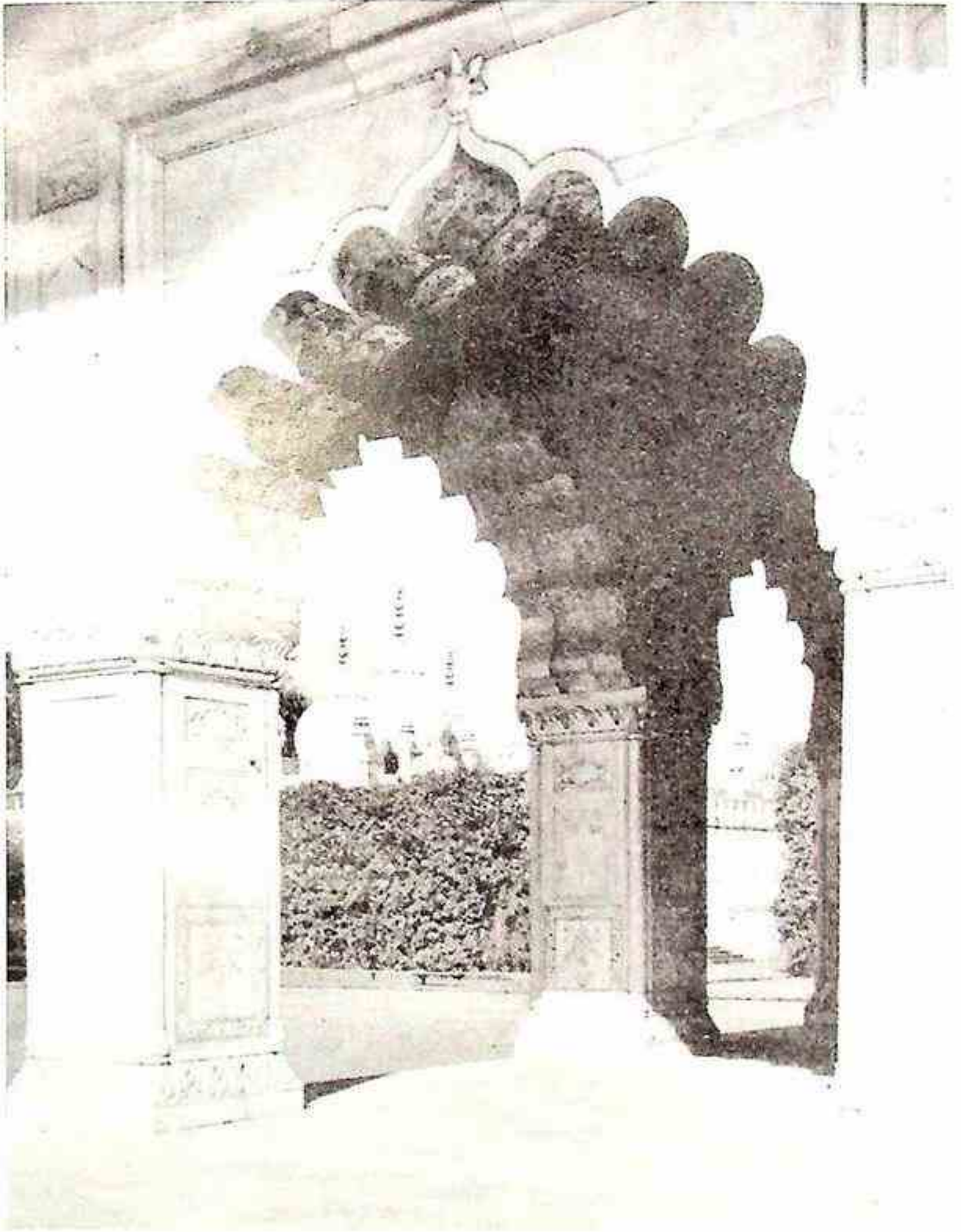
محل کی موتی مسجد، یہ دیوان خاص سے دکھائی دیتی ہے۔

لال قلعہ سے ہزار گز کے فاصلہ پر بھوجلا پہاڑی پر تعمیر ہونے والی اس مسجد کی کیا خوب شان نکلی۔ اونچی کرسی سمجھ لو کہ سطح زمین سے تیس فٹ بلند چودہ سو مربع گز کا ایک چبوترہ سنگ سرخ سے بنا ہوا۔ تین اطراف میں تیس سے اوپر سیڑھیاں' مشرق کی طرف پینتیس' شمال کی طرف انتالیس' جنوب کی طرف تینتیس' تین عالیشان دروازے' چھ سال میں بن کر تیار ہوئی اور افتتاح اس طرح ہوا کہ وہ صبح عید تھی۔ شاہجہاں نے طے کیا کہ نماز عید اپنی بنائی ہوئی مسجد میں چل کر پڑھیں گے۔ قلعہ سے عید کی مبارک صبح شاہی سواری نکلی۔ قلعہ کے دروازے سے مسجد کے شرقی دروازے تک سواروں کی قطار۔ آگے آگے نقیب اور چوبدار۔ ان کے پیچھے شہزادگانِ والا تبار۔ اس شان سے جلوس چلا اور مسجد میں داخل ہوا۔ نمازِ عید ادا ہوئی۔ اس نماز کے ساتھ مسجد میں نمازوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ خلقت کے لیے دروازے کھل گئے۔ پنج وقتہ نماز ہونے لگی

واہ دلی کی مسجد جامع
جس میں براق فرشِ سنگی ہے

تو خیر اللہ کا بھی گھر بن گیا۔ مگر ایک گھر اللہ کے گھر اور بادشاہ کے گھر دونوں سے پہلے بن چکا تھا۔ یہ تھا مٹیا محل۔ جب کسی تعمیر کا نقشہ بچھتا ہے تو مزدور معمار وہیں ڈیرا ڈال دیتے ہیں اور اپنے سر چھپانے کے لیے کچا پکا گھر بنا لیتے ہیں۔ مٹیا محل کی یہی صورت تھی۔ ملا واحدی کے بقول "یہ کچا پکا مکان تھا جس میں بیٹھ کر نگران عملہ جامع مسجد اور لال قلعہ اور سارے شہر کی تعمیرات کی نگرانی کرتا تھا۔"

اور لیجیے اب تعمیرات کا نقشہ پھیلتا چلا جا رہا ہے اور شہر کی شکل نکلتی چلی آ رہی ہے۔ لال قلعہ کے لاہوری دروازے سے خیموں اور جھونپڑیوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہے کہ ایک پورا بازار وجود میں آ گیا ہے۔ جو' جوار' باجرہ' گیہوں' مطلب یہ کہ قسم قسم کی جنس' قسم قسم کی سبزی ترکاری' قسم قسم کا میوہ جو چاہو خرید لو۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ اس بازار میں جس نے اردو بازار کے نام سے شہرت پائی ہر شے ہر جنس دستیاب ہونی چاہیے کہ کاریگروں اور مزدوروں کو جو دور دور کے دیسوں سے آئے ہیں کسی چیز کی کمی کا اور کسی تنگی کا احساس نہ ہو۔

شاہجہاں نے شہر کی تعمیر کے لیے ایک طریقہ یہ اختیار کیا کہ اسے مختلف حصوں میں بانٹا اور اپنی اولاد کے سپرد کر دیا کہ شاہی خزانے سے رقم لو اور اپنے اپنے حصے میں مکان' محل' حویلیاں' باغ اور بازار بنواؤ اور اس نئے شہر کو چار چاند لگاؤ۔ بس پھر شہزادوں' شہزادیوں اور بیگمات نے اپنے اپنے ذوق کے حساب

سے تعمیر میں حصہ ڈالنا شروع کر دیا۔ سب سے بڑی شہزادی شاہجہاں کی چہیتی بیٹی جہاں آرا نے وہ بازار بنوایا جو آگے چل کر چاندنی چوک کے نام سے مشہور ہوا۔ قلعہ کے لاہوری دروازے سے شروع ہو کر پندرہ سو بیس گز کی لمبائی میں پھیلتا چلا گیا۔ پندرہ سو بیس گز لمبا، چار گز چوڑا۔ بیچ میں نہر۔ نہر کے دونوں طرف ہرے بھرے درخت۔ مگر جہاں آرا نے اس ایک بازار ہی کی تعمیر کو کافی نہیں جانا۔ بازار سے تھوڑا آگے ایک باغ لگایا اور ایک سرائے تعمیر کی۔ باغ بیگم کے باغ کے نام سے مشہور ہوا۔ سرائے اتنی وسیع کہ ہزار مسافر ٹھہر سکتے تھے۔ قیام و طعام کے سارے اخراجات شہزادی کے ذمے۔

شاہجہاں کی ایک بیگم تھیں فتحپوری بیگم۔ انہوں نے اس بازار سے آگے ایک مسجد تعمیر کرائی۔ یہ مسجد فتحپوری کی مسجد کہلائی اور چاندنی چوک کی آخری حد ٹھہری۔

ایک اور بیگم تھیں اکبر آبادی بیگم۔ انہوں نے بھی ایک بازار تعمیر کرایا، بالکل چاندنی چوک کی ٹکر کا۔ اسی طرح بیچ بازار میں بہتی ہوئی نہر اور نہر کے دونوں طرف درخت۔ نہر کے نام کی نسبت سے یہ بازار فیض بازار کہلایا۔

یہ دونوں بازار 1650ء میں آگے پیچھے وجود میں آئے۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے ایسی رونق پکڑی کہ چلتے ہوئے یہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اور بازار بھی کم پر رونق نہیں تھے۔ خاص بازار، خانم کا بازار، اردو بازار، چوک سعد اللہ، مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ سب بازاروں کو زمانہ چاٹ گیا۔ بقائے دوام چاندنی چوک کے نام لکھی گئی۔

بازاروں کے سوا دروازے، کھڑکیاں، محلے، کوچے۔ سب کوچے اوراق مصور۔ دروازے چودہ اور چودہ ہی کھڑکیاں۔ کشمیری دروازہ، موری دروازہ، کابلی دروازہ، لاہوری دروازہ، اجمیری دروازہ، ترکمان دروازہ، خیراتی دروازہ، راج گھاٹ دروازہ، کلکتہ دروازہ، کیلا گھاٹ دروازہ، پتھر گھاٹی دروازہ، بدر دروازہ، نگھمبود دروازہ اور نگھمبود کے متعلق مصحفی نے کیا خوب کہا

تختۂ آب چمن کیوں نہ نظر آئے سپاٹ
یاد آئے مجھے جس دم وہ نگھمبود کا گھاٹ

اور مصحفی کیا اس گھاٹ کا حوالہ تو مہابھارت میں بھی ملے گا کہ اندر پرستھ سے اس کا رشتہ ملتا ہے۔

اور اب ذرا کھڑکیوں کی بھی گنتی کر لیں۔ کھڑکی زینت المساجد، کھڑکی نواب احمد بخش خاں، کھڑکی نواب غازی الدین خاں، کھڑکی نصیر گنج، نئی کھڑکی، کھڑکی شاہ گنج، کھڑکی اجمیری دروازہ، کھڑکی

سید بھولا' کھڑکی بلند بلاغ' کھڑکی فراش خانہ' کھڑکی امیر خاں' کھڑکی خلیل خاں' کھڑکی بہادر علی خاں' کھڑکی نگھمبود۔

چودہ دروازوں' چودہ کھڑکیوں کے سوا چھتیس محلے۔ ہر محلہ میں اونچی حویلیاں' پیچ در پیچ گلیاں اور بقول میر ؎

ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں
دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں

اور ان گلیوں میں مکانوں کی کیا صورت تھی۔ صحن میں خانہ باغ' حوض' فوارے' ایک تہہ خانہ فراشی پنکھوں سے آراستہ' پھر صدر دروازہ۔

چو جنت بر زمینش ہر مکانے
بود در ہر مکانے بوستانے

بستی بستے بستے بستی ہے۔ شاہجہاں آباد نے بسنے میں سات برس لیے۔ آنے والے اسے بنائیں سنواریں گے' اپنے اپنے حساب سے کلی پھندنے ٹانکیں گے۔ یہ تو ابتدائی نقشہ تھا لیکن اس ابتدائی نقشہ میں بھی وہ کتنا بنا سنورا' کتنا شاد آباد نظر آتا ہے۔ کتنے برس بعد اس شہر کے دن پھرے۔ تیمور نے اسے برباد کیا۔ اسی کی اولاد میں وہ سپوت پیدا ہوا جس نے اسے پھر سے آباد کیا۔ اور شاعر نے نئے شہر کی تاریخ یوں کہی ع

شہر شاہجہاں آباد از شاہجہاں آباد

شہر آباد کچھ اس رنگ سے ہوا کہ اس کی شکل کمان کی سی بن گئی۔ کمان کی تانت کا ایک سرا جمنا ندی۔ دوسرا سرا قلعہ کو جانو۔ گرداگرد فصیل جس کا دور ایک اندازے کے مطابق ساڑھے پانچ میل دوسرے اندازے کے مطابق دس میل تھا۔ سو سو قدم کے فاصلہ سے ایک ایک برج۔ جابجا باغ۔ کشادہ قطعات۔ شاد آباد محلے۔ محلوں میں بڑی بڑی حویلیاں۔ لمبے چوڑے بازار' فیض بازار' خاص بازار' خانم کا بازار' اردو بازار۔ اور بازاروں کی ملکہ چاندنی چوک۔ بازاروں میں وہ ہجوم کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ دکانوں میں سو طرح کا مال و اسباب بھرا ہے ؎

نشستہ ہر طرف گوہر فروشے
براوردہ زوریا ہاخروشے

فتادہ ہر طرف صد لعلِ رخشاں
بود درہر دکاں کانِ بدخشاں

جوشعر قلعہ کے ایوانِ عام کی پیشانی پر لکھا گیا تھا کیا مضائقہ ہے کہ اسے شاہجہاں آباد کی پیشانی پر کندہ کردیا جائے ۔

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

دلی کی سرزمین پر وقفے وقفے سے کتنے نگر آباد ہوئے۔ مگر کسی نگر نے کبھی اپنے بانی سے وفا نہیں کی۔ ایک بوڑھی پھونس میم نے 'City of Djinns' کے مصنف سے باتیں کرتے ہوئے اس بسرے زمانے کو یاد کیا جب نئی دہلی کا ڈول پڑ رہا تھا۔ اسے اپنا باپ یاد آیا جو اس نئی تعمیر کے سخت خلاف تھا۔ کہتا تھا کہ یہ پیسہ جو اس تعمیر پر پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے کسی بہتر کام پر صرف ہو سکتا تھا۔ اصل میں اس نے دلی کی ایک پرانی کہاوت سن لی تھی جو اس کے دماغ میں پھنس گئی تھی۔ یہ کہاوت کیا تھی ایک پیشگوئی تھی کہ دلی کی سرزمین پر جو بھی کوئی نیا شہر بسائے گا وہ بہت جلدی اس سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ تو جب بھی نئی دہلی کی تعمیر کا قصہ چھڑتا یہ گورا صاحب بہت اداس لہجہ میں فارسی کا وہ شعر پڑھتا جس میں اس پیشگوئی کا ذکر تھا اور چپ ہو جاتا۔ بوڑھی پھونس میم بھی اداس ہو گئی۔ بولی ''میرا باپ صحیح کہتا تھا۔ دلی کی زمین پر جس نے بھی نیا شہر بسایا اسے اس شہر سے ہاتھ دھونے پڑے۔ پانڈو برادران' پرتھوی راج چوہان' فیروز شاہ تغلق' شاہجہاں' غرض جس جس نے اس دھرتی پر نیا نگر بسایا اس کے ساتھ یہی ہوا۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہونا تھا سو ہوا۔''

جب دلی کی تاریخ ہی یہ چلی آتی ہے تو شاہجہاں اس سے کیسے بچ جاتا۔ اور جب وفا اس دھرتی کی گھٹی ہی میں نہیں پڑی تو جہاں آباد کی اس میں کیا خطا اور کیا تخصیص ہے۔ پھر بھی تعجب تو ہوتا ہے کہ زمانہ کتنی سرعت سے بدلا اور جہاں آباد نے کتنی جلدی اپنے بسانے والے سے آنکھیں پھیر لیں۔

ابھی دس برس پہلے شہنشاہ شاہجہاں نے کس کروفر سے اپنے بنائے ہوئے اس شہر میں قدم رکھا تھا۔ کس تزک و احتشام سے سواری باد بہاری لال قلعہ میں داخل ہوئی۔ بادشاہ تختِ طاؤس پر رونق افروز ہوا۔ کس شان سے دربار منعقد ہوا اور کس دھوم دھام سے جشنِ ماہتابی برپا ہوا۔ وہ 1648ء تھا۔ اب 1659ء

ہے۔ وہ دربار، وہ جشنِ ماہتابی قصۂ ماضی ہوا۔ اب نئی تخت نشینی نئے دربار کا اہتمام ہے۔ جس نے اس شہر کو آباد کیا وہ آگرہ میں مقید بیٹھا ہے۔ یہاں جہاں آباد میں ایک نیا جلوس نکل رہا ہے اور ایک نئے جشن کا اہتمام ہے۔ ایسا جشن کہ شاہجہانی جشن اس کے سامنے ماند نظر آتا ہے۔ یہ اس کے باغی بیٹے اورنگ زیب کی تاجپوشی کا جشن ہے۔

تخت کے اصل وارث داراشکوہ نے شکست کھائی۔ اورنگ زیب فتح یاب ہوا۔ فتح یاب اورنگ زیب اس فتح کے ساتھ ہی اورنگ زیب سے اورنگ زیب عالمگیر بن گیا۔ کس کروفر سے اس نے جہاں آباد میں قدم رکھا۔ کس شان وشوکت سے جلوس لال قلعہ کی طرف چلا۔ آگے آگے طنبورے، نفیری نقارے بجتے جاتے ہیں۔ پیچھے ہاتھی قطار اندر قطار جھومتے چل رہے ہیں۔ ہر ہاتھی پر موتیوں سے جڑی مخمل اور زربفت کی جھولیں پڑی ہیں۔ پانوؤں میں چاندی کی زنجیریں ہیں۔ پشت پر شاہی پرچم لہراتا ہے۔ ان کے پیچھے گھوڑوں کی قطار ہے۔ سونے چاندی کی زینیں کسی ہوئیں، لگاموں میں جواہرات جڑے ہوئے۔ ان کے پیچھے پیادے ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیے۔ پھر امرا کی صفیں۔ ان صفوں سے گزرو۔ ایک شاندار ہاتھی پر اورنگ زیب سوار ہے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے مسلح فوجی دستے۔ سواری پر چاندی سونے کا مینھ برس رہا ہے۔

سواری بادبہاری قلعہ میں داخل ہوتی ہے۔ دیوانِ عام کو کیا خوب آراستہ کیا گیا ہے۔ ستونوں اور چھتوں پر کم خواب، زربفت اور مخمل کے غلاف چڑھے ہوئے۔ محرابوں میں قندیلیں لٹکی ہوئیں۔ تخت طاؤس بھی خوب سجا بنا ہے۔ موروں کے پروں میں نیلم، زمرد، پکھراج اور یاقوت جڑے ہیں۔ اوپر شامیانہ ہے۔ درباریوں نے زرق برق لباس پہن رکھے ہیں۔ لیجئے اورنگ زیب عالمگیر تخت پر رونق افروز ہوئے۔ تاج ان کے سر پر دھرا گیا۔ اب وہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر ہیں۔

اس تاجپوشی کے ساتھ سلطنت مغلیہ کا نیا دور شروع ہوا اور جہان آباد کی رنگارنگی میں اضافہ ہوا۔ مگر اس رنگارنگی میں اب خون کا رنگ بھی شامل ہو چلا تھا۔ اس رنگ سے ابھی تک یہ نیا شہر ناآشنا تھا۔ دارا کا سر تو خیر قلم ہونا ہی تھا۔ مگر ایک صوفی کے سر پر بھی قضا کھیل رہی تھی۔ اورنگ زیب کی بادشاہی کتنی مبارک نکلی کہ جہان آباد کو ایک شہید میسر آ گیا۔ اسے صوفیا کی درگاہیں اور خانقاہیں تو پچھلی دلیوں سے ورثے میں ملی تھیں، ایک شہید کا مزار اسے اورنگ زیب کی بادشاہی کے طفیل میسر آیا۔ شاہجہانی مسجد کی سیڑھیوں پر رنگ رنگ کی مخلوق کا جمگھٹا رہنے لگا تھا۔ مگر ایک مخلوق سب سے نرالی تھی۔ یہ ایک مجذوب تھا، عالم محویت میں گم، دنیا جہاں سے بے تعلق، لباس سے بے نیاز۔ پھر بے لباسی ہی اس کا طرۂ امتیاز بن گئی۔ داراشکوہ خدارسیدہ

بزرگوں کا متوالا تھا۔ اس نے اس مجذوب کو دیکھا اور اس کا شیدائی بن گیا۔ ادھر مجذوب کو بھی دارا شکوہ سے ایسا انس ہوا کہ شہزادے اور فقیر کی دوستی ضرب المثل بن گئی۔ مولوی ملا صوفیوں مجذوبوں کے سدا سے بیری چلے آتے ہیں۔ اس مجذوب کو کہ ننگ دھڑنگ مسجد کی سیڑھیوں پہ دھرنا دیئے بیٹھا رہتا تھا کس دل سے برداشت کرتے۔ دارا شکوہ کے ہوتے ہوئے تو ان کی دال گلی نہیں۔ مگر اس کی آنکھ بند ہوتے ہی ان کی بن آئی۔ اورنگ زیب سے شکایتیں ہونے لگیں کہ سرمد خلاف شرع باتیں کرتا ہے' ننگا پھرتا ہے۔ بیشک موجب قتل ہے۔ اورنگ زیب مولوی مُلّاؤں سے بڑھ کر مولوی مُلّا۔ اور پھر دارا سے جو سرمد کا تعلق رہا تھا وہ بھی تو اس کے دل میں پھانس بن کر کھٹک رہا تھا۔ اس نے بالآخر اس فقیر سے باز پرس کی۔ پوچھا کہ "تم ننگے کیوں پھرتے ہو۔"

سرمد نے فی البدیہہ جواب دیا

آں کس کہ ترا سریر سلطانی داد
مارا ہمہ اسبابِ پریشانی داد
پوشاند لباس ہر کہ راعیبے دید
بے عیباں را لباسِ عریانی داد

اورنگ زیب ایسے جواب کا کب متحمل ہو سکتا تھا۔ اس نے علما سے فتویٰ لیا اور سرمد کا سر قلم کرا دیا۔ مسجد کے نواح میں ہرے بھرے شاہ کا مزار پہلے ہی موجود تھا۔ اس کی بغل میں اب ایک شہید کا مزار بن گیا۔ اللہ جانے ہرے بھرے شاہ کون تھے۔ کہتے ہیں کہ سرمد کے پیر تھے۔

پتہ نہیں سرمد شہید کا خون رنگ لایا یا اورنگ زیب کی اپنی متعصبانہ پالیسیاں تھیں کہ اسے تخت پہ اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا اور ایک وقت وہ آیا کہ جہان آباد ہی سے اس کا ڈیرا اٹھ گیا۔ دکن کی مہم سر کرنے کا سودا دماغ میں سمایا اور وہ ادھر کالے کوسوں کے سفر پر نکل گیا۔ مہم لمبی ہوتی چلی گئی اور جہان آباد کی رونق ماند پڑتی چلی گئی۔ ماند پڑنی ہی تھی۔ خالی تخت کے ساتھ کوئی دارالسلطنت کتنے دن اپنی رونق کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ بادشاہ شہر سے گیا تو اس کے ساتھ کتنا کچھ چلا گیا۔ کیسے کیسے لوگ شریف و وضیع' ترچھے بانکے' ٹھسے والے' طرم باز خاں کہ شہر کی رونق تھے کچھ بادشاہ کی معیت میں سدھارے' کچھ بعد میں طلبی پر ایک ایک کر کے جاتے رہے۔ جہاں آباد اجڑتا چلا گیا۔ کہئے کہ دلی کا پانی دکن بہہ گیا۔ اور واپسی نہ آج ہوتی ہے نہ کل۔ برہہ کے گیتوں کی روایت پہلے سے چلی آ رہی تھی۔ اب ان گیتوں میں ایک نئی چبھن پیدا ہو گئی۔

دلی شہر سہاونا اور کنچن برسے نیر
سب کے کنتھ بٹور کے لے گئے عالمگیر
صاحب کی منتی کرو اور من میں راکھو دھیر
اب کے بچھڑے جب ملیں جب پلٹیں عالمگیر

مگر اب حضرت عالمگیر کو کہاں پلٹنا تھا۔ انہیں تو اب وہیں پیوندِ زمین ہونا تھا۔ دلی سے دکن سدھارے۔ دکن سے آخرت کو سدھارے۔

بس پھر اورنگ زیب کے سفر آخرت کے بعد ہی اجاڑ جہان آباد کے دن پھرے۔ اورنگ زیب کے بعد اس کا بیٹا شہزادہ معظم شاہ عالم بہادر شاہ بن کر تخت پر بیٹھا۔ دلی بارہ برس تک اجاڑ رہنے کے بعد پھر شاد آباد ہونا شروع ہوئی۔ مگر اب پرانی رونق کو کہاں واپس آنا تھا۔ حضرت عالمگیر ایسے گئے کہ مغلیہ سلطنت کی طاقت وشوکت کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ سلطنت کو گھن لگ چکا تھا۔ تخت ہل گیا تھا۔ اس تخت پہ پھر کوئی جم کر بیٹھ ہی نہ سکا۔ وارثوں میں کوئی اتنے دم خم والا نکلا ہی نہیں کہ فتنوں پر قابو پاتا اور ٹھکانے سے سلطنت کا کاروبار چلاتا۔ جلد ہی وہ برا وقت آ گیا جب اس شہر کو ایک بڑی بربادی دیکھنی پڑی۔ ویسی ہی جیسی تیمور کی یلغار کے وقت دیکھنی پڑی تھی۔ بلکہ شاید اس سے بڑھ کر۔

اورنگ زیب کا انتقال 1707ء میں ہوا تھا۔ سمجھو کہ اس کے بعد تیس سال کے اندر اندر یہ نوبت آ گئی کہ نادر شاہ دندناتا ہوا آیا اور دلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بقول غالب ؏

شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت

شہر میں حکم نادری سے قتل عام ہوا۔ آدمیوں کے گلے کھیرے ککڑی کی طرح کٹنے لگے۔ جب ایک لاکھ سے اوپر گلے کٹ گئے اور لاشوں کے انبار لگ گئے تب نادر شاہ نے سانس لیا اور اس کے سپاہیوں نے ہاتھ روکا۔

نادر شاہ تو لوٹ مار کر کے چلا گیا۔ مگر اب یہ شہر جسے شاہجہاں نے اتنے چاؤ سے آباد کیا تھا بے حال ہو چکا تھا اور بربادی نے گھر دیکھ لیا تھا۔ نادر شاہی بربادی کو ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ ایک اور نادر شاہ دلی پر چڑھ دوڑا۔ یہ احمد شاہ ابدالی تھا۔ نادر شاہ نے 1739ء میں دلی کو تاراج کیا تھا۔ اس کے سترہ برس بعد سمجھو کہ 1757ء میں احمد شاہ ابدالی نے اس شہر پر دھاوا بولا۔ تیمور اور نادر شاہ کے بعد یہ تیسرا لٹیرا تھا جس نے دلی کو جی بھر کر لوٹا اور خلقت کو مولی گاجر کی طرح کاٹا۔ مگر اس مرتبہ اس خونیں واردات میں ایک طنزیہ پہلو بھی

شامل ہو گیا۔ دلی کے زعما نے خود اس مصیبت کو دعوت دی تھی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ مرد دلیر ہندوستان کے مسلمانوں کو مرہٹوں کی دستبرد سے بچائے گا۔ سو انہوں نے اسے نجات دہندہ جانا تھا۔ نجات دہندہ نے مرہٹوں کی سرکوبی تو کی مگر دلی کے مسلمانوں کو بھی روند ڈالا۔ ایک بار لوٹا۔ پھر دوسری بار لوٹا۔ مرے کو مارے شاہ مدار۔ پھر اس لٹی پٹی دلی کو مرہٹوں اور جاٹوں نے لوٹا۔ اس کے بعد شہر کا جو نقشہ تھا وہ میر سے سنئے:

''ایک دن میں سیر کو نکلا۔ میرا گذر شہر کے ایک نئے ویرانے پر ہوا۔ میں ہر قدم پر رویا اور عبرت حاصل کی۔ جب آگے بڑھا تو حیرت بڑھ گئی کیونکہ میں ان مقامات کو نہ پہچان سکا۔ مجھے شہر کے اس حصے کا پتہ نہ چل سکا کیونکہ نہ وہاں عمارات تھیں نہ رہنے والے۔ ڈھے ہوئے گھر' ٹوٹی ہوئی دیواریں' بے صوفی کی خانقاہیں' بغیر شرابیوں کے بھٹیاں...... بازار کہاں تھے جن کا ذکر کروں...... محلے برباد' گلیاں ناپید' ہر طرف وحشت کے آثار۔''

اور شعر میں اس نے اس سارے نقشہ کا خلاصہ اس طرح کیا ؎

اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

دلی کا پانی پہلے دکن کی سمت میں بہا تھا۔ اب کے بہہ کر لکھنؤ گیا۔ کیسا کیسا گوہر آبدار اس نگر سے نکل اس نگر چلا گیا۔ ایک بیچارے میر درد ہی اپنے تکئے پر بیٹھے رہ گئے' باقی تو ہر نامی گرامی شاعر نے اپنا ٹھیا چھوڑا اور لکھنؤ کی طرف نکل گیا۔ خود میر صاحب بھی اس خرابہ سے نکلے اور لکھنؤ جا کر اپنا تعارف یوں کرایا ؎

کیا بودوباش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے
ایسا اجڑا دیار جو بار بار اجڑا' بار بار ویران ہوا
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

نادر شاہ' احمد شاہ ابدالی' مرہٹے' جاٹ' روہیلے جس کی جب بن آئی اس نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ دھڑی دھڑی کر کے لوٹا۔ غریب کی جورو سب کی بھابی۔ دلی اب غریب کی جورو تھی۔ بادشاہ کا ہونا نہ ہونا برابر۔ وہ تیرے میرے رحم و کرم پر تھا۔ اپنی جان بچاتا یا دلی کی فکر کرتا۔ اور کونسا بادشاہ۔ کوئی ایک ٹک کر بیٹھا ہو تو اس کا نام لیا جائے۔ یاں تو اب بادشاہوں کی لین ڈوری لگی ہوئی تھی۔ آئے نہیں کہ اٹھائے گئے۔ اور کس کس عبرتناک طریقہ سے ان کی چھٹی کرائی گئی۔ باغی امیروں نے احمد شاہ کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر اسے اندھا کیا اور پھر بندی خانے میں ڈال دیا۔ پھر پتہ ہی نہ چلا کہ یہ بادشاہ سلامت کب دنیا سے رخصت ہوئے اور کہاں دفن ہوئے۔ ان کے بعد آئے عزیز الدین عالمگیر ثانی۔ عالمگیر ثانی کو باغی امیر غازی الدین نے ورغلایا کہ فیروز شاہ کے کوٹلہ میں ایک پہنچا ہوا فقیر آیا ہے۔ کیا صاحب کرامات ہے کہ مٹی کو ہاتھ لگا دے تو سونا ہو جائے۔ یہ بادشاہ مٹی کا مادھو۔ کیسے شاہی ادب آداب۔ محافظوں سے بے نیاز ورغلانے والوں کے ساتھ چل پڑا۔ وہاں پہنچا تو کسی فقیر کا نام و نشان نہ تھا۔ قاتل نے خنجر سے ہلاک کیا' گردن قلم کی اور لاش جمنا کی ریتی پہ تڑپنے کے لیے چھوڑ دی۔ یہ تھے شاہ عالمگیر ثانی۔ آگے چل کر شاہ عالم ثانی تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس کے ساتھ یہ گذری کہ ایک سردار غلام قادر رہیلہ جسے اس نے بہت منہ چڑھایا تھا اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور آنکھوں میں تکلے بھونک کر اندھا کر دیا۔ خدا خدا کر کے روہیلے سے نجات ملی تو مرہٹوں نے آن گھیرا۔ مرہٹوں کا زور ٹوٹا تو انگریزوں نے زور باندھا۔

1802ء میں لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر دلی پر قبضہ کیا۔ اور اب شہنشاہ شاہ عالم ایسٹ انڈیا کمپنی کے سایۂ عاطفت میں آ گئے۔ اس سائے میں رہ کر چار سال اطمینان سے گذارے اور پھر دلی اور سلطنت مغلیہ کو اس کے اپنے حال پر چھوڑ کر دنیا سے سدھارے۔ ان کے بعد ان کے فرزند دل بند اکبر شاہ ثانی تخت پر بیٹھے۔ مگر بقول مصنف واقعات دارالحکومت دہلی ''نام کے اکبر تھے۔ مگر یہ دراصل باپ سے بھی زیادہ جکڑ بند تھے۔ ان کے عہد میں انگریزوں کا غلبہ روز افزوں تھا۔''

انگریزوں کا غلبہ برحق۔ مگر روز روز کی دانتا کلکل سے تو نجات مل گئی۔ اب دلی میں امن و امان تھا۔ اور 'واقعات دارالحکومت دہلی' کے بیان کے مطابق ''قلعہ پر اختیار بدستور رہا۔ ادب آداب سلطنت میں کوئی فتور نہ آیا۔ بڑے بڑے راجہ نواب اس درگاہ کا حلقۂ ارادت کان میں ڈالے رہے اور یہاں سے عطائے خطاب کو فخر سمجھتے رہے۔ سکہ سب ریاستوں میں بادشاہ ہی کا جاری رہا۔ اور نذرانے اور تحفے تحائف
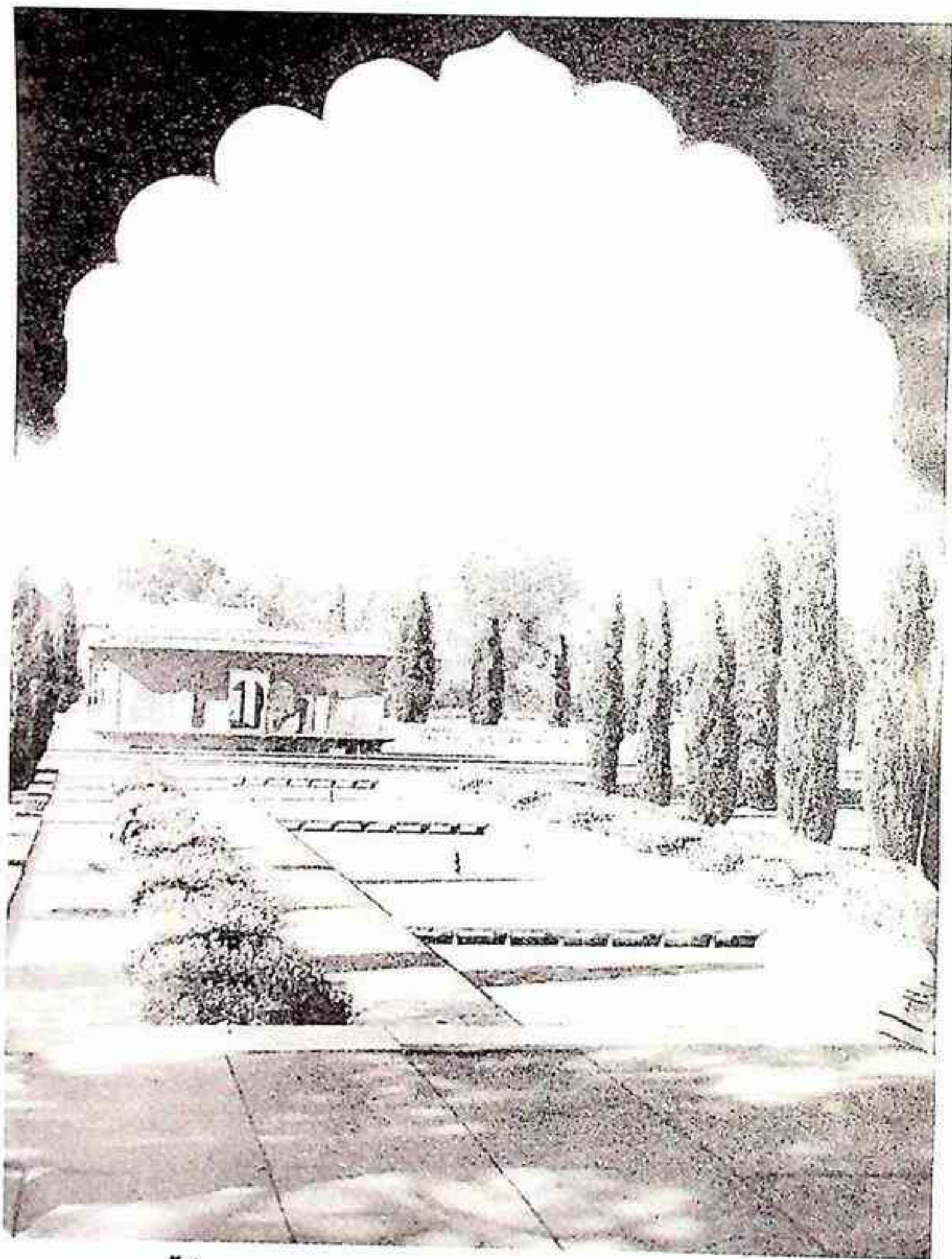
دہلی کے قلعہ کے مغلیہ چمن، جن کی داغ بیل شہنشاہ شاہجہان نے ڈلوائی تھی۔
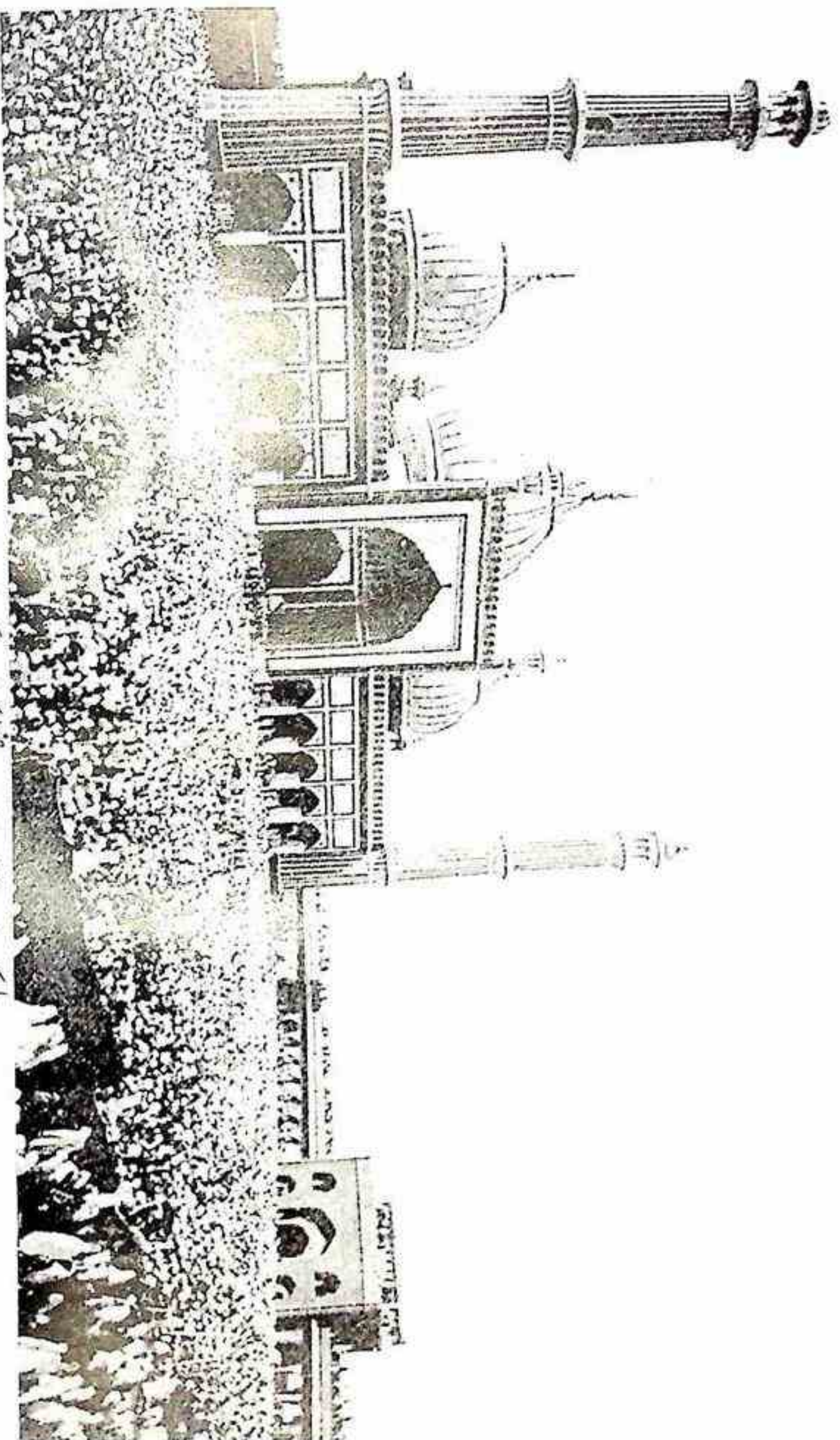
دہلی کی بڑی جامع مسجد میں عیدالاضحیٰ کی نماز، لوگوں کا بڑا ہجوم ہے۔

اور خراج بدستور پہنچتا رہا۔ گو عالمگیری شان و شوکت کے مقابلہ میں اب کچھ بھی نہ رہا تھا۔ اور نرا لفافہ ہی لفافہ تھا۔ مگر جو کچھ تھا بس غنیمت تھا۔"

بیشک یہ بہت غنیمت تھا۔ نادر شاہی، احمد شاہی، مرہٹہ گردی سب قیامتیں رفت گذشت ہوئیں۔ آگے جس قیامت کو آنا تھا وہ دور تھی۔ درمیانہ مدت میں دلی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اپنے بکھرے شیرازے کو اکٹھا کیا۔ اور کیا خوب اکٹھا کیا کہ دن عید رات شب برات۔ جینے کا حوصلہ کوئی دلی والوں سے سیکھے۔ اور ایک تہذیب آندھیوں طوفانوں کے بیچ میں کیسے اپنا تحفظ کرتی ہے اور کیسے زمانے کی ہر چال کو مات دے کر پروان چڑھتی ہے، یہ دیکھنا ہو تو انیسویں صدی کی دلی میں چلو اور دیکھو۔

سحر ہونے سے پہلے

پہریدارنی نے آواز دی، خبردار رہو۔ چوبداروں نے بآواز بلند جواب دیا، اللہ و رسول خبردار ہے۔ پھر چوبدار پکارا، کرو مجرا جہاں پناہ سلامت۔

کہار ہوادار لے کر حاضر ہوئے۔ بادشاہ سلامت سوار ہوئے۔ حقہ بردار حقہ لے کر تخت کے برابر آ گیا۔ حقے کا پیچ بادشاہ نے ہاتھ میں لیا۔

نقیب چوبدار سونے کے عصا ہاتھوں میں لیے آگے آگے پکارتے جاتے ہیں۔ بڑھے جاؤ صاحب، بڑھاؤ قدم کو جا بجا سے جہاں پناہ بادشاہ سلامت۔

سپاہیوں نے لال بانات کے انگرکھے پہن رکھے ہیں۔ سر پر کالی پگڑیاں، کندھوں پر بندوقیں جن پر لال بانات کے غلاف چڑھے ہیں، پشت پر ڈھال، کمر میں تلوار۔ آگے آگے گھوڑے، چاندی سونے کے ساز، کارچوبی کام کے مخمل کے نماشئے، سر پر کلغیاں، چھم چھم کرتے چلے جاتے ہیں۔ سقے چھڑکاؤ کرتے جاتے ہیں۔

دیوانِ خاص میں پہنچ کر تخت پر رونق افروز ہوئے۔ عدالت کا دربار آراستہ ہوا۔ امیر، وزیر، بخشی، ناظر، میر عدل، میر منشی، متصدی، محرر اپنے اپنے مقام پر دست بستہ اپنے اپنے محکموں کے کاغذات بغل میں دبائے مودب کھڑے ہیں۔ دادبیگی فریادیوں، دادخواہوں کی عرضیاں پیش کر رہا ہے۔ احکامات صادر ہو رہے ہیں، فرمان لکھے جا رہے ہیں۔

یہ تو روز مرہ ہوا۔ جشن کے موقع پر شاہانہ جلوس کی شان اس سے کہیں بڑھ کر ہوتی تھی۔ دہائیں دہائیں توپیں چلیں۔ بادشاہ کی سواری نکلی۔ سب سے پہلے نشان کے دو ہاتھی نمودار ہوئے۔ اس کے بعد چتر

کا ہاتھی۔ اوپر سونے کا کلس نیچے چاندی کا ڈنڈا۔ پھر ماہی مراتب کے ہاتھی آنا شروع ہوئے۔ ہاتھیوں کے بعد اونٹ۔ ایک اونٹ پر نقارہ دھرا ہے اور مسلسل بج رہا ہے۔ پھر سپاہیوں کی پلٹنیں آنی شروع ہوئیں۔ بادشاہی تلنگوں کی پلٹن، پچھیرا پلٹن، کالی پلٹن، اگری پلٹن، گھوڑے سجے بنے قطار اندر قطار۔ تخت، ایک سایہ دار ایک ہوادار۔ ہر ایک کی اپنی شان۔ روشن چوکی بجتی ہے۔ تمامی کی جھنڈیاں لہرا رہی ہیں۔ کڑکیت کڑکا کہہ رہے ہیں۔ ڈھلیت نام والے سپاہی ڈھال تلوار سے مسلح۔ خاص برداروں نے کاندھوں پر بندوقیں رکھی ہوئی ہیں۔ اور اب نیگڈمبر کا ہاتھی نمودار ہوتا ہے۔ اس پر بادشاہ سلامت سوار ہیں۔ ہیرے موتیوں میں غرق۔ ایک جریب پیچھے ملکۂ زمانی کی سواری۔ پھر شہزادوں کی عماریاں۔ پھر امیر، امرا، نوابوں، راجاؤں کی سواریاں۔ پھر سواروں کا رسالہ۔ پھر طبل کا ہاتھی۔ سب سے پیچھے بیلے کا ہاتھی۔ طبل بج رہا ہے۔ فقیروں کو بیلا بٹ رہا ہے۔ بازاروں میں یہاں سے وہاں تک خلقت کے ٹھٹ کے ٹھٹ ہیں۔ جھک جھک کر آداب مجرے کررہے ہیں۔ نقیب چوبدار پکارتے جاتے ہیں، آداب سے کرو مجرا۔ جہاں پناہ بادشاہ سلامت۔

یہ جلوس شہنشاہ شاہجہاں کا نہیں، حضرت اورنگ زیب عالمگیر کا نہیں۔ یہ تو اس آخری زمانے کا ہے جب سلطنت مغلیہ تتر بتر ہوچکی تھی اور دلی کی دولت لٹ چکی تھی۔ بادشاہ سلامت انگریزوں کے دست نگر تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے جو پنشن بندھ گئی تھی اسی پر گزارہ تھا۔ اقتدار اور اختیار کمپنی کا۔ بادشاہ نام کا۔ نام کی بادشاہت پر کمپنی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ جلوس نکالو، ہاتھی گھوڑوں پر چڑھ کر نکلو، جشن مناؤ، دربار لگاؤ، خلعتیں عطا کرو، کمپنی کو اس سے کیا۔ بلکہ فرنگی حکام دربار میں حاضر ہوں گے تو خود سارے شاہی آداب کو ملحوظ رکھیں گے۔

تو سلطنت اب کہاں رہ گئی تھی۔ مگر شاہانہ ادب آداب برقرار تھے۔ ذرا جو ان میں میں فرق آیا ہو۔ وہی آن بان، وہی دھوم دھام، وہی وقار و تمکنت۔ شاہانہ جلوس اسی طمطراق سے نکلے گا۔ دربار اسی شان سے منعقد ہوگا۔ ہاں اس فرق کے ساتھ کہ آگے وہ مغل طاقت وجلالت کا نقیب ہوتا تھا، اب مغلوں کی شاہانہ تہذیب کا امین تھا۔ مغلیہ سلطنت اب سلطنت نہیں تھی، ایک شاہانہ تہذیب تھی۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر نے اس تہذیب کی اسی طرح حفاظت کی اور اسی طرح اس میں چار چاند لگائے جس طرح جہانگیر اور شاہجہاں نے سلطنت کی حفاظت کی تھی اور اس میں چار چاند لگائے تھے۔ شاہانہ روایات سب برقرار رہیں۔ ان میں اگر کوئی اضافہ ہوا تو وہ شائستگی کا تھا۔ شہنشاہ اکبر ثانی کا زمانہ تھا۔ جمنا گھاٹ پر دو دھوبیوں میں مارکٹائی ہوگئی۔ دونوں نے انصاف کے لیے لال قلعہ کے در پر دستک دی۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا

''دھوبیوں سے کہو ہماری حکومت دریا پر نہیں ہے' قلعہ میں ہے۔ فرنگیوں کے پاس جاؤ۔ جمنا ان کے قبضہ میں ہے۔'' تو ان بادشاہوں کو خوب پتہ تھا کہ ان کی بادشاہت کیسی ہے اور اختیار کس کے پاس ہے۔ مگر پھر بھی کس شاہانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ دربار کرتے تھے اور کس وقار کے ساتھ فرمان جاری کرتے۔ اور دلی والے کس احترام کے ساتھ ان فرمانوں کو سر آنکھوں پر لیتے۔ بادشاہ سلامت کی جو حیثیت بھی رہ گئی ہو دلی والوں کے لیے وہ آج بھی جہاں پناہ تھے اور لال قلعہ قلعۂ معلیٰ تھا۔

مفتی صدرالدین صدرالصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ کمپنی سے معقول تنخواہ پاتے تھے' سمجھ لو کہ ہزار روپے سے اوپر۔ جہاں پناہ کے خزانے سے انہیں مفتی کے منصب کی تنخواہ دو روپے آٹھ آنے ماہانہ ملتی تھی۔ محبوب علی خاں خواجہ وزیر بنے تو انہوں نے یہ تنخواہ بند کر دی۔ مفتی صدرالدین نے اپنا مقدمہ بادشاہ کے حضور پیش کیا اور بادشاہ سلامت نے ان کی یہ تنخواہ بالآخر بحال کر دی۔ دلی کے فرنگی کمشنر نے مفتی صاحب سے کہا کہ مفتی صاحب ہماری سرکار سے آپ کو ہزار روپے سے اوپر تنخواہ ملتی ہے۔ آپ کو ڈھائی روپے کے لیے اتنی مقدمہ بازی کی کیا ضرورت تھی۔ مفتی صدرالدین نے جواب دیا ''کمشنر صاحب' یہ ڈھائی روپے تبرک ہیں۔ اس پر ہمیں فخر ہے۔''

اس اعتماد کے ساتھ کہ کم از کم جہان آباد کی خلقت انہیں جہاں پناہ جانتی ہے اور ظل اللہ تصور کرتی ہے۔ وہ وقار اور تمکنت کے ساتھ قلعہ میں بیٹھے تھے اور اجداد سے جو روایات ورثے میں ملی تھیں انہیں حسن و خوبی سے نبھا رہے تھے۔ ہاتھ تنگ رہتا تھا کہ کمپنی کی طرف سے بس پنشن بندھی ہوئی تھی' تھوڑے بہت نذر نذرانے۔ باقی اللہ کا نام تھا۔ مگر شاہانہ ہاتھ کھلا تھا۔ داد و دہش کا سلسلہ وضع قدیم کے مطابق جاری تھا۔ اس کے بغیر تو قلعہ کی تہذیب کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جشن کے موقع پر بادشاہ سلامت کو سونے چاندی میں تلنا ضرور تھا۔ اور پھر اس سونے چاندی کو غربا و مساکین میں تقسیم ہونا تھا۔ پھر درباریوں کو خلعتیں بھی بخشی ہوتی تھیں۔ اور جلوس کے ساتھ بیلے کے ہاتھی کا چلنا بھی لازم تھا۔ بیلہ کا ہاتھی جلوس کے ساتھ رواں دواں ہے اور غریب غربا میں خیرات تقسیم ہو رہی ہے۔ ادھر قلعے میں دیگیں کھنک رہی ہیں۔ رنگ رنگ کے کھانے خوانوں میں سجائے جا رہے ہیں۔ شہر میں تقسیم ہو رہے ہیں۔

رنگ رنگ کے کھانوں کی کیا پوچھتے ہو۔ مغلئی دسترخوان اب اتنا نہیں ہے جتنا ظہیرالدین بابر اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ تب سے اب تک اس دسترخوان پر اتنے ذائقوں کا اضافہ ہوا ہے کہ اس کی رنگا رنگی مغل تہذیب کی رنگا رنگی کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔ آخر کتنے کھانوں کے نام گنائے جائیں۔

محض ان کے نام گنانے کے لیے بھی منشی فیض الدین کا قلم چاہیے۔ اچھا چلو ان کے واسطے سے پلاؤ کی قابوں کی گنتی تو کر ہی لیں کہ پلاؤ تو مغلئی دسترخوان کی غذائے خاص ہے۔ ''یخنی پلاؤ' موتی پلاؤ' نور محلی پلاؤ' نکتی پلاؤ' کشمشی پلاؤ' نرگسی پلاؤ' زمردی پلاؤ' لال پلاؤ' مزعفر پلاؤ' فالسائی پلاؤ' آبی پلاؤ' سنہری پلاؤ' روپہلی پلاؤ' مرغ پلاؤ' بیضہ پلاؤ' اناناس پلاؤ' کوفتہ پلاؤ' بریانی پلاؤ' چلاؤ' سارے بکرے کا پلاؤ' بونٹ پلاؤ۔''

لگے ہاتھوں روٹی کی قسمیں بھی ان سے سنتے چلیے۔ ''چپاتیاں' پھلکے' پراٹھے' روغنی روٹی' بری روٹی' بیسنی روٹی' خمیری روٹی' نان' شیرمال' گاؤ دیدہ' گاؤ زبان' کلچہ' باقرخانی' غوصی روٹی' بادام کی روٹی' پستے کی روٹی' چاول کی روٹی' گاجر کی روٹی' مصری کی روٹی' نان پنبہ' نان گلزار' نان قماش' نان تنکی۔''

جب جشن ہوگا تو پھر تورے بندی کی رسم بھی ہوگی۔ اور یہ رسم دس دن چلے گی۔ یعنی دس دن تک کھانے رنگ رنگ کے پکیں گے اور سینیوں میں لگ کر تقسیم ہوں گے۔ ''بائیس خوانوں سے زیادہ' دو سے کم تورہ نہیں ہوتا۔ جیسی جس کی عزت ہے اتنی ہی خوانوں کا تورہ چوبدار گھر گھر بانٹتے پھرتے ہیں۔''

بادشاہ تخی' بادشاہ سے زیادہ بیگمات تخی۔ پیسہ ان کے لیے ہاتھ کا میل تھا' اشرفیاں ان کے حسابوں کوڑیاں تھیں۔ برسات آتی تو ننھی شہزادیوں کے لیے بیر بہوٹیاں خریدی جاتیں۔ ایک بیر بہوٹی ایک اشرفی کی۔ ایک شہزادی کی بیر بہوٹی مرگئی تو اس نے رورو کے آنکھیں سوجھالیں۔ بڑی بیگم نے یہ دیکھا تو فوراً خدمت گار کو ہدایت کی کہ بازار جاؤ اور دس بیر بہوٹیاں لے کر آؤ۔ خدمت گار نے دس اشرفیاں پائیں اور بازار کی طرف دوڑا۔ تھوڑی دیر بعد بیر بہوٹیاں لے کر واپس آیا مگر بتایا کہ آج بازار میں بیر بہوٹیوں کا بھاؤ دوگنا ہوگیا تھا۔ دس اشرفیاں قرض لیں۔ تب یہ بیر بہوٹیاں لایا ہوں۔ بڑی بیگم خوش ہوئیں کہ خدمت گار نمک حلال ہے۔ اشرفیوں کا منھ نہ کیا اور بیر بہوٹیاں لے کر آیا۔ مزید دس اشرفیاں عطا ہوئیں اور انعام کے گیارہ روپے ان پر مستزاد۔

ایک بی بیگم نے یہ طور پکڑا تھا کہ روز صبح کو بقچہ کھول کر سیر سوا سیر سونے کا گہنا نکالتیں۔ سنار کے لڑکے کے حوالے کرتیں اور فرماتیں کہ اس میں سے جڑے ہوئے نگینے نکالنے ہیں اور اس طرح کہ کسی نگینہ پر کھڑونچ نہ آئے۔ سنارزادہ دن بھر کی محنت کے بعد نگینے زیور سے الگ کر کے طشتری میں رکھ کر پیش کرتا۔ بیگم نگینے دیکھ کر مطمئن ہوتیں اور خادمہ سے کہتیں کہ ''اے گل چہرہ یہ نگینے جواہر خانے کے داروغہ کو سونپ دے۔'' پھر سنار

زادے سے مخاطب ہوتیں۔ "سنار والے یہ زیور لے جا۔ یہ تیری محنت کا حق ہے۔ کل صبح ہی پھر آ جانا۔"

ان بیگمات کی اپنی ایک دنیا تھی۔ بیگمات پہ کیا موقوف ہے' پورا لال قلعہ اپنی جگہ ایک دنیا تھا۔ دلی شہر کے بیچوں بیچ یہ ایک ایسی دنیا تھی کہ دلی سے متصل بھی تھی اور دلی سے الگ تھلگ بھی تھی۔ کچھ طور طریقے کچھ رسمیں' کچھ ادب آداب ایسے تھے کہ لال قلعہ سے خاص تھے۔ کچھ کے متعلق یہ کہہ لو کہ وہی دلی کی تہذیب مگر جب اس میں شاہانہ آداب شامل ہو گئے تو وہ لال قلعہ کی تہذیب بن گئی۔ عید بقر عید' شب برات' آخری چہار شنبہ' محرم' پھر ہولی' دیوالی' دسہرہ یہ تیوہار تو سب ہی دلی والے مناتے تھے۔ لال قلعہ میں آ کر ان میں ایک شاہانہ شان پیدا ہو گئی۔ مگر نوروز کا تیوہار تو شاید شہنشاہ ہمایوں ایران سے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ ویسے تو یہ ایران کا اپنا موسمی تیوہار تھا۔ مگر جب ایران کی تہذیب اسلامی رنگ میں رنگی گئی تو اس کی چھوٹ نوروز پر بھی پڑی۔ عقیدہ یہ ٹھہرا کہ جس روز حضرت علی کی ولادت ہوئی تھی وہ نوروز تھا اور جس روز خلافت ملی وہ بھی نوروز کا دن تھا۔ اور ایران میں یہ تیوہار جیسے بھی منایا جاتا ہو لال قلعہ میں یہ اپنے رنگ سے منایا جاتا تھا۔

نجوم کے حساب سے جس برس نوروز کا جو رنگ قرار دیا گیا لال قلعہ اس مبارک دن اسی رنگ میں رنگا گیا۔ اسے نوروزی رنگ کہئے۔ بادشاہ سلامت نوروزی پوشاک پہن کر برآمد ہوئے۔ دیکھا کہ پورا دربار اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ شہزادے' امیر امرا' نوابین سب نے نوروزی رنگ کی پوشاکیں پہن رکھی ہیں۔ جب دسترخوان چنا گیا تو وہ بھی نوروزی رنگ کا۔ اس دسترخوان پر سات طرح کے پلاؤ' سات طرح کی مٹھائیاں' سات طرح کے پھل اور سات طرح کی ترکاریوں سے پکا ہوا سالن۔ ساتھ میں جو کی روٹی' ساگ کی بھجیا اور ستو۔ یہ ہوا حضرت علی کا دسترخوان۔ بادشاہ سلامت نے حضرت علی کی نیاز دی۔ پہلے آپ ذرا سا چکھا۔ پھر شہزادوں اور امیر امرا کو بطور تبرک عطا کیا۔ سب نے مجرا کر کے تبرک لیا اور چکھا۔ پھر زنانہ کی باری آئی۔ اب دیوان خاص میں زنانہ کی رونق ہے۔ بیگمات اور شہزادیوں نے تبرک لیا۔ جو بچا وہ قلعہ کی باقی خلقت میں تبرک کے طور پر بٹ گیا۔

نوروز کی اس رسم کے ساتھ کچھ شگون بھی وابستہ ہو گئے۔ پنکھا جھلنے کا شگون۔ سونا چاندی اچھالنے کا شگون۔ اور لیجیے آخر میں وہ کھیل جو نوروز سے خاص چلا آتا ہے۔ انڈے لڑانے کا کھیل۔ اس کھیل پر نوروز کا جشن تمام ہوا۔

آخری چہار شنبہ آیا۔ صبح ہی صبح دربار آراستہ ہوا۔ سونے چاندی کے چھلے کشتی میں لگا کر لائے گئے۔ دو سونے کے دو چاندی کے بادشاہ نے آپ پہنے۔ دو ولیعہد کو پہنائے۔ ایک ایک شہزادوں کو۔ باقی امیر امرا کو۔

اسی تقریب سے ایک رسم اور دیکھیے ایک ٹھلیا میں تھوڑا پانی ڈالا۔ پھر ایک اشرفی کپڑے میں لپیٹ کر اس میں ڈالی۔ بادشاہ کے سر پر گردش دے کر صدقے واری کر کے اسے پھینک دیا۔ ٹھلیا ٹوٹ گئی۔ اشرفی حلال خوری نے اچک لی۔ تھوڑا سا پھونس جلایا۔ بادشاہ نے اسے لانگا۔ اب ٹھلیوں کی تقسیم شروع ہوئی۔ ہر ٹھلیا میں کچھ روپے۔ پہلے بیگمات اور شہزادوں کو ملیں۔ پھر امرا کے گھر بھجوائی گئیں جسے ٹھلیا ملی اس نے کھڑے ہو کر اسے توڑا۔ ٹھلیا کی رقم حلال خوریوں کو ملی۔

بارہ وفات آئی۔ ربیع الاول کی پہلی کو موتی محل میں قوالی کی محفل ہوئی۔ بادشاہ نے شرکت کی۔ آخر میں الائچی دانے تقسیم ہوئے۔ مشائخوں اور ملنگوں کے لیے کھانا دانا۔ خالی ایک دن نہیں' بارہ دن تک۔ بارہ کو چراغاں ہوا۔ مٹھائی تقسیم ہوئی۔

گیارہویں شریف پر آتش بازی کی دھوم دھام ہوئی۔ دسترخوان بچھا۔ حضرت غوث الاعظم کی نیاز ہوئی۔ کھانا تقسیم ہوا۔

رمضان' عید' بقرعید' شب برات۔ یہ بڑے تیوہار ہوئے۔ اس حساب سے ان کی دھوم دھام ہوتی تھی۔ محرم آئے تو ساری دھوم دھام ختم۔ نہ دربار' نہ جشن' نہ گانا بجانا۔ کیسا دربار اور کہاں کا تخت طاؤس۔ اب تو بادشاہ فقیر بنے کھڑے ہیں۔ گلے میں سبز کفنی جھولی۔ جھولی میں الائچی دانے' سونف' خشخاش۔ چھٹی محرم پر ان کا حال دیکھیے۔ چاندی کے پنجے والے دو علم۔ ایک پر سبز پٹکا' دوسرے پر سرخ پٹکا۔ ایک ہاتھ میں سرخ پٹکے والا۔ دوسرے ہاتھ میں سبز پٹکے والا۔ کمر میں چاندی کی زنجیر پڑی ہوئی۔ دو سیدوں نے زنجیر پکڑ کر بادشاہ کو ڈھائی تین قدم تک کھینچا۔ پھر زنجیر گلے میں ڈال دی۔ آٹھویں محرم کو بادشاہ سلامت حضرت عباس کے سقے بنے۔ لال کھاردے کی ایک لنگی باندھ رکھی ہے۔ کندھے پر مشک ہے۔ مشک سے کوزوں میں بھر بھر شربت بچوں کو پلا رہے ہیں۔

عاشور کے دن موتی مسجد میں عاشورے کی نماز ادا کی۔ دیوان خاص میں دسترخوان بچھا۔ شیرمال کباب۔ ان کے ساتھ پودینہ ادرک مولیاں کتری ہوئیں۔ بادشاہ نے کھڑے ہو کر نیاز دی۔ حاضرین میں تبرک تقسیم ہوا۔

جامع مسجد سے تبرکات آئے۔ آنحضرت صلعم کا جبہ اور نعلین' حضرت علی کے ہاتھ کا لکھا کلام پاک' خاک شفا۔ زیارت کی۔ تبرکات باجے گاجے کے ساتھ آئے تھے۔ باجے گاجے کے ساتھ واپس گئے۔

محل کی درگاہ میں گوٹا بٹ رہا ہے۔ تعزیے اٹھ رہے ہیں۔ مرثیے پڑھے جا رہے ہیں۔ ڈھول

تاشہ اور جھانجھ بج رہا ہے۔

یہ تو مسلمانوں کے تیج تیوہار ہوئے۔ اور ہندوؤں کے تیج تیوہار۔ قلعہ میں ان کی بھی دھوم دھام خوب ہوتی تھی۔ دسہرے کے دن دربار لگتا۔ پہلے نیل کنٹھ اڑایا جاتا۔ پھر باز خانے سے باز کو لایا جاتا۔ بادشاہ باز کو ہاتھ پر بٹھاتے۔ شام کو سجے بنے گھوڑے حضور شاہ لائے جاتے۔

دوالی کے دن بادشاہ سلامت سونے چاندی میں تلتے۔ پھر یہ سونا چاندی غریبوں محتاجوں میں تقسیم ہوتا۔ پھر ایک بھینسا' کالا کمبل' کڑوا تیل' ست نجا' ساتھ میں سونا چاندی بادشاہ پر سے صدقے اتارا جاتا۔ رات کو چراغاں ہوتا' نوبت بجتی۔

مگر ایک تیوہار نے قلعہ سے خصوصی نسبت حاصل کر لی تھی۔ یہ رکھشا بندھن کا تیوہار تھا۔ یا اسے سلونے کہہ لیجئے۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جب غازی الدین حیدر کی سازش سے چند مصاحب شاہ عالمگیر ثانی کو ایک صاحب کرامات فقیر سے ملاقات کا جھانسہ دے کر پرانے کوٹلہ لے گئے تو وہاں انہیں قتل کیا گیا۔ قاتل لاش جمنا کی ریتی پر پھینک چلتے بنے۔ ادھر سے کہیں ایک ہندنی گذری۔ اس نے لاش کو دیکھ کر پہچانا کہ یہ تو بادشاہ سلامت کی لاش ہے۔ وہ وہیں لاش کے سرہانے بیٹھ گئی اور پہرا دینے لگی۔ بادشاہ شاہ عالم اس ہندنی کے بہت مشکور ہوئے اور اسے اپنی بہن بنالیا۔ پھر شاہ عالم نے جیتے جی بھائیوں والا اس سے سلوک کیا۔ اور اس ہندنی نے بہن بن کر بہنوں والی ساری رسمیں نبھائیں۔ انہیں میں یہ بھی رسم تھی کہ سلونوں کے دن مٹھائیاں تھالوں میں لے کر قلعہ میں آتی اور شاہ عالم کے راکھی باندھتی۔ شاہ عالم اسے اشرفیاں دے کر رخصت کرتے۔

شاہ عالم کے بعد بھی آنے والوں نے اس رشتے کو نبھایا اور اس رسم کو یاد رکھا۔ سو سلونے قلعہ میں کچھ زیادہ ہی اہتمام سے منائے جاتے تھے۔

مگر یہ تو سارا مردانہ نقشہ تھا۔ قلعہ میں کیا سب بادشاہ' بادشاہزادے اور امیر امراہی تھے۔ بادشاہ زادیاں بھی تو ہوں گی۔ مقرر تھیں۔ بیگمات' کوئی بڑی بیگم کوئی چھوٹی بیگم۔ بادشاہ زادیاں' شہزادیاں' لڑکیاں بالیاں۔ پھر ان کی خادمائیں' چوبدارنیاں' قلماقنیاں' چولنیاں' حبشنیں' ترکنیں' باورچنیں۔ ان کے اپنے طور طریقے' اپنے ادب آداب' اپنے عقائد' اپنے توہمات' اپنی ریت رسمیں تھیں۔ اور انہیں سمجھنے کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ بیگمات کہاں کہاں سے ڈولی میں سوار ہو کر آئی تھیں۔ کوئی ایران سے' کوئی توران سے' کوئی راجپوتانہ سے۔ کوئی سنی' کوئی شیعہ' کوئی ہندنی۔ قلعہ میں آ کر ایسی گھلیں ملیں کہ ان کی اپنی

ایک مشترکہ نسوانی تہذیب وجود میں آ گئی۔ مگر پھر بھی پچھلے اثرات تو ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہی دیکھ لو کہ قلعہ میں بی بی کی صحنک کس عقیدت اور کس اہتمام سے ہوتی تھی۔ بی بی کون۔ حضرت فاطمہ زہرا۔ نیاز سات پردوں میں ہوتی تھی۔ وہاں مرد کے نام پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ کورے کورے کونڈوں میں خشکہ' اس پر دہی اور کھانڈ۔ دسترخوان پر کونڈے چنے گئے۔ ساتھ میں چوڑیوں کے جوڑے' مسی اور مہندی کی پڑیاں' لال کاغذ میں لپٹی ہوئیں' کلاوے سے بندھی ہوئیں۔ سات ترکاریاں' سوا سوا روپیہ چراغی کا۔ نیک پاک بیبیوں نے آ کر بی بی کی نیاز دی۔ ہر بی بی نے ایک چھنگلی میں مہندی لگائی' لال اوڑھنی اوڑھی۔ پھر دسترخوان پر بیٹھ کر چونے کی طشتری اٹھائی اور چونا کھانا شروع کر دیا۔ پارسا بیبیاں تھیں تب ہی تو ان کا منھ چونے سے نہیں پھٹا۔ پارسائی کے امتحان میں پوری اتریں۔ اب انہیں صحنک کھانے کا حق پہنچتا تھا۔ اور انہوں نے یہ حق کیا خوب ادا کیا کہ دم کے دم میں کونڈے صاف ہو گئے۔

لیجئے صحنک کھالی۔ اب ہر بی بی نے مسی ملی' عطر لگایا' چوڑیوں کا جوڑا اٹھایا' چراغی کے روپے لیے اور رخصت ہوئی۔

اصل میں قلعہ میں نذر نیاز کا بہت چرچا رہتا تھا۔ رہنا ہی تھا۔ بیگمات منتیں بہت مانتی تھیں۔ صوفیوں' مجذوبوں' درویشوں سے عقیدت رکھتی تھیں۔ درگاہوں میں جا کر چلے کھینچتی تھیں' دعائیں کرتی تھیں' منتیں مانتی تھیں۔ اور یہ اب کی بات نہیں تھی۔ پچھلی نسلوں سے ان کا یہ طور چلا آ رہا تھا۔ محمد شاہ رنگیلے کی والدہ ماجدہ قدسیہ بیگم کو بہت چاؤ تھا کہ ان کا لاڈلا تخت پہ بیٹھے اور مغل شہنشاہ بن کر راج کرے۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب ابھی محمد شاہ خیر سے گودی میں چڑھے چڑھے پھرتے تھے اور روشن اختر کہلاتے تھے۔

حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ سے ایک رسم نوراتہ کے نام سے وابستہ چلی آتی ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ جو مراد والی یا مراد والا آپ کے مزار کے سامنے رتجگہ کر کے نوراتیں گذارے اس کی مراد مقرر بر آئے گی۔ قدسیہ بیگم نے نوراتہ کی ٹھان لی۔ درگاہ کے صحن میں ایک خیمہ نصب ہوا۔ وہاں اس بیگم نے قیام کیا۔ روز رات کو حضرت کی چوکھٹ سے لگ کر بیٹھ جاتیں اور آنکھوں میں رات کاٹتیں۔ نویں رات کیا ہوا کہ روشن اختر نے ماں کی گود میں سوتے سوتے بڑبڑا کر آنکھ کھولی "اماں حضرت' ہم نے ایک خواب دیکھا ہے۔"

"جانِ من' قربانت شوم' کیا خواب دیکھا۔"

"ہم نے دیکھا کہ محبوب الٰہی کی دہلیز پر ایک تل پڑا ہے۔ وہ تل ہم نے اٹھا کر کھا لیا۔ بہت مزیدار تھا اور بہت خوشبودار۔"

''عمر دراز مبارک ہو۔ ہندوستان کی تل بھر سلطنت جو بھی بچی کھچی ہے وہ حضرت نے تمہیں بخش دی۔''
مرزا جہانگیر بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے نور نظر تھے۔ اپنی شہزادگی کی ٹر میں فرنگی افسر اعلیٰ سے تو تڑاخ کر بیٹھے۔ نظر بند ہوئے اور شہر بدر ہو کر الہ آباد پہنچ گئے۔ ان کی والدہ ممتاز محل نے منت مانی کہ میرا لاڈلا خیریت سے واپس آ جائے تو حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مزار پر پھولوں کا چھپر کھٹ اور غلاف چڑھاؤں گی۔ لو مرزا جہانگیر تو واقعی چھوٹ کر واپس گھر آ گئے۔ نواب ممتاز محل نے منت کیا خوب پوری کی کہ پھولوں کا چھپر کھٹ تیار کرایا۔ اس پر پھولوں کا غلاف۔ چھپر کھٹ تیار کرنے والوں نے اپنی طرف سے یہ اضافہ کیا کہ پھولوں کا ایک پنکھا بھی تیار کر کے چھپر کھٹ پہ لٹکا دیا۔ خوشی میں بہت خلقت جمع ہوگئی۔ خوب کھانا دانا ہوا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر فرمان جاری کیا کہ ہر برس ساون کے مہینے میں یہ میلہ ہوا کرے۔

اس میلہ نے پھول والوں کی سیر کا نام پا کر قبول عام کا شرف حاصل کیا۔

یہ بیبیاں شگن اور بد شگنیوں کی بھی بہت قایل تھیں۔ اور ایک بدشگنی تو ان کے حساب سے ایسی ہوئی کہ سلطنت ہی کی طرف سے وسوسے پیدا ہو گئے تھے۔ بدشگنی بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے وقت ہوئی۔ اکبر شاہ ثانی رات کے دو بجے اس دنیا سے سدھارے۔ بہادر شاہ ظفر کہ ولی عہد تھے انتظار میں تھے کہ بادشاہ کا دم نکلے اور وہ تخت پر بیٹھیں۔ جب خبر ملی کہ بادشاہ سلامت سدھار گئے تو انہوں نے جھٹ پٹ شاہانہ لباس زیب تن کیا اور تخت پر بیٹھنے کے لیے تیار ہوئے۔ نجومیوں نے مودبانہ گذارش کی کہ اندھیرے میں تخت نشینی مبارک ثابت نہیں ہوتی۔ بہادر شاہ ظفر بادشاہ بننے کے لیے کچھ زیادہ ہی بے چین تھے۔ انہوں نے اپنی طرف سے اندھیرے کا توڑ شمعوں اور مشعلوں سے کیا۔ اسی روشنی میں وہ تخت پر بیٹھے۔

نجومیوں کے ہونٹوں سے نکلی کوٹھوں چڑھی۔ ہوتے ہوتے بات بیگمات تک پہنچی۔ ان کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ تو بدشگنی ہوگئی۔ ان کے دلوں میں کیسے کیسے وسوسے پیدا ہوئے۔ اور جب برس کے اندر اندر کال پڑا اور ایک بھوکوں کے ہجوم نے اناج کی بوریوں سے لدی ناووں کو لوٹ لیا تو ان کے حسابوں ان کے وسوسوں پر تصدیق کی مہر لگ گئی۔

روزے نماز کا بھی ان بیبیوں میں بہت چرچا تھا' خاص طور پر روزوں کا۔ جو روزہ نہ رکھتی اس پر انگلیاں اٹھتیں۔ آوازے کسے جاتے۔ روزے خور' خدا کا چور۔ ہاتھ میں بیڑا' منہ میں کیڑا۔ روزے خوروں پہ کیا تباہی ہے' ٹوٹی جوتی پھٹی رزائی ہے۔

بیگمات اور شہزادیاں باقی دنوں میں تو اچولہا کرتی ہوں یا نہ کرتی ہوں رمضان کے دنوں میں ادبدا

کر کرتی تھیں۔ دن ڈھلے تندور پہ بیٹھ کر رنگ رنگ کی روٹیاں لگاتیں۔ چولہوں پر ہانڈیاں کڑ ہائیاں چڑھاتیں اور من پسند افطاری تیار کرتیں۔

خیر روزہ نماز نذر نیاز اپنی جگہ کھیل کود ہنسی دلگی اپنی جگہ۔ یہ جو بی بی کی صحنک میں اتنی متین اور ثقہ بنی بیٹھی ہیں ذرا انہیں زنانہ باغ میں جا کر دیکھو۔ کیسی چھلانگیں لگاتی پھرتی ہیں اور حوض میں کیسی ڈبکیاں لگاتی ہیں۔ اور چھیڑ چھاڑ میں یہ پتہ ہی نہیں کہ چھوٹے کپڑے کتنے چھوٹے ہو گئے ہیں اور انگیا کہاں کہاں سے مسک گئی ہے۔ ہر شہزادی جامہ سے باہر نظر آتی۔

ضابطہ کی پابندی بہر حال یہاں بھی ہے۔ پھلوں سے لدے پھندے درختوں کو للچائی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ مگر مجال ہے کہ کسی پھل کو ہاتھ لگائیں۔ بادشاہ کے اشارے کی منتظر ہیں۔ ادھر سے اشارہ ہوا اور ادھر یہ درختوں پہ ٹوٹ پڑیں۔ ٹڈی دل جس تیزی سے کھیتوں کو چاٹتا ہے اس سے بڑھ کر شہزادیوں کے دل کے دل درختوں پہ ٹوٹتے پھلوں کو لوٹتے کھسوٹتے نظر آئیں گے۔

رات ہوئی۔ چاندنی چٹکی۔ شہزادیوں کے شغل چاندنی رات کے حساب سے اور ہوئے۔ آنکھ مچولی شروع ہو گئی۔ شہزادیوں کا یہ محبوب کھیل تھا۔ ادھر آنکھ مچولی ہو رہی ہے۔ ادھر شہزادیوں کی کوئی ٹولی نواڑے میں سوار حوض میں سیر کرتی پھر رہی ہے۔ جسے دیکھو لال جوڑے میں ملبوس۔ بالیوں میں بیلے موتیا کے پھول پروئے ہوئے' نواڑے میں سوار' چاندنی میں نہائی ہوئی۔ یہ شہزادیاں ہیں یا پریاں۔

باقی شوق اپنی جگہ' حقہ اور گلوری اپنی جگہ۔ لال قلعہ کی نسوانی تہذیب میں ان دونوں ہی کا بہت عمل دخل تھا۔ اور گلوری کی کوئی ایک قسم تھوڑا ہی تھی۔ سموسہ گلوری' قمی گلوری' تعویذی گلوری۔ پھر گلوریوں سے بڑھ کر ایک قسم تھی۔ بیڑا۔ ایک گانے والی کا شوق گلوری سے اتنا بڑھا کہ اس نسبت سے وہ ٹڑھ موئی خانم بن گئیں۔ جب دیکھو کلے میں گلوری دبی ہوئی کلے کی ایک سمت پھولی نظر آتی اور منہ ٹیڑھا لگتا۔ قلعہ والیوں نے انہیں ٹڑھ موئی خانم کہنا شروع کر دیا۔ بس پھر ان کا یہی نام ٹھہرا۔

اس نسوانی تہذیب کے اپنے ادب آداب تھے۔ اپنے طور طریقے' اپنا لہجہ۔ اور زبان۔ زبان وہی دلی کی بولی ٹھولی۔ مگر قلعۂ معلیٰ میں آ کر اسے شائستگی کے پر لگ گئے اور وہ اردو سے اردوئے معلیٰ بن گئی۔ منشی فیض الدین قلعہ میں پلے بڑھے' چھوٹے سے بڑے ہوئے۔ ان سے سنو یہ بیبیاں کیسی زبان بولتی تھیں۔

"اری گل بہار' نو بہار' سبزہ بہار' چنپا' چنبیلی' گل چمن' نرگس' مان کنور' انند کنور' چنچل کنور' مبارک قدم' نیک قدم' کدھر اڑ گئیں۔ اے لو وہ باغ میں کدکڑے لگاتی پھرتی ہیں۔ سکڈے مارتی پھرتی ہیں۔ بھلا

ری علامہ دہر، قطامہ، چڑیل، مال زادی، قحبہ بچی، سر مونڈی، ناک کاٹی۔ ایسی شتر بے مہار ہوگئیں۔ ایسا دیدے کا ڈر نکل گیا۔ سب کو ازار میں ڈال کر پہن لیا۔ کام کاج پر دیدہ ہی نہیں لگتا۔ ایک جائے پاؤں ہی نہیں ٹکتا۔ جلے پاؤں والی بلی کی طرح نچلی ہی نہیں بیٹھتیں۔ سارے باغ کے جالے لیتی پھرتی ہیں۔ میں لہو کے گھونٹ بیٹھی گھونٹ رہی ہوں۔ کیسے تکلے کے سے بل نکالتی ہوں۔ بوا تم بھی کیا نین متی ہو۔ ذرا ذرا سی بات پہ ٹسوئے بہاتی ہو۔ ایسی کیا انوکھی، اچرج، جان آدم، نعمت کی ماں کا کلیجہ، چیل کا موت، عنقا چیز تھی جو تم ایسی بلگ گئیں۔ چھوٹی بہن تھی، اگر اس نے لے لیا تو کیا ہوا۔ آؤ میں تمہیں اور منگا دوں گی۔ اچھی، دیکھتی ہو اس فتنی کو۔ کیا شیطان چڑھا ہے۔ کیسے دھئے مچار کھے ہیں، اپنا لہو پانی کیے ڈالتی ہے۔ کسی عنوان نہیں بہلتی۔ ارے کاکا، ارے فلاں قلی، جائیو، بیوی کے لیے یہ چیز لائیو۔ بیگم صاحب میں ابھی دیکھ کر آیا ہوں۔ کسی کی دکان پر نہیں ہے۔ ایسا کیا بازار میں اُوڑا پڑ گیا۔ یہ حرامی تکا، مادر بخطا، کام چور نوالہ حاضر، تو یہیں سے بیٹھا بھیگی بلی بتاتا ہے۔ ٹالم ٹولے کرتا ہے۔ یہ موا غارتی کہیں سے یہ موٹے موٹے چنگیر، موٹے کچکوندڑے اپنے نگلنے اور ٹھونسنے کو اٹھا لایا، یہ تم ہی بیٹھ کر تھورو۔ کھانے کو بسم اللہ، کام کو نعوذ باللہ۔ یہ ہمارے نمک کا اثر ہے۔ ان کی کیا خطا ہے۔ چلو اب تو نہ روٹھو، آؤ من جاؤ۔ غصے کو تھوک دو۔ بہت چوچلے نہ بگھارو۔ مجھے یہ نکتوڑے نہیں بھاتے۔ آپس میں بیرا کھیری، کٹم کٹا نہیں کرتے۔ ایک توے کی روٹی، کیا چھوٹی کیا موٹی۔ مجھے تو دونوں آنکھیں برابر ہیں۔ تم کیا جنت میں لے جاؤ گی۔ وہ کیا مجھے دوزخ دکھائے گی۔ چلو نہیں منتی تو نہ منو۔ جوتی کی نوک سے۔ تم روٹھے ہم چھوٹے۔"

وہی دلی کی بیبیوں کا روزمرہ ہے۔ لال قلعہ کی بیگمات نے اس میں کونسے ہیرے موتی ٹانک دیئے ہیں۔ فرق بس اتنا ہے کہ قلعہ میں شہر کی کچھ لڑکیاں بالیاں کسی تقریب سے آئی ہوئی تھیں۔ آپس میں باتیں کرتے ہوئے وہ ایک دوسرے کو بار بار تو کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ یہاں ایک ننھی شہزادی بھی موجود تھی۔ اس نے ان لڑکیوں کو سمجھایا کہ تو نہیں کہا کرتے۔ یہ بدتمیزی ہے۔ تم کہہ کر بات کرو۔ مگر لڑکیوں نے سنی ان سنی کی۔ تو کہہ کر ایک دوسرے کو مخاطب کرتی رہیں۔ ننھی شہزادی بہت بے مزہ ہوئی۔ دوا سے بولی

"دوا، مجھے یہاں سے لے چلو۔ یہ تو پکار مجھ سے نہیں سنی جاتی۔"

تو دلی کی زبان اور قلعہ کی زبان میں بس تو اور تم کا فرق تھا۔ بس یہی فرق دلی کی تہذیب اور قلعہ کی تہذیب میں تھا۔ باقی ایک توے کی روٹی، کیا چھوٹی کیا موٹی۔

بہادر شاہ ظفر، تخت نشینی کے بعد
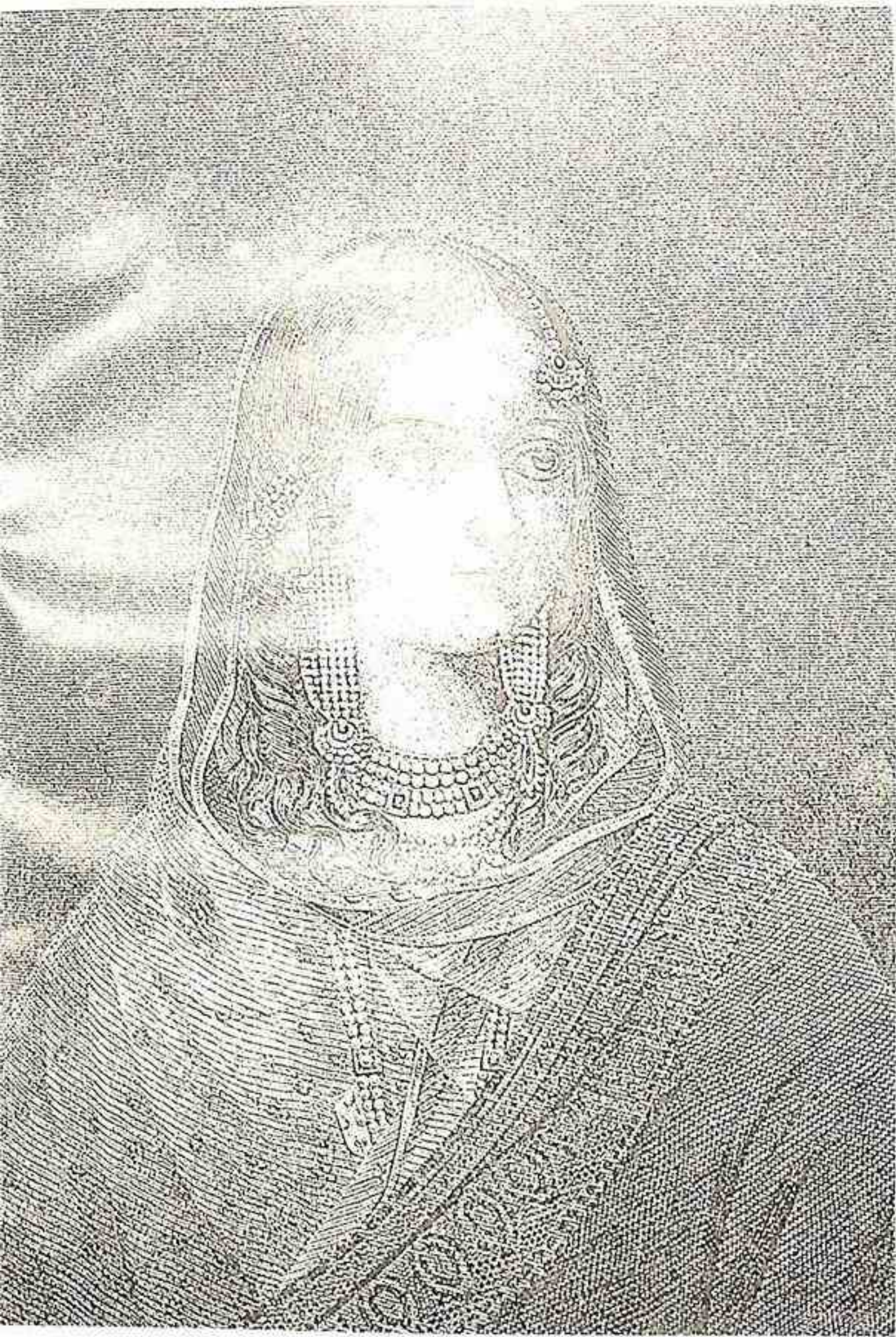
ملکہ زینت محل، عہد شباب میں

کوچہ و بازار

لال قلعہ ان دنوں لالوں لال تھا اور قلعۂ معلیٰ کہلاتا تھا۔ قلعۂ معلیٰ سے نیچے اترو اور باہر نکل کر دیکھو۔ ارد گرد کیا شہر شاد آباد ہے۔ بستی بستے بستے بستی ہے۔ جہاں آباد کو آباد ہونے میں چھ برس لگے۔ مگر یہ تو اسی وقت آباد ہونا شروع ہو گیا تھا جب نگر کی پہلی عمارت مٹیا محل کے نام سے وجود میں آئی تھی۔ اور یہ بات بہت معنی رکھتی ہے کہ لال قلعہ بعد میں تعمیر ہوا۔ پہلے مٹیا محل بن کر کھڑا ہو گیا۔ جہاں آباد کو لال قلعہ اور مٹیا محل کے گھال میل کا حاصل جانو۔ یہ گھال میل ہر مقام اور ہر سطح پر نظر آئے گا۔ تہذیبی سطح پر، رہن سہن کی سطح پر، کوچہ و بازار کی سطح پر۔ بلکہ بازاروں کا تو معاملہ ہی یہ تھا کہ خلقت امنڈی ہوئی ہے، کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ بنئے بقال، نجومی اور رمال، پھیری والے، پانی پلانے والے، صنعت گر، بازی گر سب اپنا اپنا کاروبار کرتے نظر آئیں گے۔ مگر کہیں عقب میں لال قلعہ بھی موجود نظر آئے گا۔ عقب میں کیا کم از کم وہ بڑے بازار جہاں خلقت زیادہ نظر آتی تھی لال قلعہ ہی کی دین تھے۔ چاندنی چوک، سعد اللہ خاں کا چوک، فیض بازار، خاص بازار، خانم کا بازار، اردو بازار، بڑے بازار تو یہی تھے اور یہ سب بازار لال قلعہ کے شہزادوں، شہزادیوں، امیروں، وزیروں کے فیض سے وجود میں آئے تھے۔

چاندنی چوک کیا خوب بازار تھا۔ شاعر نے اس بازار میں کیا دیکھا کہ بس فدا ہو گیا ؎

دل مرا جلوۂ عارض نے بہلنے نہ دیا
چاندنی چوک سے زخمی کو نکلنے نہ دیا

اس بازار کا ذرا نقشہ دیکھو۔ بیچوں بیچ نہر بہتی ہے۔ دو رویہ گھنے سایہ دار درخت، آم، جامن، گولر، مولسری، نیم، پیپل، برگد۔ ان کی چھاؤں میں رنگ رنگ کی سواری دوڑتی نظر آئے گی۔ پالکی، نالکی، رتھ۔

رتھوں کی کیا شان تھی۔ ان میں جتے بیلوں کے سینگوں پر سنہری سنگھوٹھیاں چڑھی ہوئیں۔ گلوں میں پیتل کی گھنٹیاں بجتی ہوئیں۔ وقتاً فوقتاً اس راہ سے شاہی سواری گذرتی۔ شاہی سواری کے ہاتھیوں کی کیا شان تھی۔ پشت پر سنہری ہودے سجے ہوئے' زربفت اور بانات کی جھولیں پڑی ہوئیں۔ گذرگاہ کے دائیں بائیں دکانیں قطار اندر قطار۔ مال و اسباب سے بھری ہوئی۔ ہزاری بزاری۔ ایک تو بزاریوں کی رنگ برنگی پوشاکیں۔ پھر دکانوں کے آگے بانسوں کے سہارے رنگ برنگے پردے لہراتے ہوئے۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ۔ پورا بازار رنگوں میں رنگا ہوا' پھولوں میں بسا ہوا۔ گل فروش پھولوں سے بھری ٹوکریاں لیے پھرتے ہیں۔ سقے لال کھاروے کی لنگیاں باندھے' مشکیں کاندھے پہ لادے کٹورا بجاتے دوڑتے پھرتے ہیں۔ بار بار صدا لگاتے ہیں' میاں آب حیات پلاؤں'۔

خریداری کا یہ عالم کہ دم کے دم میں سینکڑوں ہزاروں کا سودا ہوتا ہے۔ جس بزاری کو دیکھو وہ ہزاری نظر آئے گا۔ ایک لاڈلے میاں نے والدہ ماجدہ کے سامنے سوال ڈالا ''اماں بی' آج چاندنی چوک جانے کی نیت ہے۔''

اماں بی نے گولک سے ایک لاکھ کی رقم نکال کر حوالے کی اور کہا ''لختِ جگر' چاندنی چوک جگ جگ جاؤ۔ ایک لاکھ کی رقم سے وہاں سے کیا خرید پاؤ گے۔ مگر ہمارا ہاتھ ان دنوں تنگ ہے۔ فی الحال یہی کچھ ہے۔''

چاندنی چوک سے نکلو۔ فیض بازار کی طرف چلو۔ یہاں کا نقشہ بھی ویسا ہی راحت افزا ہے۔ درمیان میں نہر۔ کنارے کنارے دونوں طرف ہرے بھرے درخت۔ دورویہ دکانیں۔ ہر طرح ہر قسم کے مال و اسباب سے بھری ہوئیں۔ ایک اعتبار سے یہ بازار چاندنی چوک سے بڑھ کر تھا کہ یہاں دساور کا مال خصوصیت سے بکتا تھا۔ عراق سے' خراسان سے اور ان سے آگے یورپ کے شہروں سے ہر طرح کا مال یہاں پہنچتا تھا اور فروخت ہوتا تھا۔

خاص بازار میں درخت قطار اندر قطار اس کثرت سے تھے کہ وہ بازار سے بڑھ کر ایک باغ دکھائی پڑتا تھا۔

چوک سعد اللہ خاں کے طرف آیئے۔ مگر یہ سعد اللہ خاں کون تھے۔ پورا نام 'ملا سعد اللہ۔ لاہور کے رہنے والے تھے۔ شاہی ملازمت میں آ کر اتنی ترقی کی کہ وزیر اعظم بن گئے۔ شاہجہانی مسجد انہیں کی نگرانی میں تعمیر ہوئی تھی۔ ساتھ میں ایک بازار بھی بسا ڈالا۔ کیا خوب بازار تھا کہ دکانوں کے بیچ جا بجا منبر

بھی سجے نظر آتے تھے۔ ادھر بھاؤ تاؤ ہو رہا ہے ادھر وعظ ہو رہا ہے۔ برس کے برس اپنے اپنے وقت پر یہاں غازی میاں کی اور مدار صاحب کی چھڑیاں بھی کھڑی کی جاتی تھیں۔

جہاں آباد میں کپڑے کی صنعت زوروں پر تھی۔ سو ان بازاروں میں بزاز سب سے بڑھ کر مصروف نظر آتے تھے۔ کپڑا نفیس اور باریک' ایک سے بڑھ کر ایک۔

اور ایک مخلوق ہر بازار میں نظر آتی تھی۔ خلقت اس کی گرویدہ تھی۔ یہ تھی جوتشی اور نجومی نام کی مخلوق۔ جس نکڑ پہ دیکھو کوئی جوتشی کوئی نجومی کوئی رمال بساط بچھائے بیٹھا ہے۔ اور ایک مجمع خاص طور پر عورتیں برقعوں میں ملبوس اس کے گرد اکٹھی ہیں۔ پھر قہوہ خانے ہیں' قہوہ خانوں میں شعر و شاعری کا غلغلہ ہے۔

مگر سب بازار' سب کوچے' سب چوک ایک طرف اور چوک جامع مسجد ایک طرف۔ شاہجہان نے کیا خوب مسجد بنائی کہ وہ دلی کا دل بن گئی۔ ایسا دل جہاں مذہب اور کلچر گلے ملتے نظر آتے تھے۔ شہر کی مرکزی عبادت گاہ بھی یہی تھی اور شہر کا ثقافتی مرکز بھی یہی تھا۔ اندر نمازیوں کی صفیں اراستہ ہیں اور رکوع و سجود ہو رہے ہیں۔ باہر سیڑھیوں پر انڈے لڑائے جا رہے ہیں۔ داستان امیر حمزہ سنائی جا رہی ہے۔ کبوتر باز اور لال پدڑیوں کے رسیا اپنی اپنی پسند کے پرندے خرید رہے ہیں۔ چٹورے حلیم شریف اور کباب مزے لے لے کر کھا رہے ہیں۔ مگر مشاغل رنگا رنگ ہیں اور سیڑھیاں بہت ہیں۔ سو سیڑھیوں کے بیچ ان کی تقسیم ہو گئی ہے۔

مسجد کے تین دروازے ہیں اور ان کے حساب سے سیڑھیوں کے تین سلسلے ہیں اور ان کے روبرو اس زمانے میں تین بازار تھے۔ جنوبی دروازہ چتلی قبر کے بازار کی طرف کھلتا تھا۔ اس طرف تینتیس سیڑھیاں ہیں۔ دن ڈھلنے کے ساتھ ان سیڑھیوں پر چہل پہل شروع ہوتی تھی۔ کسی ایک سیڑھی پر بساطیوں نے اپنی بساط بچھا رکھی ہے۔ کسی دوسرے سیڑھی پر فالودے والے فالودہ بیچ رہے ہیں۔ کبابی سیخوں پر کباب سینک رہے ہیں۔ اگلی کسی سیڑھی پر مرغ والے اصیل مرغ کی بولی بول رہے ہیں۔ اصیل مرغ کے ساتھ رنگا رنگ پرندوں کو دکھا کر پرندوں کے رسیاؤں کو للچا رہے ہیں۔ ان سے رافطع نظر کرو تو برابر کی سیڑھی پر لڑکے بالے انڈے لڑاتے نظر آئیں گے۔

اب شمالی دروازے کی طرف آیئے۔ یہ دروازہ پائے والوں کے بازار کی طرف کھلتا تھا۔ اس طرف انتالیس سیڑھیاں ہیں۔ کبابی اس طرف بھی بیٹھے نظر آتے' مگر ان سیڑھیوں پر اصل قبضہ مداریوں

اور قصہ خوانوں کا تھا۔ دن ڈھلنے لگا ہے اور لیجیے ایک قصہ خواں نمودار ہوتے ہیں۔ مونڈھا بچھا کر بیٹھتے ہیں اور شروع کرتے ہیں داستان امیر حمزہ۔ مجمع ہے کہ ان کے گرد اکٹھا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر ایک قصہ خواں نے حاتم طائی کا قصہ شروع کر رکھا ہے اور اس سے ذرا ہٹ کر نچلی سیڑھی پر ایک قصہ خواں ''بوستان خیال'' کی داستان سنا رہے ہیں۔ ہر قصہ خواں کے گرد یاروں کا مجمع ہے۔ مگر قصہ خوانی کے سوا بھی یہاں کچھ ہو رہا ہے۔ ایک سیڑھی پر ایک مداری نے مجمع لگا رکھا ہے۔ بھان متی کا کھیل دکھاتا ہے۔ بوڑھے کو جوان اور جوان کو بوڑھا بنا کر دکھاتا ہے۔

اب شرقی دروازے کی طرف آ جائیے۔ وہ خاص بازار کی طرف کھلتا تھا۔ اس دروازے کے آگے پینتیس سیڑھیاں ہیں۔ یہ سیڑھیاں اپنے گذری بازار کے لیے مشہور تھیں اور محمد شاہ نے اس بازار کو کیا خوب خراج تحسین پیش کیا ؎

پیری میں نہ کس طرح کروں سیر جہاں کی
دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گذری کا

ادھر دن ڈھلا اور ادھر ان سیڑھیوں پر گذری کا بازار سجنا شروع ہوا۔ رنگوں کی بہار دیکھنی ہو تو ان سیڑھیوں پر جاؤ اور گذری میں رنگوں کی بہار دیکھو۔ بزاز رنگ رنگ کے کپڑے لیے بیٹھے ہیں۔ تھان الگ رکھے ہیں۔ الگنیوں پر پڑے الگ لہرا رہے ہیں۔ آس پاس پرندوں کے رسیا پنجروں میں رنگا رنگ پرندے لیے پھرتے ہیں۔ کیا خوب ان کے رنگ ہیں اور کیا سریلی ان کی بولیاں ہیں۔ کبوتر سے لے کر پدڑی تک اور پدڑی سے لے کر گھوڑے تک جو جانور پسند ہوا سے یہاں سے خرید لو۔

انہیں سیڑھیوں پر کہیں کوئی واعظ وعظ دیتا نظر آئے گا اور کوئی عطائی دوائیں بیچتا دکھائی دے گا۔ اور ہاں شعر و شاعری کے رسیا بھی یہاں محفل سجائے نظر آئیں گے۔ اور یہی تو وہ سیڑھیاں ہیں جہاں سرمد نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ ایک روایت یوں ہے جو خلیق احمد نظامی نے نقل کی ہے کہ ایک شام یہاں سرخوش، ناصر سرہندی اور بیدل بیٹھے شعر پڑھ رہے تھے۔ کہیں اس طرف سے سرمد کا گذر ہوا۔ وہ مرد مجذوب ان شاعروں کو شاعری کا شغل کرتے دیکھ کر ٹھٹکا۔ پھر یہ شعر پڑھا ؎

دیر است کہ افسانۂ منصور کہن شد
اکنوں سرنو جلوہ دہم دار و رسن را

اور آگے بڑھ گیا۔

اور ہاں یہی تو وہ سیڑھیاں ہیں جہاں کی بولی ٹھولی سے میر صاحب اپنی زبان کے لیے سند لیتے تھے۔

اب ذرا مسجد کے پچھواڑے کو بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ دال اناج کی دکانیں۔ ان دکانوں سے آگے چاوڑی بازار ہائیں یہ کیسا بازار ہے۔ صاحب یہاں دلوں کا سودا ہوتا ہے۔ اس بازار کو بازار حسن جانو۔

چاوڑی قاف ہے یا خلد بریں ہے راسخ
جمگھٹے حوروں کے پریوں کے پرے رہتے ہیں

شام ہو چلی ہے۔ چاوڑی میں بھیڑ بڑھتی جا رہی ہے۔ دلی کے سیلانی چھیل چھکنیا بنے قدم مارتے لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلے جا رہے ہیں۔ اماں کدھر کا رخ ہے۔ کوچہ قاتل چاوڑی کی طرف اور کہاں۔ چاوڑی میں قدم رکھا۔ دیکھا کہ یار البیلے گیلے پھرتے ہیں۔ سر پر ٹیڑھی ٹوپی، گلے میں یا پھر کلائی میں لپٹا ہوا بیلے موتیا کا گجرا عطر میں بسے ہوئے قدم زمین پر نظریں بالا خانے پر، کٹورا بجتا ہے، سقے لال کھاروے کی لنگیوں میں ملبوس دوڑتے پھرتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر حقہ پلانے والے متحرک ہیں۔

وہ بازار تو قلعہ کی بیگمات اور شہزادوں نے بسائے تھے۔ یہ بازار کس ستم ایجاد نے آراستہ کیا۔

ان بازاروں میں ایک مخلوق مستقل نظر آئے گی اور ایک آواز پیہم سنائی دے گی۔ لال کھاروے کا پٹکا کمر میں، مشک کاندھے پر، کٹورا ہاتھ میں، انگلیوں کے بیچ کٹورا مستقل بج رہا ہے اور آواز بار بار سنائی دے رہی ہے۔ میاں آب حیات پلاؤں۔ یہ سقہ ہے جو دوڑا دوڑا پھر رہا ہے۔ کٹورا بھر بھر پیاسوں کو پانی پلا رہا ہے۔

مگر یہ تو ایک آواز تھی۔ آوازیں ان بازاروں میں اور بھی سنائی دیں گی۔ لیلیٰ کی انگلیاں مجنوں کی پسلیاں، شرط ہے میٹھی ملائم ککڑیاں، قطب والوں کی کھرنیاں لو، جھرنے والی کھرنیاں لو اودے اودے فالسے، شربت بنالو۔ کالی بھونرا جامنیں ہیں۔ صورت اصل میں یہ تھی کہ دکاندار تو اپنی اپنی ٹھیک پر بیٹھے نظر آتے، مگر ایسے سودا بیچنے والے بھی تھے جو چل پھر کر سودا بیچتے اور ہر سودا بیچنے والا اپنے سودے کا اعلان بھی کرتا اور اعلان ایسا ویسا نہیں، سودے کی تعریف میں اچھی خاصی شاعری بگھارتا۔ یہ تھے پھیری والے۔ مگر بازاروں سے بڑھ کر گلیوں میں پھیرے لگاتے اونچی آوازوں میں بولیاں بولتے نظر آتے اور یہ پھیری والے تو شہر کے بسنے کے ساتھ ساتھ ہی گلیوں کوچوں میں نکل پڑے تھے۔ از خود نہیں بلکہ بادشاہ کی تحریک پر۔ شہنشاہ شاہجہاں کو شہر بساتے بساتے یہ احساس ہوا کہ بازار برحق، فیض بازار، چوک سعد اللہ، چاندنی چوک، سب اپنی اپنی جگہ خوب بازار ہیں۔ مگر گلی کوچوں میں جو مخلوق بس رہی ہے وہ کیا ہر وقت بازاروں میں کھڑی رہے گی۔

اور جو گھر والیاں ہیں وہ تو پردے دار بیبیاں ہیں۔ ان کی جو ضرورتیں ہیں وہ کیسے پوری ہوں گی۔ سو شاہی اعلان جاری ہوا کہ ہر قسم کے سودا بیچنے کا اہتمام اس طرح ہو کہ گلی کوچوں میں عورتیں ڈیوڑھی لانگھے بغیر خریداری کر لیا کریں۔ بس پھر کیا تھا۔ پھیری والے نکل پڑے۔ ہر قسم کا مال لے لے کر محلّہ محلّہ پہنچے اور صدائیں لگانے لگے۔

اس فضا میں ایک مغل سوداگر کشمیر سے سیب لے کر دلی پہنچا۔ مگر اس لمبے سفر میں سیب خراب ہو گئے۔ مغل سوداگر پریشان ہوا کہ ان سیبوں کو وہ کیسے ٹھکانے لگائے۔ مگر اچانک پھیری والوں کی بولیاں سن کر ایک ترکیب سوجھی۔ جو سیب سڑنے سے تھوڑا بچ گئے تھے، ان کی قاشیں تراش کر اس نے تھال میں سجائیں اور چاندنی چوک کی ایک پٹڑی پر بیٹھ کر آواز لگانی شروع کی۔

من قاش فروشِ دل صد پارهٔ خویش ام

ہونٹوں سے نکلی کوٹھوں چڑھی۔ یہ بولی چاندنی چوک سے نکل کر لال قلعہ کے دربار میں عجب انداز سے پہنچی۔ شاہجہان نے ایک مصرعہ کہا تھا

لختے برد از دل گذرو ہر کہ ز پیشم

ایک صاحب ذوق درباری نے مغل سوداگر کی بولی سنائی اور شعر مکمل کر دیا۔

لختے برد از دل گذرد ہر کہ ز پیشم
من قاش فروشِ دل صد پارهٔ خویشم

شاہجہاں اتنا خوش ہوا کہ مغل سوداگر کو دربار میں بلا کر اسے مالا مال کر دیا۔

خیر وہ تو شاہجہاں کا زمانہ تھا۔ ابھی تک فارسی کا سکہ چلتا تھا۔ مگر اب کوچوں بازاروں میں ٹکسالی اردو کا دور دورہ تھا۔ پھیری والے اب اس زبان میں رواں تھے۔ اور کیا خوب پھیری والے تھے کہ چیز کا نام نہیں لے رہے، دماغ سے کوئی تشبیہ اتارتے اور اس شان سے آواز لگاتے کہ سننے والوں کو بڑوں کو بچوں کو پتہ چل جاتا کہ پھیری والا کیا شے لے کر آیا ہے اور شوق میں اس کی طرف لپکتے وہ صدا لگاتا بلور کے ٹکڑے۔ اور سننے والے بوجھ لیتے کہ برف کے ٹکڑے بک رہے ہیں۔ وہ بولی بولتا 'ملائی کے لوٹے' اور چٹورے قلفی کا خیال کر کے ہونٹ چاٹنے لگتے۔ وہ آواز لگاتا 'الہ آباد کے بیڑے' اور یاروں کو پتہ چل جاتا کہ امرودوں کی تعریف ہو رہی ہے۔

پھر وہ پھیری والے بھی تھے جو تشبیہ استعارے سے بھی کام لیتے تھے مگر نام بھی بتا دیتے تھے۔

نرمل تلاؤ کے دودھیا

کیوڑے کی بیل کے بتاسے

کانٹوں سے ہریالے

شاہ جی کے تلاؤ کے

دودھیا سنگھاڑے لیلو

بن کڑھائی کا حلوہ شکر قندی

بالوشاہی گنڈیریاں، رسیلی گنڈیریاں کیوڑے والی۔ مگر تربوز والے نے قسم کھائی ہے کہ وہ تربوز کا نام نہیں لے گا۔

لال کا ڈلا لال کا ڈلا

لالوں میں آجا چھلکوں سمیت

قند کے ڈلے ہیں، رنگت کے گھڑے ہیں

دور سے آواز آ رہی ہے 'اودے اودے ہری چھتریوں والے ڈھکلیوں کے پالے۔'' پتہ چلا کہ بینگن کی تعریف ہو رہی ہے۔

سر پہ لال پگڑی، ہاتھ میں تھال، تھال میں چاندی کے ورق میں لپٹی گلوریاں سجی ہوئی۔ چوک میں کھڑا پکار پکار کر کہہ رہا ہے

کندن کو شرماتی ہے

جوبن کو چمکاتی ہے

اچھے منہ کو سہاتی ہے

گوری جب چباتی ہے

ہونٹوں آگ برساتی ہے

لیلو گوری کے لیے گلوری

دلدار کی اک شان ہے
یہ پان اس کی جان ہے
اور جان بھی اک پان ہے
لیلو میرے پان کی گلوری

بڑا بڑا پان ہے
لال لال شان ہے
بدخشاں کی دکان ہے
یہ پان ہے یہ پان ہے

ان آوازوں میں عجب جادو تھا۔ ادھر پھیری والے نے گلی میں قدم رکھا اور ادھر گھروں سے بچے بڑے نکلے اور لیجئے پھیری والے کے گرد خریداروں کا ہجوم ہو گیا۔ پھیری والوں کے پو بارے تھے۔ ایک تو دلی والوں کا ہاتھ کھلا تھا۔ اور پھر شوق خریداری۔ گھر میں بیشک ہر ڈال کا پھل رکھا ہو مگر پھیری والے کو خالی ہاتھ نہیں پھیرنا۔ یوں بھی وہ سستے کا سمے تھا۔ چیزیں کوڑیوں کے مول ملتی تھیں۔ گیہوں روپے من۔ گھی چار آنے سیر۔ گڑ شکر ٹکے سیر۔ نانبائی کو دو پیسے دو اور گھی کے تر بتر پراٹھے اور گوشت کا چٹپٹا سالن رکابی بھر لیلو۔ اور کھانے پینے کی چیزوں پر موقوف نہیں ہر قسم کا مال پھیری والے لاتے تھے۔ پردے دار بیبیاں ڈیوڑھی لانگھے بغیر دروازے کی اوٹ میں کھڑے کھڑے بیٹیوں کے لیے پورا پورا جہیز خرید لیتی تھیں۔ انہیں گھر میں بیٹھی بیبیوں کی سہولت کی خاطر تو شاہجہاں نے گلیوں کوچوں میں پھیری والوں کے پھیروں کی ریت ڈالی تھی۔

اور یہ گلیاں، یہ کوچے، یہ گھر کیسے تھے۔ ان میں رہنے والی شریف بیبیوں، شریف مردوں کا کیا طور تھا۔ گلیاں، کوچے، حویلیاں۔ کچھ امرا شرفا کے نام نامی سے منسوب، کچھ پیشہ وروں کے حوالے سے مشہور، جیسے محلہ چوڑی گران، کوچہ چرخے والا، کوچہ بتاشے والا، محلہ دھولی واڑا، کوچہ قابل عطار، کوچہ گھاسی رام، کوچہ پیپل مہادیو، ریوڑی والوں کا کٹرا، بزازوں کا کٹرا، کوچہ بلاقی بیگم، چھتہ شاہ جی۔ اور کیسی کیسی حویلی تعمیر ہوئی ہے۔ بخشی بھوانی شنکر کی حویلی، حکیم میاں جان کی حویلی، شیر افگن خاں کی حویلی، اعظم خاں کی حویلی،

حویلی سدا سکھ پنڈت۔

گلیوں میں مکانوں کی صورت یہ تھی کہ ایک کے ساتھ ایک بھڑا ہوا۔ ایک کی چھت دوسرے کے ساتھ پیوست۔ دوسرے کی چھت تیسرے کے ساتھ پیوست۔ اس سے پتنگ لوٹنے والے لونڈوں لپاڑیوں کو کتنی سہولت تھی۔ ادھر پتنگ کٹی ادھر یہ لونڈے لپاڑے کٹی پتنگ کا رخ دیکھ چھتوں پہ دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ ایک چھت سے دوسری چھت پر۔ دوسری سے تیسری پر۔ پھر پتنگ بچ کر کہاں جائے گی۔ بیبیوں کے لیے آسانی اس طرح پیدا ہوئی کہ ایک گھر کی کھڑکی دوسرے گھر میں کھلتی، دوسرے کی تیسرے میں۔ یوں پردہ دار بیبیاں ان کھڑکیوں سے ہوتی ہوئی گلی کے آخر تک کا چکر لگا لیتیں۔ یعنی پردے ہی پردے میں پورے محلّہ کی سیر کر لی۔

اور یہ گھر تھے کیسے۔ اونچا پھاٹک۔ اس کے بھاری کنواڑوں میں موٹی موٹی کیلیں جڑی ہوئیں۔ دونوں سمتوں میں چوکھٹ کے متصل دو پتھر کی چوکیاں بنی ہوئیں۔ دروازے کے اندر ڈیوڑھی۔ ڈیوڑھی سے گذر کر ایک وسیع کچا آنگن۔ آنگن کے وسط میں ایک حوض۔ اس میں فوارہ۔ اس کے اردگرد کچھ پھولوں کے گملے۔ ڈھائی تین درخت، کوئی انار کا، کوئی کگروندے کا۔ ہندو حویلی ہوئی تو اس میں ایک تلسی کے پودے کا اضافہ کر لیجیے۔ اس سے آگے بڑھیے۔ ایک لمبا دالان محرابوں والا۔ اس کے اندر ایک اور دالان۔ دالان کے دروں پر بھاری پردے پڑے ہوئے جو جاڑوں کی راتوں میں سردی سے اور گرمی کی دوپہروں میں دھوپ سے محفوظ رکھتے۔ دالانوں کے پہلوؤں میں دو طرفہ کوٹھے، کوٹھریاں۔ حوض ہی کے آس پاس تہہ خانے خس خانے۔ گرمیوں کی دوپہروں میں خس کی ٹٹیاں لگی ہیں۔ ان پر پانی چھڑکا جا رہا ہے۔ اندر فرشی پنکھے کا اہتمام ہے۔ پنکھے کی ہوا، خس کی مہک، ساتھ میں ٹھنڈک۔ اس نقشہ کو پھیلاؤ۔ وہ حویلی کا نقشہ ٹھہرے گا۔ اور حویلیاں اتنی بڑی بڑی کہ جب 1857ء کی قیامت میں ڈھائی گئیں تو وہاں پورے پورے محلے آباد ہو گئے۔ اس نقشہ کو تھوڑا سمیٹو وہ متوسط درجہ کے شریف آدمی کا گھر بن جائے گا۔ حویلی جیسے لال قلعہ بننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اور شریفوں کے گھر جیسے حویلی سے چشمک کر رہے ہوں۔

ہر حویلی ہر معقول گھر میں ایک زنانہ، ایک مردانہ۔ مردانے میں دیوان خانے کا ہونا ضروری تھا۔ جیسی جس گھر کی بساط ویسا اس کا دیوان خانہ۔ دیوان خانہ جن کی بساط سے باہر تھا انہوں نے ڈیوڑھی ہی سے دیوان خانے کا کام لینا شروع کر دیا۔

محلسراؤں اور حویلیوں کے زنانخانوں کو جانے دو۔ بھلے گھروں کا بھی زنان خانہ اپنی جگہ ایک

چھوٹی سی دنیا ہوتا تھا۔ شریف بیبیاں کم کم ہی اس سے باہر قدم نکالتی تھیں۔ شادی بیاہ ہی کی تقریب سے قدم باہر نکلتا تھا۔ ایسے موقعوں کے لیے ڈولیاں موجود تھیں۔ مگر ایسی بیبیاں بھی تو تھیں جنہوں نے جیتے جی ڈیوڑھی سے قدم ہی نہیں نکالا۔ دلہن بن کر ڈولے میں بیٹھ کر آئیں۔ پھر نکلیں تو عمر گذار کر تابوت ہی میں لیٹ کر نکلیں۔

اب ان گھروں کا تصور کیجیے جن کے زنان خانے بھی مختصر۔ مردانے بھی مختصر۔ اتنے مختصر کہ شام پڑے صاحب خانہ نے دروازے کے باہر گلی میں ایک مشک کا چھڑکاؤ کرایا' مونڈھے بچھائے' بیچ میں حقہ رکھا۔ ایک گل فروش صدا لگاتا گذرا "یہ کٹورے ہیں گجراتی موتیا کے۔ پھول لو جی چنبیلی کے' کنٹھے البیلی کے۔" گل فروش سے ایک گجرا خریدا اور حقے کی نے کے گرد لپیٹ دیا۔ لیجیے محفل مہک اٹھی۔ حقے کی نے گردش میں ہے۔ گڑگڑاہٹ کے ساتھ محفل گرم ہوتی جا رہی ہے۔

رسمیں ہی رسمیں، گیت ہی گیت

گھروں میں زنان خانے اور مردانے کا مطلب یہ تھا کہ جہاں آباد کی معاشرتی زندگی دو خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ عورتوں کی دنیا الگ، مردوں کی دنیا الگ۔ مردانہ شان یہ تھی کہ کھانا اگر زنان خانے میں کھایا تو کلی مردانے میں آ کر کی۔ اور نسوانی حیا اس میں تھی کہ نیک بی بی کی کھنکارنے کی بھی آواز مردانے میں سنائی نہ دے۔ ان اوقات میں بھی جب مردانے میں کوئی غیر مرد نہیں ہوتا تھا گھر کی کسی بی بی کا قدم اس طرف نہیں اٹھتا تھا۔ ہاں اگر محفل مشاعرہ گرم ہو یا ایسی ہی کوئی تقریب ہو تو چقوں کی درزوں میں سے ادھر جھانکا جا سکتا تھا۔

مردانے کی آبرو دیوان خانہ تھا۔ دیوان خانے کا کیا خوب نقشہ تھا۔ دیواروں پر جا بجا طغرے اور کتبے، اکا دکا ڈھال تلوار لٹکی ہوئی، خاندان کے بزرگوں کی قلمی تصویریں۔ چھت میں آویزاں جھاڑ فانوس۔ فرش پر دری، دری پر براق سی چاندنی، دائیں بائیں ایرانی قالین۔ دیواروں کے سہارے گول گول تکیے دھرے ہوئے، ان پر پھول دار غلاف چڑھے ہوئے۔ درمیان میں جا بجا حقے پیچوان رکھے ہوئے۔ اور یہاں وہاں کچھ پیک دان۔ چاندی کے ورقوں میں لپٹی گلوریوں سے سجی تھالی گردش میں ہے۔ طشتریوں میں الائچیاں مصری کی ڈلیاں۔ محفل گرم ہے۔ محفل کے نام یہاں کبھی شعر و شاعری ہوتی نظر آئے گی، کبھی باقاعدہ مشاعرہ، کبھی داستان گوئی کا اہتمام، کبھی محفل موسیقی یا مجرا۔ اور اگر یہ نہیں تو پھر شطرنج کی بساط بچھی نظر آئے گی۔ شطرنج نہیں تو چوسر۔ چوسر نہیں تو گنجفہ۔ حقے کی نے کبھی اس بزرگ کے سامنے کبھی اس بزرگ کے سامنے۔

زنان خانے میں آئیے۔ یہ دنیا رنگ رنگ تھی۔ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ کبھی نوحۂ

غم کبھی نغمہ، شادی۔ شادی غمی کا کھیل تو انسانی زندگی کے ساتھ چلتا ہی رہتا ہے۔ مگر جہاں آباد کی بیبیوں نے ریت رسموں سے شادی غمی کو کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ ہر خوشی کی تقریب اور ہر غمی رسموں کا ایک پورا سلسلہ اپنے جلو میں لے کر آتی تھی۔

خوشی کی تقریبوں کا ذکر ہو تو اس کردار کو مت بھولیے جسے ڈومنی کہتے ہیں۔ خوشی کی تقریبوں میں وہ پیش پیش نظر آئے گی۔ اِدھر دلہن مائیوں بیٹھی ادھر ڈومنیوں نے ڈھولک بیچ میں رکھ گانا شروع کیا۔

ناجوری گھونگھٹ کھول
گھونگھٹ میں تیرے چندر بست ہے
لال لگے انمول
ناجوری گھونگھٹ کھول

یہ تھی سہاگ گھوڑی۔ اور یہ ہے سہرا جسے ڈومنیاں نکاح کے بعد گائیں گی اور سہرے کا نیگ لیں گی۔

ہریالے ہمارے بنے کے لیے سہرا گوندھ لا موری مالنیا
بیلے چنبیلی کی کلیاں سہرا گوندھ لا موری مالنیا

ایک رسم' دوسری رسم' تیسری رسم۔ رسمیں ہیں کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہیں۔ اور ہر رسم سے وابستہ مخصوص گیت۔ ڈومنیوں کی بن آئی ہے۔ گائے چلی جا رہی ہیں۔ نقطہ عروج اس گیت کو جانیئے جو دلہن کی رخصت کے وقت گایا جاتا تھا اور جسے دلی کی زبان میں منڈھا کہا جاتا تھا۔

ہرے ہرے بانس کٹا مورے بابل
نیکا منڈھا چھوا ؤرے
دہلیاں پربت بھئیں
بابل انگنا بھیا بدلیس رے
لے بابل گھر اپنا
ہم چلے پیا کے دیس رے

لیجیے دلہن پالکی میں سوار ہو گئی۔ مٹھی بھر بھر دونیاں چونیاں اور چاندی کے پھول پالکی کے اوپر سے بکھیرے جانے لگے۔ اب جب یہ پالکی دولہا کی ڈیوڑھی پہ جا کے تھمے گی تب نئی رسموں کا سلسلہ شروع ہو گا' نئے گیت گائے جائیں گے۔

بنے مکھ دیکھ تری بنو ہے سہاگ بھری

تاروں بھینی رات رے‘ رہیو جیسے چندر کی کرن کھڑی

بیاہ ہو چکا۔ بہت اچھا ہوا۔ مگر رسموں کا سلسلہ تو بند نہیں ہوگا۔ اے لو خیر سے دلہن کا پاؤں بھاری ہو گیا۔ مبارک سلامت کا غل ہوا۔ اور پھر رسموں کا سلسلہ شروع۔ ساتواں مہینہ لگتے ہی میکے والے سدھوڑا لے کر دوڑتے۔ سدھوڑا یعنی سات چیزیں۔ سات طرح کی ترکاریاں‘ میوے‘ پکوان۔ نام بتارہا ہے کہ یہ رسم ہندو گھروں سے چلی اور مسلمان گھروں میں پہنچی۔ نواں مہینہ لگا تو پھر دلہن کے میکے نے جھرجھری لی۔ نوماسا لے کر چلے۔ یعنی دلہن کا جوڑا‘ کنگھی‘ مسی‘ عطر‘ پھول‘ چاندی کی نہرنی‘ تیل کی نقرئی پیالی‘ لال اوڑھنی۔ اس میں سات طرح کا میوہ‘ بہنوں کا نیگ‘ پنجیری کے لیے روپے۔

نوماسا ہو چکا۔ پیدائش کا وقت آ پہنچا۔ منتوں مرادوں اور دعاؤں کے ساتھ پیدائش ہوئی۔ دولہا کی بہن نے گیت گانا شروع کر دیا۔

بیرن بھیا میں تری ماں جائی

ہولرسن کر بدھاوا لے کر آئی

چھاتی دھلائی کٹوری لوں گی تو لٹ دھلائی رپیا

پانوں دھلن کو چیری لوں گی تو خصم چڑھن کو گھوڑا

اب اس کے بعد چھٹی تک زچہ کے اردگرد بیٹھ کر رات بھر جاگنا ہے۔ انگیٹھیوں میں کالا دانہ ڈالنا ہے تاکہ زچہ بدروحوں سے اور بچہ نظر بد سے محفوظ رہے۔ اور ساتھ میں جچا گیریاں گاتی ہیں۔

آج جنم لیا میرے راج دلارے نے پالنا بناؤں گی

گھی کھچڑی بابل جب رنگ سگھڑ جچا کو میں تارے دکھاؤں گی

ری پالنا بناؤں گی

ایک جچا گیری ختم ہوئی‘ دوسری شروع ہو گئی

البیلے نے مجھے درد دیا سانولیا نے مجھے درد دیا

پائیلیا نے درد دیا

جائے کہوٹر کے باوا سے اونچی نوبت دھراؤ رے

البیلے نے مجھے درد دیا پائیلیا نے مجھے درد دیا

جائے کھولڑ کے کے نانا سے رنگ بھری چھڑی لاؤ رے

البیلے نے مجھے درد دیا پائیلیا نے درد دیا

جائے کھولڑ کے کے ماموں سے ہنسلی کڑے گھڑاؤ رے

البیلے نے مجھے درد دیا پائیلیا نے درد دیا

جائے کھولڑ کے کی خالہ سے کرتے ٹوپی لاؤ رے

البیلے نے مجھے درد دیا پائیلیا نے درد دیا

جائے کھولڑ کے کے باوا سے بھانڈ نچاؤ رے

البیلے نے مجھے درد دیا پائیلیا نے درد دیا

البیلے نے......

چھٹی ہوئی۔ چھٹی کی رسمیں ہوئیں۔ مگر ایک رسم اور ہے جو شام پڑے ادا ہو گی۔ تارے دیکھنے کی رسم۔ شام ہوئی۔ دالان کے آگے چوکی بچھائی گئی۔ زچہ بناؤ سنگھار کے بعد بچہ کو گود میں لے کر برآمد ہوئی۔ دو عورتیں ننگی تلواریں لے کر دائیں بائیں چل رہی ہیں۔ دائی آٹے کی چومک لے کر آگے آگے چل رہی ہے۔ زچہ کی گود میں بچہ ہے، سر پر کلام پاک۔ اس شان سے آسمان کی طرف دیکھتی ہے اور چوکی پر کھڑے ہو کر سات ستارے گنتی ہے۔ دائیں بائیں کھڑی عورتیں تلوار سے تلوار کی نوک ملا کر زچہ کے سر پر قوس بناتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی جن کوئی پری اس بی بی کے اوپر سے نہیں گذر سکے گی۔

اب بچہ کے باوا زچہ کے شوہر نامدار تیر کمان لے کر برآمد ہوتے ہیں۔ زچہ کے پلنگ پر کھڑے ہو کر بسم اللہ پڑھی اور چھت کی طرف شست باندھ کر تیر چلایا۔ یعنی ہرن مار لیا

جچا جب دیکھنے کو آئی تارے

ستارے چرخ گردوں نے اتارے

ہوا فرزند یہ سب کو مبارک

کھولڑ کے کا باوا مرگ مارے

چھٹی کی دھوم جو پہنچی فلک تک

قمر اور مشتری دونوں پکارے

خدا نے کیا خوشی دونوں کو دی ہے

دمامے بج گئے' گونجے نقارے

اب رتجگہ شروع ہوتا ہے۔ کڑھائی رات بھر چڑھی رہے گی۔ گلگلے تلے جائیں گے۔ اللہ میاں کا رحم بنایا جائے گا یعنی چاولوں کے آٹے کا حلوہ۔ رحم پر اللہ میاں کی سلامتی پڑھی جائے گی۔ پھر بی بی فاطمہ کی نیاز یعنی صحنک۔

چھٹی کی دھوم دھام تمام ہوئی۔ مگر اس کے بعد بھی تو کتنے مراحل ہیں۔ دسویں کا غسل' بیسویں کا غسل۔ پھر چلہ یعنی چالیسویں دن کا غسل۔ اور بچہ کا جولاڈ پیار ہو رہا ہے۔ لوریاں دے کر سلایا جاتا ہے ؎

تو سو میرے بالے تو سو میرے بھولے جب تک بالی ہے نیند
پھر جو پڑے گا تو دنیا کے دھندے کیسا ہے جھولا کیسی ہے نیند
تو سو میرے بالے تو سو میرے بھولے جب تک بالی ہے نیند

آجاری نندیا آ کیوں نہ جا
میرے بالے کی آنکھوں میں گھل مل جا
آتی ہوں بیوی آتی ہوں
دو چار بالے کھلاتی ہوں

اور کس لاڈ سے کھلایا پلایا جارہا ہے ؎
میاں آوے دوروں سے' گھوڑا باندھوں کھجوروں سے
میاں آوے دوڑ کے' دشمن کی چھاتی توڑ کے
جگ جگ جگ جگ جیا کرو
دودھ ملیدہ پیا کرو

اور ابھی تو بچہ کے دانت نکلنے ہیں' پھر دودھ بڑھانے کی رسم ادا ہونی ہے' پھر ختنہ کا مرحلہ ہے' پھر عقیقہ' رسمیں' رسمیں' رسمیں رسمیں۔

بچہ بڑا ہوگا تو رسم بسم اللہ ہوگی۔ چاندی کی تختی یا لکیروں دار لال کاغذ پر پہلے بسم اللہ پھر اقرا باسم ربک الذی خلق لکھ کر بچے سے پڑھوایا جائے گا۔ اور ہاں جب مسیں بھیگنے لگیں گی تو مونچھوں کا کونڈا ہوگا۔

اس رسم میں لڑکے کی مونچھوں پر گھسا ہوا صندل روپے سے لگایا جائے گا۔ سوئیوں پر نیاز ہوگی۔ عورت مرد سب کھائیں گے۔ مگر لڑکی ہوئی تو بی بی کی صحنک ہوگی جسے صرف عورتیں کھائیں گی۔

مگر ابھی تو صرف مسیں بھیگی ہیں۔ آگے پوری زندگی پڑی ہے۔ مہد سے لے کر لحد تک رسموں کا کتنا لمبا سلسلہ ہے۔ آدمی کبھی سفر میں ہے کبھی حضر میں۔ رسم کوئی نہ کوئی ہر صورت میں۔ سفر پر نکلنے لگے تو گھر والوں نے قند میں رکھ کر امام ضامن کا روپیہ دائیں بازو پر باندھ دیا۔ دہی کا ٹیکہ ماتھے پر لگایا' پور بھر دہی چٹا دیا۔ گھر سے قدم باہر نکالا تو پیٹھ کو آئینہ دکھایا۔ مطلب یہ کہ جس طرح جاتے کی پیٹھ دیکھی ہے اسی طرح آتے کا منھ دیکھیں گے۔

سفر سے واپس آئے تو رشتے کنبے والوں کی طرف سے تیل ماش' صدقے کے ٹکے' جلیبیوں کے کونڈے آنے لگے۔ ایک خوان میں ماش' اس کے بیچ میں کڑوے تیل سے بھرا بادیہ رکھا ہوا اور خاصدان میں صدقے کے پیسے۔ سفر سے آنے والے نے تیل میں اپنا منھ دیکھا۔ پھر اُڑد کے دو چار دانے اس کے اندر ڈال دیئے۔ تیل حلال خوری کو گیا۔ ٹکے غریبوں میں تقسیم ہوئے۔ اس کے بعد دیدار پیر کا کونڈا۔ یہ دیدار پیر کون بزرگ ہیں۔ بس دلی کی عورتوں نے کسی ایسے پیر کا تصور باندھ رکھا تھا جو سفر پر جانے والوں کی صورت دوبارہ دکھاتا ہے۔

مگر ایک سفر وہ بھی تو ہے جس سے واپسی نہیں ہوتی۔ اس سفر یا کہہ لیجئے کہ سفر آخرت کی اپنی رسمیں اپنے توہمات تھے۔ آخری وقت میں زندگی کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے جاتے تھے۔ دعائیں تو خیر ہوتی ہی تھیں مگر کچھ ٹوہنے ٹوٹکے بھی تو ہوتے تھے۔ بکرے کی کلیجی صدقہ اتار کر اور سری کو سیندور لگا کر چوراہے میں رکھوا دیا۔ بیمار کے سرہانے پیسے رکھ کر بچوں میں تقسیم کر دیئے۔ صدقہ خیرات دعائیں منتیں' مگر آئے وقت کو کون ٹال سکتا ہے۔ جانے والا چلا گیا۔ اب پسماندگان رسمیں ادا کیے چلے جا رہے ہیں۔ کفن دفن سے سوئم تک اور سوئم سے چہلم تک۔ مگر سوئم کو اس تہذیب میں سوم کہاں کہتے تھے۔ تیجا یا پھول۔ اور چہلم چالیسواں۔

یہ رسمیں تو معاشرتی رسمیں ہوئیں۔ مگر اور قسم کی رسمیں بھی تو تھیں۔ مذہبی رسمیں' موسمی رسمیں۔ عید بقر عید شب برات سے وابستہ خوشی کی رسمیں۔ محرم اپنے جلو میں غم کی کتنی رسمیں لے کر آتا تھا۔ شب برات دلی والوں کے حساب سے مردوں کا تیوہار تھا۔ باوا آدم اور اماں حوا سے لے کر حضرت امیر حمزہ تک سب اولیا اللہ کی نیاز۔ اس کے بعد خاندان کے مرحومین کی فاتحہ۔ تخصیص کے ساتھ دو طرح کے

مردوں کی فاتحہ۔ اوتوں کی اور سہاگنوں کی۔ اوت وہ مردے جو بن بیاہے مر گئے۔ سہاگنیں جو بیاہ ہونے کے بعد اللہ کو پیاری ہوئیں۔

آمد شب برات بہو ساس سے لڑی
کوئی لیپے کوئی پوتے کوئی کمہار کے کھڑی
مٹکے اچھے دیجیو بھیا آویں گے مردے
چھوڑیں گے انار اور پھلجھڑی

چولہے لیپے پوتے جارہے ہیں۔ حلوہ پک رہا ہے۔ کورے انجورے اور ٹھلیاں چوکی پر سجائی جارہی ہیں۔ آتش بازی چھوڑی جارہی ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک وہم کہ آج کی رات جس شخص کو اپنا سایہ دکھائی نہیں دے گا وہ اگلی شب برات نہیں دیکھے گا۔

تیج تیوہار اپنی جگہ، جاڑے، گرمیاں، برسات اپنی جگہ۔ اور جہاں آباد میں آکر ہر موسم نے اپنی روایات اپنی رسمیں وضع کرلیں۔ بیبیوں نے گھروں کی چہار دیواری میں بیٹھ کر اپنی طرف سے ان میں کلی پھندنے ٹانک لیے۔ کیا خوب بیبیاں تھیں۔ پردے کی پابندی نے انہیں ڈیوڑھی لانگھنے سے باز رکھا تو انہوں نے گھروں کے اندر ہی اپنی ایک دنیا پیدا کرلی۔ موسموں تک کو اتنا گھریلو بنالیا جیسے ان موسموں نے گھروں کے اندر ہی ان بیبیوں کے ہاتھوں جنم لیا ہے۔ ساون کا چھینٹا پڑنے پر سیلانی قطب صاحب کی طرف دوڑتے۔ پردہ دار بیبیاں کیا کریں۔ انہوں نے گھروں ہی میں ساون بھادوں کی بہار پیدا کرلی۔ دوپٹے دھانی رنگے جارہے ہیں۔ بیلے چنبیلی کے ہار گوندھے جارہے ہیں۔ ادھر گھٹا گھر کر آئی ادھر بی اماں نے چولہے پہ کڑھائی چڑھا دی۔ پھلکیاں، گھنگھنیاں گلگلے، پوریاں، کچوریاں، غرض سو طرح کا پکوان تیار ہوگیا۔ جھولا تو گھر میں پہلے ہی پڑ گیا تھا۔ لڑکیاں بالیاں جھولے میں بیٹھ پینگیں لے رہی ہیں اور گارہی ہیں

ننھی ننھی بوندیاں رے ساون کا میرا جھولنا
اک جھولا ڈالا میں نے امبوا کی ڈار پر
لمبی لمبی پینگیں رے ساون کا میرا جھولنا
چھوٹی موٹی سُیاں رے ساون کا میرا جھولنا
اک جھولا ڈارا میں نے سیاں جی کے باغ میں
لمبی لمبی پینگیں رے، ساون کا میرا جھولنا

ادھر برابر کے گھر میں بھی جھولا حرکت میں ہے۔ آواز آ رہی ہے

برسے کاری بدریا
میری چُنریا بھیگی جائے
چُنریاں بھیگی جائے راما
لال رنگ کی اوڑھی چُنریا ہائے بھگو دی رے
میری چُنریا بھیگی جائے
پیاں پڑوں میں بانکے چھیلا
لیجو کنٹھ لگائے
چُنریا بھیگی جائے

اور کہیں برہ کا گیت گایا جا رہا ہے۔

رم جھم رم جھم چلیں پھواریں، گھر گھر گھر گھر بدرا چھائے
ہائے سکھی میں کس کو بتاؤں، مورے پیا اب لگ نہیں آئے
چھائے ری اندھیاری ہر سُو کوک رہی ہے کوئل کوکو
بول رہا ہے پپیہا پی ہو ہو، پیا بن مورا جیا گھبرائے
ناچ رہے ہیں تارے گگن میں، بیاکل ہے من مورا لگن میں
اپنے پیا کی راہ تکت ہوں، مورا پیا موہے ترسائے

اور خیر یہ تو امیر خسرو کی لکھی ساونی ہے۔ کتنی برساتیں بیت گئیں۔ یہ اسی طرح شاداب ہے

اماں میرو بابا کو بھیجوری کہ ساون آیا
بٹی تیرا بابا تو بڈھا ری کہ ساون آیا
اماں میرے بھیا کو بھیجوری کہ ساون آیا
بٹی تیرا بھیا تو بالاری کہ ساون آیا
اماں میرے ماموں کو بھیجوری کہ ساون آیا
بٹی تیرا ماموں تو بانکاری کہ ساون آیا

ایک آواز باہر گلی سے بھی آ رہی ہے۔ سرولی آ گئی ہے مہرولی کی۔ یہ پھیری والا ہے جو آم لے کر

آیا ہے۔ اس آواز کا اپنا جادو ہے۔ کونسی گھر والی ہوگی جو اس آواز پر لبیک نہیں کہے گی۔ سو آم بھی خریدے گئے۔ پکوان، آم، جھولا۔ ساون میں یہ کچھ میسر ہو تو پھر ساون سے بہتر اور کونسا موسم ہوگا۔ اے لو ایک آواز اور آئی۔ کالے بھونرالے نون والے نمکی لو۔ نون کے بتاشے، ساون بھادوں کی نمکی لو۔ یہ جامن بیچنے والے کی آواز تھی۔

مگر گھائل کرنے والی، برہ کی ٹیس پیدا کرنے والی آوازیں اور تھیں۔ پپیہا کی پی کہاں، کوئل کی کوکو، مور کی جھنکار۔ اور ہاں ان آوازوں کے بیچ ایک آواز ٹیٹری کی بھی تو تھی۔ اور یہ بات قلعہ کی بیگمات سے چلی اور دلی کی عورتوں تک پہنچی کہ ٹیٹری کے حلق میں چھید ہے۔ جب پانی پیتی ہے تو وہ باہر نکل جاتا ہے۔ تو اسے ٹیٹری کی آواز مت کہو، پکار کہو۔ پکارتی ہے ٹیٹری ہوں، پیاسی ہوں۔ اسی طرح پکارتے پکارتے مر جاتی ہے۔ اور کوئل کیا پکارتی ہے۔ یہ بیبیاں کہتی تھیں کہ کوئل آموں پر جان دیتی ہے۔ جب آموں کے پیڑوں پر مور آتا ہے اور کیریاں لگتی ہیں تو وہ بولنا شروع کرتی ہے۔ مگر جب آم پکنے لگتے ہیں تو ادھر اس کی باچھیں پک جاتی ہیں۔ بیچاری ترستی ہے اور آم نہیں کھا سکتی۔

ایک شہر پانچ ہنگامے

غالب نے دلی کی ہستی پانچ ہنگاموں پر منحصر بتائی تھی۔ ’’قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔‘‘

قلعہ کی گہما گہمی تو دیکھ لی۔ چاندنی چوک کی چہل پہل بھی ایک نظر دیکھی۔ رہ گئی سیر جمنا کے پل کی تو اس ندی کا احوال کیا پوچھتے ہو۔ اس کی لہروں کو دیکھ کر تو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جیسے ثقہ بزرگ بھی لہلوٹ ہو گئے تھے۔ کیا خوب اسے خراج تحسین پیش کیا

وَمَا هُو جُوْن جدی من تحتها فحکی

انهار خلد جلت فی اسفل الغرف

جمنا کا پانی اس (شہر) تلے بہتا ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جنت کی کھڑکیوں کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔

کب سے، کتنے جگوں سے یہ ندی اپنی چاندی ایسی لہروں کے ساتھ بہہ رہی ہے۔ کوئی تو اس میں جادو ہے کہ اس کے کنارے آباد ہونے والا یہ نگر کتنی مرتبہ خون میں نہایا اور اجڑ گیا۔ مگر خلقت نے ہر پھر کر یہیں پھر ڈیرے ڈالے اور نئے سرے سے پھر نگر بسا لیا۔ اس کے پانی کو پوتر جانا، گھاٹ بنائے اور پوجا پاٹ شروع کر دی۔ گھاٹ ایک سے بڑھ کر ایک۔ سب سے بڑھ کر نگمبو گھاٹ، سب سے پرانا گھاٹ تو یہی ہے۔ اس کے ڈانڈے تو مہابھارت سے ملتے ہیں۔ نہیں اس سے بھی پہلے ہندوؤں کے عقیدے کے حساب سے دواپر جگ کی ابتدا میں برہما جی پر ایسی بپتا پڑی کہ وہ سب بیدوں کو بھول گئے۔ بس اسی عالم میں وہ یہاں براجے۔ یہاں براجنا ایسا مبارک ہوا کہ انہیں سب بید یاد آ گئے۔ اسی سے نگمبو داس کا نام پڑا۔ نگم کا

مطلب ہے بیدیں۔ بو دیعنی بدھی یعنی عقل اور سمجھ۔ اور دوسری روایت یوں ہے کہ مہاراج یدھشٹر نے یہاں بہت بڑے پیمانے پر یگیہ کیا تھا۔ بس تب سے یہ گھاٹ آباد چلا آتا ہے۔ پری چہروں کا وہ ہجوم ہوتا ہے کہ بقول سرسید احمد خاں ''ان کے حسن کی خجالت سے آفتاب بھی زرد رنگ نکلتا ہے۔'' لیکن پورا نقشہ ظہیر دہلوی نے پیش کیا ہے۔ وہ نقشہ دیکھو پھر غالب کی بات سمجھ میں آئے گی۔

''یہ صبح کا سمے۔ نور کا تڑکا ہے۔ ہزاروں چاند کے ٹکڑے سیاروں کی طرح جگمگاتے چلے آتے ہیں۔ جس کو دیکھو آفت کا پرکالہ ہے۔ ایک سے ایک اعلیٰ ہے۔ سینکڑوں پرستان کی پریاں۔ سوتواں نقشے' چاند سے چہرے' چھریرے بدن' نازک اندام' گل فام' سروقامت' سیاہ پتلی سیاہ بال' ابھرے ابھرے ہوئے سینے' مرگ کیسی آنکھیں' چیتے کیسی کمریں' سر سے پاؤں تک سونے چاندی میں لدی پھندی چلی آتی ہیں۔ کامدانی اور تن زیب کے دوپٹوں میں سے کندن سی بدن کی رنگت پھوٹی پڑتی ہے۔ دریائے جمن میں نازنیناں گلبدن کے جمگھٹوں سے تختۂ چمن نظر آتا ہے۔ دریا میں دوسرا دریائے پرنور موجیں مار رہا ہے۔ چاند دریا کی موجوں میں جھکولے لے رہے ہیں۔...... ہزاروں آسمانِ خوبی کے سیارے مہین مہین ریشمی ساڑھیاں اوڑھے ہوئے کمر کمر پانی میں غوطے لگا رہی ہیں۔ اکثر شوخ کم سن الھڑ پنے کے دن' آپس میں چھینٹم چھینٹا ہو رہی ہے۔ کوئی پری پیکر جمنا کا اشنان کر کے کھڑے بالوں کو مڑوڑ کر نچوڑ رہی ہے۔ کوئی خشک ساڑھی باندھ کر گیلی ساڑھی کو مڑوڑی دے رہی ہے۔''

یہ تھا ناری اشنان کا نقشہ۔ اب ذرا نظریں یہاں سے ہٹائیے۔ گھاٹ پر ایک اور نقشہ نظر آئے گا۔

''ایک مہاراج موٹے تازے چوڑے چکلے ننگ دھڑنگ' ٹانگوں میں لنگوٹی' سر پر چوٹی' جٹا لٹکائے' توند پھیلائے آلتی پالتی مارے ہوئے براج رہے ہیں۔ ایک جانب مہادیو کی بٹیا دھری ہے۔ مقابل میں اس کے گوراپاربتی کی مورت رکھی ہے۔ اور سنگِ مرمر کا ایک نادیا بیل بیٹھا ہوا ہے۔ ایک کمل کے آسن پر کچھ پوجا پتری کا سامان سنکھ وغیرہ دھرا ہوا ہے۔ مہادیو پر کچھ دودھ کچھ پانی لنڈھا ہوا ہے۔ کچھ پھولوں کی پنکھڑیاں بکھری ہوئی ہیں۔ ایک جانب کوڑی پیسوں کا ڈھیر ہوتا جاتا ہے۔ اور ایک جانب اناج کا انبار ہے۔ نازنینانِ پری پیکر جو نہا دھو کر دریا سے نکلتی ہیں تو لباس پہن پہن کر پہلے آ کر مہادیو کے درشن کرتی ہیں اور مصر جی مہاراج کو پالاگن کہتی ہیں۔ مصر جی مہاراج ایک ہاتھ کے انگوٹھے سے پیشانی پر صندل کا ٹیکہ لگا دیتے ہیں اور ایک پنکھڑی تلسی کی منہ میں دے دیتے ہیں۔''

تو یہ تھا نگمبود کا گھاٹ جس کی یاد مصحفی کو رہ رہ کر ستاتی ہے

تختۂ آب چمن کیوں نہ نظر آئے سپاٹ
یاد آئے مجھے جس دم وہ نگمبود کا گھاٹ

وہ صبح کا سمے تھا اور نگمبود کا گھاٹ تھا۔ اب شام پڑ رہی ہے اور سیلانی جامع مسجد کے چوک کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ ادھر دھوپ ڈھلی اور ادھر سیلانیوں کے پیروں میں کھجلی شروع ہوئی۔ چھیلا بن کر گھر سے نکلے اور چلے تیر کے موافق جامع مسجد کے چوک کی سمت میں۔ چوک میں خلقت امنڈی ہوئی ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ کٹورا بجتا ہے۔ سقے مشکیں کاندھوں پہ دھرے دوڑتے پھرتے ہیں۔ میاں آبِ حیات پلاؤں۔ شہزادوں کے نام کی سبیل ہے۔ گہما گہمی چاندنی چوک میں بھی بہت تھی۔ مگر یہ گہما گہمی اور رنگ کی ہے۔ چاندنی چوک تو بازار ہوا۔ سب بازاروں سے بڑھ کر بازار۔ اس کی ساری رونق بازاری ہے۔ مگر چوک جامع مسجد شہر کا تہذیبی مرکز بن چکا ہے۔ کیا خوب مسجد ہے۔ اندر رکوع و سجود کی گہما گہمی۔ قد قامت الصلوۃ کا شور۔ باہر سیڑھیوں پر چھیلوں بانکوں کی پھڑیں جمی ہوئی ہیں۔ رنگا رنگ شربت، فالودہ، قلفی، سیخ کباب، حلیم، چٹوروں کے لیے یہاں ہر طرح کا ذائقہ موجود ہے۔ کبوتروں کے رسیا کبوتروں کا اور لال پدڑی کے شوقین لال پدڑی کا سودا کرتے نظر آتے ہیں۔ داستان گو نے داستان کی محفل سجا رکھی ہے۔ اس سے ہٹ کر شعر و شاعری کے رسیاؤں نے اپنی بزم آراستہ کر رکھی ہے۔ چکن کے انگرکھے پہنے عطر میں بسے بیٹھے ہیں۔ جو شعر اچھا پڑھا گیا اس پر پھڑک اٹھے اور شاعر پر داد کے ڈونگرے برسا دیئے۔

مگر خالی انگرکھے پر مت جائیے۔ پوری سج دھج دیکھئے۔ وہ کچھ اس رنگ سے تھی کہ بر میں انگرکھا، سر پہ ٹوپی کوئی چوگوشیہ، کوئی پنج گوشیہ، کوئی گول، مگر زیادہ تر دو پلڑی۔ ٹانگوں میں پاجامہ، کوئی ڈھیلا ایک برا، کوئی تنگ موری والا۔ اور نیک پاک بزرگ ہوئے تو ٹخنوں سے اونچا۔ یہ شرعی پاجامہ ہوا۔ مگر انگرکھا ہر بر میں ایک طرح کا۔ ہاں گھنڈی میں دائیں بائیں کا فرق نظر آئے گا۔ گھنڈی بائیں طرف ہو تو مسلمان، دائیں طرف ہو تو ہندو۔ مسلمان اور ہندو کی وضع قطع میں بس اتنا ہی فرق تھا۔ باقی سارے رنگ ڈھنگ، بول چال، لب و لہجہ ایک طرح کا۔

اصل میں دلی کا ہندو اب وہ ہندو نہیں رہا تھا جو رائے پتھورا کے زمانے میں تھا۔ مسلمان بھی وہ مسلمان نہیں رہا تھا جو شہاب الدین غوری کے لشکر کے ساتھ آیا تھا۔ تب سے اب تک پلوں کے نیچے سے پانی بہت بہہ گیا تھا۔ تلوار جتنی چلنی تھی اس وقت چل چکی۔ اس کے بعد تو تاریخ کی نہج ہی بدل گئی۔ قصہ مختصر دبی دبی آویزش۔ ساتھ میں بہت سی آمیزش۔ ارادتاً کم، غیر ارادی طور پر زیادہ۔ دونوں مذہب اپنی اپنی جگہ

پر، مگر تہذیبی سطح پر فاصلہ کم ہوتا چلا گیا، قرب پیدا ہوتا چلا گیا۔ مگر مذہبی سطح پر بھی وہ پہلی والی غیرت کہاں رہی۔ مسلمانوں کے مذہبی تیوہاروں میں دیسی رنگ کتنا آ گیا تھا۔ بلکہ پورا ہجری کیلنڈر ہی دیسی رنگ میں رنگا گیا۔ ربیع الاول، ربیع الثانی اب کون کہتا تھا۔ مولوی مُلّا ہی کہتے ہوں گے۔ دلی کی عام خلقت کے حساب سے ماہِ صفر اب تیرہ تیزی کا مہینہ تھا۔ ربیع الاول بارہ وفات کا مہینہ کہلایا۔ ربیع الثانی میراں جی کا مہینہ۔ جمادی الاول مدار کا مہینہ۔ ذیقعد خالی کا مہینہ۔ شعبان شبرات کا مہینہ۔

تو اس رنگ سے اس فضا میں رنگ گھل مل رہے تھے۔ اور مختلف تہذیبی طور ایک نئی وحدت میں ڈھل رہے تھے۔ موسمی تیوہاروں اور میلوں ٹھیلوں کے متعلق تو پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ یہ ہندوؤں کے ہیں یا مسلمانوں کے۔ باقی رہ گئے عید بقر عید اور ہولی دیوالی تو وہاں بھی اب یہ صورت تھی کہ ایک کی خوشی میں دوسرا شامل۔ اگر شامل نہ بھی ہو سکے تو ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام بہر حال کیا جائے گا۔ سو مسجد کے آگے باجا نہیں بجے گا۔ اور بقر عید پر قربانی اس انداز سے نہیں کی جائے گی کہ دوسروں کے جذبات مجروح ہوں اور فساد کی صورت پیدا ہو۔ ہولی کا رنگ مسلمان پہ پھینکا جائے گا تو وہ بھڑکے گا نہیں، خوشی سے کھل جائے گا۔

لیجئے شتر سوار جو چاند کی خبر لینے گیا تھا مبارک خیر لے کر واپس آ گیا ہے۔ اب یہ رات چاند رات ہے۔ توپیں دغنے لگیں۔ نوبت بجنے لگی۔ 29 کا چاند ہوا تو دلی والوں کے حساب سے یہ جوان عید ہوئی۔ 30 کا چاند ہوا تو بوڑھی عید کہلائے گی۔ بوڑھی ہو یا جوان عید بہر حال عید ہے۔ بوڑھے جوان بچے بڑے کوئی پالکی میں کوئی نالکی میں، کوئی تام جھام میں، کوئی رتھ میں۔ رخ سب کا عید گاہ کی طرف ہے۔ بادشاہ سلامت بھی ہاتھی پر سوار آن پہنچے۔ نماز پڑھی گئی۔ دھائیں دھائیں سلامی کی توپیں چلنے لگیں۔

یہ خوشی کا تیوہار تھا۔ آگے بقر عید آئے گی اور اپنے رنگ کی خوشی اپنے ساتھ لائے گی۔ اس سے آگے غم کا تیوہار ہے۔ کیا عوام کیا خواص سب گھروں میں سوگ کا سماں ہے۔ بچے امام کے فقیر بننے لگے ہیں، سبز کفنی، گلے میں ڈالی، جھولی میں الائچی دانے، سونف اور خشخاش بھری اور چلے اماباڑے کی طرف۔ پیاسوں کی نام کی سبیلیں لگنے لگیں۔ اس رسم میں ہندو پیش پیش ہیں۔ غم کی اس تقریب میں بادشاہ کی شرکت بھی لازمی ہے۔ چھٹی محرم کو ان کے ہاتھ میں دو مرصع ڈنڈے تھمائے جائیں گے، کمر میں چاندی کی زنجیر ڈالی جائے گی۔ دو سید زادے زنجیر پکڑ کر بادشاہ کو کھینچیں گے۔ پھر یہ زنجیر بادشاہ کے گلے میں ڈالی جائے گی۔ ساتویں کو شاہی جلوس قلعہ سے نکلے گا اور اماباڑے کی طرف چلے گا۔ آگے آگے شمعیں، مہندی اور

ملیدے کے خوان، تاشے باجے، روشن چوکیاں۔ پیچھے پیچھے بادشاہ سلامت، بیگمات۔ آٹھویں کی شب بادشاہ سلامت حضرت عباس کا سقہ بنیں گے۔ مشک کاندھے پہ لادکر بچوں کو بھر بھر کوزہ شربت پلائیں گے۔ عاشور کے دن قلعہ میں الگ رسمیں ہوں گی، شہر میں الگ تعزیئے اٹھیں گے۔ ہندوؤں کے جس محلہ جس کوچے سے گذریں گے وہاں سبیل لگی ہوگی، شربت سے تواضع ہوگی۔

محرم کا مہینہ ختم ہوا تو تیرہ تیزی کا مہینہ آ گیا۔ اپنے ساتھ آخری چہار شنبہ کی تقریبات لایا۔ اگلا مہینہ بارہ وفات کا۔ پہلی سے محفل میلاد کا سلسلہ شروع ہوا تو بارہویں تک چلا۔ بارہویں کی شب چراغاں ہوا۔ بادشاہ نے درگاہ میں حاضری دی۔ قوالیاں ہوئیں۔ مٹھائی تقسیم کی گئی۔ اس کے بعد میراں جی کا مہینہ۔ گیارہویں کی دھوم دھام ہوئی۔ بانس کی پھچیوں پر لال کاغذ منڈھ کر بنگلہ بنایا گیا۔ اسے مہندی کہتے تھے۔ رات کو اسے روشن کیا گیا اور نیاز کا اہتمام ہوا۔

مختصر یہ کہ ہر مہینہ کسی نہ کسی تیوہار کی خبر لے کر آتا تھا۔ ہر تیوہار کی اپنی رسمیں تھیں۔ اور ہر ایسے مبارک موقع پر بادشاہ کی شرکت بھی لازمی تھی۔ اور صرف مسلمانوں کے تیوہاروں کی تقاریب میں نہیں، ہندوؤں کے تیوہاروں میں بھی۔ سلونو کے تیوہار میں شرکت تو خیر اس حساب سے لازمی ہوگئی کہ رام جنی نام کی برہمنی نے جمنا کنارے عالمگیر ثانی کی لاش کو پہچان کر رات بھر اس کی نگہبانی کی تھی۔ شاہ عالم نے تخت پر بیٹھ کر اس احسان کا حق یوں ادا کیا کہ اسے اپنی بہن بنالیا۔ اور جب رام جنی بادشاہ کی بہن بن گئی تو سلونو کے دن بھائی کی کلائی میں راکھی باندھنا بھی لازم آیا۔ لیجئے سلونوں کے تیوہار نے قلعۂ معلیٰ میں راہ پالی۔

مگر دوسرے تیوہاروں میں بھی بادشاہ سلامت اسی گرمجوشی سے حصہ لیتے۔ ساتھ میں شہر کے جملہ مسلمان بھی۔ دسہرہ کی دھوم دھام میں باقی مسلمان تو تماشائی کی حیثیت سے شامل ہوتے تھے۔ مگر قلعہ میں تو دسہرہ کی تقریب کا بطور خاص اہتمام ہوتا۔ خاص دربار منعقد ہوتا۔ بادشاہ سلامت نیل کنٹھ اڑانے کی رسم بجالاتے۔ پھر باز اور لشکر ان کے سامنے پیش ہوتے۔ دن ڈھلے ہاتھیوں اور گھوڑوں کی قطاریں لگ جاتیں۔ بادشاہ ان کا معائنہ کرتے۔

دیوالی کی شب سارا شہر دیوں کی روشنی میں جگمگ جگمگ کرتا۔ قلعہ میں بھی چراغاں ہوتا، نوبت بجتی اور بادشاہ سلامت سونے چاندی میں تلتے۔

اور ہولی کا کیا پوچھتے ہو۔ عبیر اور گلال اتنا اڑتا کہ فضا ساری لال ہو جاتی۔ مٹکوں میں ڈھاک اور ٹیسو کے پھول پڑے ہیں۔ رنگین پانی سے پچکاریاں بھری ہیں۔ جو سامنے آیا اسے شرابور کر دیا۔ سارنگی،

دف، مجیرے اور چنگ کی تال پر تانیں اڑ رہی ہیں۔ ہولیاں گائی جا رہی ہیں۔

میں کیسے ہولی کھیلوں رے
سانوریا کے سنگ

ڈھول ڈھمکوں کے ساتھ ٹولیاں نکلی ہوئی ہیں۔ ہر ٹولی بادشاہ سلامت کے جھرو کے تلے ضرور جائے گی۔ وہاں بادشاہ سلامت بیگمات اور شہزادیوں کے ساتھ ان ٹولیوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ جو ٹولی وہاں جائے گی انعام پائے گی۔ اور بادشاہ سلامت خالی غزل کے شاعر تو نہیں تھے۔ گیت بھی لکھتے تھے۔ ہولی آئی تو گیت کی اس صنف میں جسے ہوری کہتے ہیں رواں ہو گئے

کیوں مو پہ ماری رنگ کی پچکاری
دیکھو کنور جی دوں گی گاری
بھاج سکوں میں کیسے موسون بھا جا نہیں جات
تھاڑے اب دیکھوں میں کون جو دن رات
شوخ رنگ ایسی ڈھیٹ لنگر سے کون کھیلے ہوری
مکھ بندے اور ہاتھ مرورے کر کے وہ برجوری

مگر ہولی تو بعد میں آتی تھی۔ اس سے پہلے بسنت پنچمی آتی تھی۔ ہندوؤں کے لیے بسنت پنچمی۔ مسلمانوں کے حساب سے بسنت میلہ۔ بسنت پالا اڑنت۔ تو یہ تو موسم کا تیوہار ہوا۔ مگر ہندو روایت میں تو موسم بھی دیوی دیوتاؤں سے منسوب چلے آتے تھے۔ سو مندروں میں مورتی پر پھول چڑھائے جا رہے ہیں۔ سرسوں کے پھول گیندے کے پھول۔ سرسوتی دیوی کی پوجا ہو رہی ہے۔ ادھر قدم گاہ شریف پر سرسوں کے پھولوں کے گڑوے چڑھ رہے ہیں۔ گلاب پاش سے گلاب، کیوڑہ اور بید مشک چھڑکا جا رہا ہے۔ قوالیاں گائی جا رہی ہیں۔

دوسرے دن میلہ خواجہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ کی طرف ڈھل گیا۔ وہاں سے میلہ چراغ دلی کی طرف چلا۔ اگلے دن حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر جمگھٹا ہوا۔ یہ انہیں کا توفیض تھا کہ بسنت میلہ کو مسلمانوں میں اتنی مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اس سے اگلے روز بسنت کے رسیا شاہ حسن رسولؒ نما کے مزار پر جمع ہوئے۔ اس سے اگلے دن شاہ ترکمانؒ کے مزار پر جمگھٹا ہوا۔ اس طرح پانچ دن گذر گئے۔ چھٹے دن شہر کے امرا اور معززین نے دربار میں حاضر ہو کر بادشاہ سلامت کی بسنت کو مبارک باد دی۔

اب ساتویں دن کی سنو۔ ایک بزرگ حضرت عزیزی کا مزار خراباتیوں کا مرجع قرار پایا تھا۔ تو ساتویں کی شب خراباتی یہاں جمع ہوتے۔ ناؤ نوش۔ گانا بجانا۔ دھما چوکڑی۔

اس تقریب سے پورا شہر بسنتی رنگ میں رنگ جاتا۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب بسنتی پوشاکوں میں ملبوس نظر آتے۔ درگاہوں پر بسنت کے میلے ہوئے تو پھر وہ بڑھتے ہی چلے گئے۔ آج ہرے بھرے شاہؒ کی بسنت۔ کل حضرت سرمد شہیدؒ کی بسنت۔ پھر گویوں نے اپنے استادوں کی بسنتیں منانی شروع کر دیں۔

بسنت پالا اڑنت۔ جاڑا پالا گیا۔ اب گلابی جاڑے کی بہار ہے۔ ہولی جلی تو دھوپ میں چیچنی آ گئی۔ آگے گرمی کا موسم ہے۔ دلی کی گرمیاں الٰہی توبہ۔ لوگ بولائے پھرتے ہیں۔ امرا و ساخس خانوں میں آرام کرتے ہیں۔ غریب چلاتا ہے ع

خس خانہ و بر فاب کہاں سے لاؤں

لو چلتی ہے۔ بارش آنے کا نام نہیں لیتی۔ آس پاس برسے، دلی پڑی ترسے۔ مگر اے لو وہ بادل گھر کر آئے۔ چھینٹا پڑا۔ سیلانیوں کے پیروں میں کھجلی شروع ہوئی۔ تڑپ کر گھروں سے نکلے۔ ٹولیاں دوڑی چلی جا رہی ہیں۔ کوئی ہمایوں کے مقبرے، کوئی ادکھلے کی سمت، مگر زیادہ ٹولیوں کا رخ قطب صاحب کی طرف ہے۔ وہاں کی امریوں میں جو بات ہے وہ کہیں بھی نہیں۔ اساڑھ گیا۔ اب ساون کی بہار ہے۔ چھاجوں پانی پڑتا ہے۔ مگر گھٹاؤں کا کسی طور جی نہیں بھرتا۔ جھڑی لگ گئی اور ایسی لگی کہ ہفتہ گذر گیا کہ دلی والوں نے دن میں سورج اور رات میں تارے نہیں دیکھے۔ گھروں میں باغوں میں جہاں دیکھو جھولے پڑے ہیں، گیت گائے جا رہے ہیں ؎

ننھی ننھی بوندیاں رے ساون کا مورا جھولنا
اک جھولا ڈالا میں نے امبوا کی ڈار پر
لمبی لمبی پینگیں رے ساون کا مورا جھولنا
چھوٹی موٹی سیاں رے ساون کا مورا جھولنا
اک جھولا ڈالا میں نے سیاں جی کے باغ میں
لمبی لمبی پینگیں رے، ساون کا مورا جھولنا

کبھی موسلا دھار برس رہا ہے، کبھی پھوار پڑ رہی ہے۔ بس اسی میں ساون گذر گیا۔ بھادوں آیا۔ اپنے ساتھ رنگا رنگ ہنگامے لایا۔ ایک ہنگامہ جنم اشٹمی کا، ایک بہار رکھشا بندھن کی۔ مگر یہ میلے یہ ہنگامے تو

اور جگہ بھی ہوتے ہیں۔ اب خاص جہان آباد کے تیوہار کی سنو۔ وہ جو غالب نے دلی کی ہستی پانچ ہنگاموں پر منحصر بتائی تھی تو اب پانچویں ہنگامے کا سمے آن پہنچا۔ شہر کے دو معزز ہندو دو معزز مسلمان دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور بصد ادب عرض کرتے ہیں کہ جہاں پناہ ساون بیت گیا۔ اب بھادوں کی رت ہے۔ جھڑی کے دن گئے۔ اب پھوار کی بہار ہے۔ ادھر حوض شمسی امنڈا ہوا ہے۔ پھول والوں کی سیر اب نہیں ہوگی تو پھر کب ہوگی۔ بادشاہ نے سنا' خوش ہوئے۔ پھول والوں کی سیر کی تاریخیں طے کیں۔ یہ تاریخیں طے کرنے کا انہیں حق پہنچتا تھا۔ یہ بہاروں بھرا میلہ تو لال قلعہ ہی کی عطا تھا۔ اکبر شاہ ثانی کے نورِ نظر نے جب فرنگی ریذیڈنٹ پر طمنچہ چلایا اور اس جرم میں شہر بدر ہوئے تو بادشاہ بیگم نے منت مانی کہ ہمارے کلیجہ کا ٹکڑا مرزا جہانگیر چھٹ کر آئے گا تو حضرت خواجہ بختیار کاکی کی درگاہ پر پھولوں کا چھپر کھٹ اور غلاف چڑھاؤں گی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ شہزادے صاحب چھٹ کر آ گئے۔ بادشاہ بیگم نے دھوم سے منت پوری کی۔ اس موقع پر پھول والوں نے پھولوں کا جو چھپر کھٹ آراستہ کیا اس میں پھولوں کا ایک پنکھا بھی لٹکا دیا۔ میلہ دھوم سے ہوا۔ سب سے زیادہ دھوم پنکھے کی ہوئی۔ بادشاہ سلامت خوش ہوئے طے کیا کہ برس کے برس بھادوں میں یہ میلہ ہوا کرے۔ مسلمان درگاہ شریف پر پنکھا چڑھائیں' ہندو جوگ مایا جی کے مندر میں پنکھا چڑھائیں۔ اور دونوں تقریبوں میں ہندو مسلمان برابر سے شریک ہوں۔ لیجئے وہ تو سچ مچ ایک تیوہار بن گیا اور بھادوں کی بہاروں میں ایک نئی بہار شامل ہوگئی' ایسی بہار جو جہان آباد کی جان بن گئی۔

تو بادشاہ سلامت نے میلہ کی تاریخ مقرر کردی۔ شہر میں نفیری بجی۔ کوچہ کوچہ دھوم پڑی' گلی گلی خبر پہنچی کہ پھول والوں کی سیر کا سمے آ گیا۔ سیلانیوں نے پھریری لی۔ مگر ابھی انہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ میلہ کی بسم اللہ تو قلعہ والوں سے ہوگی۔ اور قلعہ والوں کے لیے تو چپڑی اور دو دو کا معاملہ ہوگیا۔ ایک میلہ تو ابھی ساون میں وہ قلعہ ہی میں منا چکے ہیں۔ صورت اس کی یہ تھی کہ پنکھے کا جلوس دھوم دھام سے چاندنی چوک سے نکلا۔ فیض الدین نے اسے دیکھا اور یوں بیان کیا'' ہاتھی پر سونے کا پنکھا۔ بیچ بیچ موتیوں کی جھالر۔ اس میں سچے آویزے' اوپر سونے کا مور' اس کے پیٹ میں گلاب کیوڑہ بھرا ہوا' پنچوں میں سے نکل کے سب کو معطر کرتا جاتا ہے۔ آگے آگے پھولوں کی چھڑیاں۔ نفیری بجتی ہوئی۔ ہزارے چھوٹتے ہوئے۔ سپاہیوں کے ٹمن باجا بجاتے ہوئے۔ پیچھے سلاطین اور امیر امرا ہاتھیوں پر سوار۔ دو طرفہ آدمیوں کی بھیڑ بھاڑ۔'' اس شان سے یہ جلوس قلعہ میں داخل ہوا اور اس باغ کے دروازے پر پہنچا جو موتی محل کے روبرو پھولا ہوا تھا۔ بیچوں بیچ اس کے ایک حوض۔ شمال جنوب میں آمنے سامنے ساون بھادوں نام کے دو مکان سنگِ مرمر کے۔

تو یہ میلہ تو ہو چکا۔ اب پھول والوں کی سیر کا ہنگام ہے۔ ہٹو بچو' قلعہ معلیٰ کی سواریاں قطب صاحب کی طرف جارہی ہیں۔ کوئی پالکی میں' کوئی نالکی میں' کوئی تام جھام میں' کوئی رتھ میں۔ مانگنے والیاں سواریوں کے متصل دوڑتی جاتی ہیں۔ اللہ خیریں ہی خیریں رہیں گی' تیرے من کی مرادیں ملیں گی' ملیں گی۔ تجھے حق نے دیا ہے' دیا ہے۔ تیرے بٹوے میں پیسہ دھرا ہے دھرا ہے۔ تجھے مولا نوازے۔ دے جادے جا۔

اگلے دن صبح سویرے بادشاہ سلامت کی سواری باد بہاری چلی۔ ساتھ ساتھ بیگمات اور شہزادے۔ آگے آگے سانڈنی سوار۔ ان کے پیچھے سواروں کا رسالہ۔ چوبدار پکارتے جاتے ہیں "ادب سے' تعظیم سے مجرا بجالاؤ۔ حضرت بادشاہ سلامت۔"

قطب صاحب میں کیا گہما گہمی ہے۔ سب سے بڑھ کر امریوں میں چہل پہل ہے۔ اب یہاں زنانہ ہے۔ مرد نام کی مخلوق دور دور نظر نہیں آتی۔ چاند سے چہروں کا ہجوم ہے۔ کڑھائیاں چڑھی ہیں۔ ہر کڑھائی میں چھن من ہو رہی ہے۔ پکوان تلے جارہے ہیں۔ ادھر آموں کی لوٹ مچی ہوئی ہے۔ امریاں شہزادیوں کی زد میں ہیں۔ پھوار پڑ رہی ہے۔ ادھر کوئل کی کوک اور موروں کی جھنکار' ادھر شہزادیوں کی کلکاریاں کچھ دوڑتی پھرتی ہیں۔ کچھ جھولا جھول رہی ہیں۔ لمبی پینگیں' اونچی لے میں گیت

جھولا کن ڈارو رے امریاں
رین اندھیری تال کنارے
مرلا جھنکارے بادل کارے
برسن لاگیں بوندن پھیاں پھیاں
جھولا کن ڈارو رے امریاں
چار مل گیاں بھول بھلیاں
دو سکھی جھولیں دو ہی جھلائیں
بھولی بھولی ڈولیں شوق رنگ سیاں
جھولا کن ڈارو رے امریاں

کچھ شہزادیاں ہڑدنگی بنی پھرتی ہیں۔ جھرنے پر جا کر پتھر سے پھسلتی ہیں اور کلکاریاں مارتی ہیں۔ حوض شمسی امنڈا ہوا ہے۔ اشاروں سے انہیں بلا رہا ہے۔

اچانک جسولنی کی آواز آئی۔ خبردار ہو بادشاہ سوار ہوئے۔ لیجئے۔ ساری ہنسی ٹھٹھول' کلکاریاں' ہڑدنگا پن ختم۔ بادشاہ کی سواری کے ساتھ قلعہ کی ساری برات روانہ ہوگئی۔

اب شہر کی خلقت ڈھلنی شروع ہوتی ہے۔ بزاری بزاری' روسا امرا' عوام اور خواص' امیر غریب سب قطب صاحب کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ امیر امرا اپنی اپنی بگھیوں میں' رنڈیاں اپنی سجی بنی رتھوں میں' ترچھے بانکے اپنے اپنے گھوڑوں پہ۔ غریب غربا ہیں کہ پیدل ہی دوڑے چلے جاتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں کہ سر پہ گھڑا رکھا ہے اور پیدل بوندوں میں شرابور چلے جا رہے ہیں۔ جانتے ہو گھڑے میں کیا ہے۔ ایک نیا جوڑا' ایک جوڑی جوتی۔ قطب صاحب پہنچ کر نہائیں دھوئیں گے۔ نیا جوڑا پہن کر چھیلے بن جائیں گے۔

خلقت امنڈ کر آئی تو میلہ نے زور پکڑا۔ ابھی تک شاہی تھا۔ اب عوامی بن گیا۔ سیلانی چھیل چھکنیا بنے پھرتے ہیں۔ کلے میں بیڑا دبا ہوا' گلے میں بیلے موتیا مولسری کے ہار' کان میں عطر کی پھریری پھنسی ہوئی۔ ساقی نے پیچھے سے پکارا۔ یہ ٹھسکے۔ بیلے چنبیلی کی لڑیوں میں الجھی خس میں لپٹی نے کو سنبھالا' دو گھونٹ بھرے' ساقی کو نوازا' اور آگے بڑھ گئے۔ آزاد منش فقیر اور خمرے صدائیں لگا رہے ہیں۔

کچھ راہِ خدا دے جا
جا تیرا بھلا ہوگا

بھلا کر بھلا ہوگا
سودا کر نفع ہوگا

کنکر چن چن محل بنایا
مورکھ کہے گھر میرا رے
نا گھر تیرا نا گھر میرا
چڑیوں رین بسیرا رے
رام رام کر لے اچھے بندے
یہ کایا نہیں پادے گا

مائی اوڑھنا مائی بچھونا

مائی کا سرہانا رے

مائی کا کلبوت بنا

اس میں کلب سمایا رے

رام رام کر لے اچھے بندے

یہ کایا پھر نہیں پادے گا

اور ایک حسینی برہمن کھڑا پکار رہا ہے۔ عزیز وحق تعالیٰ کبریا ہے۔شرف جس نے پیمبر کو دیا ہے۔
چھابڑی والے آوازیں لگا رہے ہیں۔ بھٹے ہیں ہری ڈال والے۔سنگھاڑے ہیں تلاؤ کے
ہرے دودھیا۔ کالی بھونرالی جامنیں ہیں۔نون کے بتاشے لو۔پال والا ہی لے لڈو ہے۔

ادھر سقے کٹورا بجاتے ہیں اور آواز لگاتے ہیں۔ پیاسو' سبیل ہے' مولا کے نام کی۔تیرے پاس
ہے تو دے جا' نہیں تو پی جا راہِ مولا۔

آگے پنکھے کے جلوس کی دھوم دھام ہے۔خاص و عام کا اژدہام ہے۔ پوشاکیں رنگ رنگ کی۔
ہندو مسلمان کی پہچان ہے تو بس اتنی کہ ان کے سر پہ پگڑی بندھی' ادھر سر پہ زعفرانی رنگ کا عمامہ سجا ہے یا
چوگوشیہ ٹوپی منڈھی ہے۔ باقی گلوں میں ایک سے گجرے۔کلائیوں میں پھولوں کی لڑیاں لپٹی ہوئیں۔خس
کے پنکھے جھلتے ہوئے۔ پھوار میں بھیگتے ہوئے خوش خوش چل رہے ہیں۔ بیچ میں پھولوں سے سجا بنا ایک
رنگین بانس میں آویزاں ایک بڑا سا پنکھا۔ آگے پیچھے اکھاڑے۔ پھولوں کی چھڑیاں۔ طبلہ سارنگی والے
طبلہ سارنگی بجاتے ہیں۔ناچنے والیاں پاؤں میں گھنگھروں باندھے چھم چھم ناچتی ہیں۔نفیری والے نفیری
کی آواز میں گا رہے ہیں۔

مورا پیا گیا ہے بدیس

موہے چونری کون رنگا دے

بیر ساون آیو ری

اس سے آگے سپاہیوں کی قطار۔ مور چھل کرتے ہوئے نقیب چوبدار۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پکار'
صاحبِ عالم پناہ سلامت چلے آتے ہیں۔

پنکھا قطب صاحب کی درگاہ میں چڑھایا گیا۔رات بھر طبلہ کھڑکتا رہا' ڈھولک بجتا رہا۔صبح ہونے

پر یار لوگ یہاں سے سوغاتیں لے کر رخصت ہوئے۔

اگلی شام جوگ مایا مندر کا پنکھا اٹھا۔ وہی دھوم دھام خلقت کا اژدہام۔ جھرنے کے قریب سے نفیری کی آواز بلند ہوئی۔ لیجئے پنکھا اٹھنے لگا ہے۔ جھرنے کنارے سے اٹھا اور چلا جوگ مایا مندر کی طرف رات کا سمے ہے۔ رنگارنگ پنیوں سے منڈھا ہوا پنکھا ہنڈوں کی روشنیوں میں کیسا جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے۔ آگے آگے ڈھول تاشے بجتے ہوئے۔ ان کے پیچھے اکھاڑے جن میں استاد اور ان کے پٹھے اپنے ہنر کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ بانک' پٹہ' بنوٹ' کیا کیا ان کے ہنر ہیں۔ ان کے پیچھے نفیری والے۔ پھر کٹورے بجاتے ہوئے سقے۔ سب سے آخر میں پنکھا۔ اس کے ساتھ شہنائی بجانے والے ہیں کہ میٹھی دھن میں شہنائی بجا رہے ہیں۔ چھجوں اور بالا خانوں سے لوگ پھول برسا رہے ہیں۔ گلاب کیوڑہ چھڑکا جا رہا ہے۔

رات گئے جلوس مندر میں پہنچا۔ پرشاد بٹا۔ ہندو مسلمان سب نے لیا اور خوش خوش گھر واپس ہوئے۔

پھول والوں کی سیر تمام ہوئی۔ دلی کا پانچواں ہنگامہ ختم ہوا۔ مگر ے باقی و ماہتاب باقی۔ کوئی دن جاتے ہیں کہ کسی تقریب سے کوئی نیا ہنگامہ کوئی نیا میلہ بپا ہوگا۔

کتنے مشغلے کتنی بازیاں

پتنگ بازی، کبوتر بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی، شطرنج بازی، چوسر بازی، نبوٹ بازی، پٹے بازی۔ مختصر یہ کہ بازیاں اس تہذیب میں بہت تھیں۔ بلکہ آگے آنے والے مصلحین نے تو یہ کہا کہ انہیں بازیوں کے چکر میں آ کر مغلیہ سلطنت بازی ہار گئی۔ اور ان مصلحین نے تو شاعری کو بھی شعر بازی گردانا اور منجملہ پتنگ بازی، کبوتر بازی، بٹیر بازی جان کر اسے سلطنت کے زوال کا سبب قرار دے دیا۔

مگر کیا خوب بازیاں تھیں اور دلی والوں نے انہیں کیا کیا رونق بخشی اور کیسی کیسی باریکیاں پیدا کیں۔ ڈھیلچی سے لے کر انسانی قد جتنی تکل تک کتنی پتنگ کی قسمیں تھیں اور کیسے کیسے ان کے نام تھے۔ کلیجہ جلی، کلچڑی، سر کھلی، کندے کھلی، ادھ رنگ، پری، مانگ دار، زلفوں دار، کل سرا، دوپلکا، دوپنا، دوباز، بگلا، الفن، گل زماں، چاند تارا، شکر پارہ، بھیڑیا، آدھا، ادھیل، پونیا، سانپ، گنڈیری دار، کلدما، للدما، پٹیل۔

ادھر دن ذرا ڈھلا اور ادھر پتنگ بازوں نے جھرجھری لی۔ نامی گرامی استاد پتنگ باز ڈور کے بڑے بڑے پنڈے، ہچکے، چرخیاں، پتنگ، کنکوئے لے کر نکلے اور چلے لال قلعہ کے شمال میں سلیم گڑھ کی طرف۔ ادھر سے بادشاہ بہادر شاہ ظفر تخت رواں پہ سوار ہو کر یہاں آن پہنچے۔ ایک طرف سے شاہی پتنگ باز مرزا یاور بخت کی سرکردگی میں شروع ہوئے۔ دوسری طرف سے معین الملک نظارت خاں شاہی ناظر کی ٹولی نے پتنگ کو ٹھمکی دی۔ ایک پتنگ، دوسری پتنگ، تیسری پتنگ۔ دیکھتے دیکھتے سارا آسمان پتنگوں سے بھر گیا۔ اور لیجیے پیچ شروع ہو گئے۔ دونوں طرف سے استادوں نے ڈھیل دینی شروع کر دی۔ پتنگیں جیسے آسمان سے جا لگی ہوں اور ڈور نے پیٹا اس قدر چھوڑا کہ ڈور جیسے زمین کو چھونے لگی ہو۔ مگر سواروں نے کہ اسی کام کے لیے تعینات ہوئے تھے اپنی انکڑے دار لکڑی سے ڈور کو اوپر اٹھایا اور سہارا دیا۔ اور لیجیے ایک

پتنگ کٹ گئی۔ اور اس کے ساتھ 'وہ کاٹا' کا شور اٹھا۔ استاد کی وضعداری دیکھو کہ اس نے ڈور کھینچنے کی بجائے اسے جھٹکے سے توڑ دیا۔ جہاں پتنگ گئی وہاں ڈور بھی جائے۔

بادشاہ سلامت کو بھی جھرجھری آئی۔ تخت رواں سے اتر کر اشارہ کیا۔ شاہی پتنگ باز نے اشارے کو سمجھا۔ آگے بڑھ کر مچھلی کے چھلکوں والے دستانے پہنائے اور قدم آدم تکل حضور میں پیش کی۔ تکل ٹھمکی کے ساتھ اوپر اٹھی' اٹھتی چلی گئی اور دیکھتے دیکھتے تارا بن گئی۔

شہر کے پتنگ باز اپنی جگہ' قلعہ کے پتنگ باز اپنی جگہ۔ دونوں اپنے اپنے مقام پر بھاری' اپنے اپنے فن میں طاق۔ قلعہ کے پتنگ بازوں میں شہزادہ یاور بخت کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ان کی پتنگ شاذ و نادر ہی کٹتی تھی۔ مگر ایک اور شہزادہ بھی تھا کہ وہ بھی پتنگ بازی میں جواب نہیں رکھتا تھا۔ یہ تھے مرحوم شاہ عالم بادشاہ کے پڑپوتے فخر الدین عالم جو فخر الدین عالم سے مرزا فخرو بنے اور مرزا فخرو سے مرزا چپاتی۔ قلعہ سے نکل کر دربدر ہوئے۔ شہزادگی کے ٹھاٹ باٹ جاتے رہے مگر نہ پتنگ بازی سے باز آئے نہ کبوتر بازی سے قطع تعلق کیا نہ شطرنج بازی اور چوسر بازی سے توبہ کی۔ آخر میں ڈور پتنگ ہی ذریعہ روزگار بنی۔ وہ زمانہ گذر گیا جب ان کا کلسرا یا للسرا نوشیرواں بن کر اترتا تھا۔ یعنی نو پتنگوں کو کاٹا اور فتح کا ڈنکا بجاتا نیچے اتر آیا۔ اب بڑھاپا تھا اور ایک چھوٹی سی دکان میں اپنی پتنگوں کے ساتھ بسیرا۔ اب پتنگیں بیچتے تھے اور چیلوں کو پتنگ بازی کے داؤں پیچ بتاتے تھے۔

قلعہ والوں کی پتنگ بازی اپنی جگہ۔ شہر کے نامور پتنگ باز جمعہ کے جمعہ مسجد گھٹا کے قریب جمنا کنارے مورچہ جماتے اور پتنگیں اڑاتے۔ شب برات' عید بقرعید کے موقعوں پر زیادہ جوش و خروش دیکھنے میں آتا۔ مگر سب سے بڑھ کر جوش و خروش کا مظاہرہ پھول والوں کی سیر کے موقع پر مہرولی میں ہوتا۔ کیا خوب منظر ہوتا کہ پورا آسمان پتنگوں سے بھرا نظر آتا تھا۔

دلی کے آسمان پر اصل میں دو چیزوں کا غلبہ تھا۔ پتنگوں کا اور کبوتروں کا۔ یہاں پتنگ بازی کا جتنا زور تھا اتنا ہی بلکہ شاید اس سے تھوڑا بڑھ کر کبوتر بازی کا زور تھا۔ البتہ عشق پیشہ مخلوق کی توجہ پتنگ پر زیادہ تھی۔ یوں تو کبوتر بھی نامہ بری کا فرض انجام دیتے چلے آئے تھے۔ مگر دلی کے فرہاد اور مجنوں پتنگ پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ پتنگ کے ذریعہ نامہ و پیغام میں انہیں سہولت بھی نظر آتی تھی۔ نامۂ محبت پتنگ کے کنوں کے ساتھ باندھا اور پتنگ کو ڈھیل دیتے دیتے محبوبہ کی چھت کے قریب لے جا کر اسے غطہ دیا۔ لیجئے۔ نامۂ محبت منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔

صبح سویرے جسے دیکھو چھت پہ چڑھا ہوا ہے۔ ہاتھ میں چھیبی، آنکھیں آسمان پر جمی ہوئیں۔ اور کبوتر رنگا رنگ۔ لقا، شیرازی، کابلی، گولا، سبزہ، دوپلکا، لوٹن، پھل سرا، پٹیت، ببرے، بغبغے، کمنے۔ کچھ دانہ چگ رہے ہیں۔ کئی ایک چھتری پہ بیٹھے غٹرغوں غٹرغوں کر رہے ہیں۔ ایک پوری ٹکڑی فضا کی بلندیوں میں اڑ رہی ہے۔ کوئی ہوا میں قلابازیاں کھا رہا ہے۔ کوئی اونچا اڑتے اڑتے تارا بن گیا ہے۔ اب یہ کبوتر شام ہی کی خبر لائے گا۔ اور کوئی عجب نہیں کہ اگلے دن یا اس سے اگلے دن واپس آئے۔ لمبی اڑان کے لیے کبوتر کو کیا کیا سدھایا جاتا تھا اور کیسی کیسی غذا دی جاتی تھی۔

کہتے ہیں کہ واجد علی شاہ کے کبوتر خانے میں چوبیس ہزار کبوتر تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے کبوتروں کی شان یہ تھی کہ جب ان کی سواری نکلتی تو کبوتروں کی پوری ٹکڑی اس طرح اڑتی کہ ان پر سایہ کر لیتی جیسے کبوتر نہیں کوئی بدلی ہے۔ اور لیجیے پھر مرزا چپاتی کا ذکر لازم آیا۔ جب قلعہ سے نکلے اور گھر سے بے گھر ہوئے تو کبوتروں کی کابک ایک ٹھیلے پر رکھ لی۔ جہاں جس گلی میں جی چاہا ٹھیلا کھڑا کرتے اور کبوتر اڑانا شروع کر دیتے۔ کبوتروں پر موقوف نہیں وقتاً فوقتاً کبوتروں کی چھٹی کر کے طوطے اڑانے لگتے تھے۔

پتنگ بازی اور کبوتر بازی تو بے ضرر بازیاں تھیں۔ پتنگوں کے پیچ لڑتے بھی تھے تو اس میں بس اتنا ہی تو ہوتا تھا کہ ایک پتنگ کٹ جاتی تھی، دوسری سرخرو ہو کر آسمان میں بلند ہو جاتی تھی۔ کبوتر بازی میں بہت ہوا تو اتنا کہ کبوتر حریف کے کبوتر کو ورغلا کر اپنی چھتری پر لے آیا۔ مگر بٹیر بازی اور مرغ بازی میں تو حریف لہولہان ہو جاتے تھے۔ ان دونوں بازیوں نے لکھنؤ میں جا کر بہت زور باندھا۔ مگر دلی والے کیا کسی سے کم تھے۔ استاد اپنے اپنے بٹیر کو لے کر میدان میں اترتے۔ بٹیریں ننھی سی جان مگر کیا لڑتے تھے۔ اور ان کی چونچیں اور پنجے بس سمجھو کہ چھری چاقو۔ استاد ان کی چونچوں اور پنجوں کو چھیل کر اور تیز بنا دیتے تھے۔ چونچیں اور پنجے مار مار کر ایک دوسرے کو گھائل کر دیتے تھے۔ جو بٹیر زخمی ہو کر لیٹ گیا یا بھاگ کھڑا ہوا سمجھو کہ ہار گیا۔

بٹیر کا بدل تیتر۔ تیتر بھی کم نہیں تھے۔ استادوں سے تربیت پا کر وہ بھی بٹیروں کی شان سے لڑتے تھے۔ تیتر بٹیر کے ساتھ ساتھ ایک اور مخلوق ان استادوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ وہ تھا مرغا۔ اب تک تو وہ اپنی بانگ کے واسطے سے مشہور تھا۔ بازو پھڑپھڑائے، چونچ آسمان کی طرف بلند کر کے بانگ دی۔ یوں اپنی مردانگی کا نقارہ بجایا اور مطمئن ہو گیا۔ مگر دلی کے تفریح بازوں نے انہیں کیا خوب سدھایا تھا کہ بالکل بٹیروں کی طرح لڑتے تھے۔ استاد ایک دوسرے کو چیلنج کرتے کہ استاد ہو جائے ایک ایک پانی۔ مطلب یہ تھا کہ تم

اپنے مرغے کو لاؤ۔ میں اپنے مرغے کو لاتا ہوں۔ دیکھتے ہیں کہ کون ہارتا ہے' کون جیتتا ہے۔ لڑتے لڑتے حال سے بے حال ہو گئے۔ انہیں چھڑایا۔ پانی پلایا۔ اور پھر ایک دوسرے کے مقابلہ میں چھوڑ دیا۔ دونوں کا برا حال ہو جاتا۔ جو بدحال ہو کر گر پڑا یا بھاگ کھڑا ہوا وہ سمجھو کہ شکست کھا گیا۔

یہ بازیوں کی ایک قسم ہوئی۔ دوسری قسم وہ تھی جس میں استاد خود اپنا جوہر دکھاتے تھے اور اپنی طاقت اور اپنے ہنر کا لوہا منواتے تھے۔ ان میں سب سے بڑھ کر بازیاں دو تھیں بنوٹ بازی اور پٹے بازی۔ پنجہ کشی کو بھی انہیں بازیوں میں شمار کر لو۔

یہ بازیاں کیا تھیں اپنی اپنی جگہ پورا فن تھے۔ ایسا فن کہ حریف اپنی طاقت کے گھمنڈ میں ہے۔ یہاں استاد نے ناطاقت ہوتے ہوئے بھی اپنے داؤں سے اسے چت کر دیا۔ پنجہ کشی کا یہ واقعہ اس کی مثال ہے۔ میر پنجہ کش کے شاگرد مرزا علی بیگ اسّی کے پیٹے میں تھے۔ ایک تو ضعیف العمری' اوپر سے بیماری۔ اس عالم میں تھے کہ میرٹھ کا ایک پہلوان ان سے پنجہ لڑانے کے لیے آن پہنچا۔ مرزا صاحب نے بہت معذرت کی کہ میں بڈھا ٹھڈا' قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ میرے پنجے میں اب دم کہاں ہے کہ پنجہ لڑاؤں۔ مگر پہلوان پنجہ لڑانے پہ بضد تھا۔ ناچار مرزا صاحب نے پنجہ بڑھایا۔ لیجئے پنجہ آزمائی شروع ہو گئی۔ کتنی دیر تک یہ پنجہ آزمائی ہوتی رہی۔ مرزا صاحب نے اچانک اپنی قینچی نام کی چال استعمال کی۔ پہلوان کی کلائی کو ایک ایسا جھٹکا دیا کہ وہ درد سے بلبلا اٹھا اور دھڑ سے گر پڑا۔

شاگرد ایسا تھا تو سوچو کہ استاد کیا بلا ہو گا۔ میر پنجہ کش خواہ مخواہ تو نامور نہیں ہوئے تھے۔ اور ایسے نامور ہوئے کہ ان کی خطاطی جس میں وہ یکتا تھے پس منظر میں چلی گئی۔

اور بنوٹ کا فن تو کمال تھا۔ بنوٹ باز کو بس ایک رومال درکار تھا اور ایک دھات کا سکہ۔ سکہ کو رومال میں باندھا اور ہتھیار بند مخالف سے بھڑ گیا۔ کلائی پہ کچھ ایسا وار کرتا کہ مخالف کے ہاتھ میں لاٹھی ہو' بلم ہو' تلوار ہو وہ اس کے ہاتھ سے گر پڑتا۔ پھر اسے بھاگتے ہی بن پڑتی۔ دلی کے بنوٹئے قیامت تھے۔ اچھے اچھے تلوار بازوں سے تلواریں رکھوا لیتے تھے۔

اور پٹے بازی کہ دلی میں اس کا بھی بہت چرچا تھا۔ پٹے باز کے پاس ہتھیار کے نام بس ایک چھوٹی سی لاٹھی ہوتی تھی۔ اس چھوٹی سی لاٹھی کو وہ اس مہارت سے چلاتا تھا کہ چھری چاقو والے کس گنتی میں ہیں تلوار والوں کے چھکے چھڑا دیتا تھا۔

بنوٹ اور پٹے بازی میں جسمانی طاقت کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔ بنوٹ باز اور پٹے باز کو اپنے اپنے

ہنر میں طاق ہونا چاہیے۔ مگر پہلوانی میں جسمانی طاقت اور ہنر دونوں کی یکساں اہمیت ہے۔ پہلوان میں دم خم بھی ہونا چاہیے اور داؤں پیچ میں بھی اسے پیرا ہوا ہونا چاہیے۔ جہان آباد میں پہلوانی کا شوق عام تھا۔ جو پہلوان نہیں تھے وہ بھی کسرت تو ضرور کرتے تھے اور اکھاڑے میں زور بھی کرتے تھے۔ شرفا نے تو حویلیوں ہی میں اکھاڑے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ایک اکھاڑہ شریف منزل میں بھی تھا۔ اس گھرانے کے نوجوان طب ہی کا درس نہیں لیتے تھے اکھاڑے میں زور بھی کرتے تھے۔

بازیوں کی تیسری قسم وہ تھی جنہیں کھیلوں کے ذیل میں شمار کرنا چاہیے۔ شطرنج بازی، چوسر بازی، پچیسی، گنجفہ۔ شطرنج مغل بادشاہوں کا مرغوب کھیل تھا۔ شہنشاہ اکبر کا شوق تو اس حد تک تھا کہ فتحپور سیکری کے محل میں ایک فرش شطرنج کی بساط کی صورت بنوایا تھا۔ اس بساط پر خانوں میں مہروں کی جگہ حسین و جمیل خادمائیں رنگ برنگ لباس میں ملبوس ناز و نخرے کے ساتھ کھڑی نظر آتی تھیں۔ جب مہرہ ایک خانے سے دوسرے خانے میں جاتا تھا تو وہ کس ادا کے ساتھ اگلے خانے میں قدم رکھتی تھیں۔

محمد شاہ اور شاہ عالم محلسرا میں رات کے وقت بیگمات کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کو یہ کھیل اجداد سے ورثے میں ملا۔

عام لوگوں میں بالخصوص ہندوؤں میں شطرنج سے بڑھ کر چوسر کا چرچا تھا۔ شطرنج تو بادشاہوں اور امرا کا کھیل بن گیا تھا۔ چوسر کو عوامی مقبولیت حاصل تھی۔ چوسر کو اور پچیسی کو۔ چوسر اور پچیسی میں فرق صرف اتنا ہے کہ چوسر میں گوٹیں استعمال ہوتی ہیں۔ پچیسی میں کوڑیاں چلتی ہیں۔

مگر بازیوں میں سب سے بڑی اور سب سے رنگین بازی تو رنڈی بازی ہے۔ یا طوائف بازی کہہ لیجئے۔ جہان آباد میں طوائفوں کا کیا ٹھسا تھا، کیا ان کی آن بان تھی۔ محمد شاہ کے عہد میں بالخصوص طوائفوں کو بہت عروج حاصل ہوا۔ اسی عہد میں وہ نامی گرامی طوائف بھی تھی جو کرتے پائجامہ سے بے نیاز محفل میں آتی تھی۔ اردبیگم اس کا نام تھا۔ لباس کے نام بڑے کپڑے چھوٹے کپڑے کچھ بھی نہیں پہنتی تھی مگر کمال اس کا یہ تھا کہ کسی کو ذرا جو پتہ چل جائے کہ موصوفہ برہنہ بیٹھی ہوئی ہیں۔ بدن پر وہ گل بوٹے بنے ہوتے تھے جو اس زمانے میں رومی کمخواب کے تھان میں ہوتے تھے اور اس ہنرمندی سے بنے ہوتے کہ لگتا تھا کہ رومی کمخواب کا لباس پہن رکھا ہے۔

لٹی پٹی دلی میں بھی ایک سے بڑھ کر ایک طوائف موجود تھی۔ دو ڈیرہ دارنیاں تھیں کہ دونی چونی کہلاتی تھیں۔ شہزادوں میں کوئی شادی تھی۔ دونی جان کا مجرا تھا۔ مرزا چپاتی بھی یہاں موجود تھے۔ بیچ

مجرے میں ٹوکا۔ ''بائی جی ذرا ٹھہریں۔ ایک شعر ہو گیا ہے۔'' ذرا تتلاتے تھے۔ سو شعر اس طرح پڑھا

ڈھستے ڈھستے ہو ڈئی اتنی ملٹ
ساٹ پیسے ٹی ڈونی رہ ڈئی

شعر اصل میں یوں تھا

گھستے گھستے ہو گئی اتنی ملٹ
سات پیسے کی دونی رہ گئی

محفل زعفران زار بن گئی۔ دونی جان کی تیوری پر بل آیا۔ مگر پھر فوراً ہی سنبھل گئیں۔ معذرت کی ''سبحان اللہ مرزا صاحب۔ میں تو بیماری میں بالکل ست گئی تھی۔ اب بھی پوری جان کہاں آئی ہے۔ صاحب عالم نے یاد فرمایا۔ میں حاضر ہو گئی۔'' یہ کہا اور پھر گانا شروع کر دیا۔

شہر میں چاوڑی بازار گویا بازار حسن تھا۔ ادھر شام پڑی اور ادھر بالا خانوں پر حسینوں نازنینوں نے جلوہ دکھانا شروع کیا۔ راسخ نے اس بازار کا کیا خوب نقشہ کھینچا

چاوڑی قاف ہے یا خلدِ بریں ہے راسخ
جمگھٹے حوروں کے، پریوں کے پرے ملتے ہیں

جمگھٹے حوروں کے بالا خانوں میں اور نگاہ بازوں دلگی بازوں کے جمگھٹے نیچے سڑک پر۔ چھیل چھبیلے، کلے میں پان کا بیڑا، گلے میں یا کلائی میں لپٹا بیلے موتیا کا گجرا، کان میں عطر کی پھریری۔ چل رہے ہیں ایلے گیلے سڑک پر اور نظریں جمی ہیں بالا خانے پر۔ کتنے ہیں کہ بس نگاہ بازی پر قانع ہیں۔ وہ بھی ہیں کہ لپک جھپک زینے پر چڑھے اور دن سے بالا خانے میں جا پہنچے۔ وہاں منظر ہی اور ہے۔ چاندنی بچھی ہے۔ چاندنی پر مسند۔ جابجا گاؤ تکیے قرینے سے دھرے ہیں۔ ان کے ساتھ پیچوان، خاصدان، اگالدان۔ چھت پر لٹکے ہوئے جھاڑ فانوس جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ ہانڈیاں اپنی بہار دکھا رہی ہیں۔ مجرے کی تیاریاں ہیں۔

طوائفیں تو خیر ہوئیں۔ ان کا اپنا ٹھسا تھا اور اپنی تہذیب۔ اور ایسی تہذیب کہ شرفا اپنے لڑکوں بالوں کو تمیز سکھنے، ادب آداب جاننے کے لیے ان بالا خانوں میں بھیجتے تھے۔ اور بالا خانوں کی تہذیب میں یہ احتیاط بھی شامل تھی کہ کسی شریف خاندان کے لڑکے بالے تہذیبی تربیت کے لیے بھیجے گئے ہیں تو انہیں حدود میں رکھا جائے گا۔ اگر ڈیرا دارنی یہ دیکھے گی کہ صاحبزادے جامے سے باہر ہونے لگے ہیں تو اسے واپس گھر بھیج دے گی اور اس کے بڑوں سے معذرت کر لے گی۔

یہ تو طوائفیں تھیں۔ مگر اسی طوائفی کلچر کی فضا میں ایک اور مخلوق بھی اپنا جلوہ دکھا رہی تھی۔ اس کا نقشہ شاہد احمد دہلوی نے کیا خوب پیش کیا ہے:

> ''پہلو کے کمرے سے سبز رنگ کی پشواز پہنے ایک اجلے رنگ کی حسین عورت خراماں خراماں آ کر سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ محفل پر اس نے ایک نظر ڈالی اور پھر نہایت ادب سے مجرا عرض کیا۔ اوہو' یہ تو موتی بھانڈ ہے۔ پیچھے دو سارنگی والے' ایک طبلہ نواز اور ایک مجیرے والا' اجلی پوشاکیں پہنے آ کھڑے ہوئے۔ طبلے پر تھاپ پڑی۔ سارنگیوں پر لہرا شروع ہوا۔ طبلہ نواز نے پیش کار لگایا۔ موتی بھانڈ نے گت بھری تو یہ معلوم ہوا کہ اندر کے اکھاڑے کی پری اتر آئی۔ تین سلاموں پر چکر دار گت ختم ہوئی تو سب کے منھ سے ایک زبان ہو کر نکلا' سبحان اللہ۔ موتی بھانڈ نے تسلیمات عرض کی۔ کوئی ایک گھنٹے تک کتھک ناچ کے مشکل توڑے سنائے۔ پھر لے کی تقسیم ایک سے سولہ تک دکھائی۔ آخر میں تتکار کا کمال دکھایا۔ سب نے جی کھول کر داد دی۔ واقعی میں موتی بھانڈ نے اپنے فن میں کمال حاصل کیا تھا۔''

داد کے ڈونگرے برسے تو موتی بھانڈ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا ''حضور کی ذرہ نوازی اور قدر دانی ہے کہ اس غلام کو یوں سراہتے ہیں۔ ورنہ میں کیا' میری بساط کیا۔ من آنم کہ من دانم۔''

شائستگی اور علم مجلسی میں دلی کی طوائفیں ہی نہیں' بھانڈ بھی خوب رچے بسے تھے۔ شائستگی سے بے بہرہ بھانڈ جنہوں نے بھانڈ کے نام کو بٹہ لگایا بعد کی پیداوار ہیں۔

دس انگلیاں دس ہنر

میلے ٹھیلے سیر وتفریح اپنی جگہ' کام اپنی جگہ۔ اور دلی والے کام کے ایسے دھنی تھے کہ جس کام میں ہاتھ ڈالا اسے درجہ کمال تک پہنچایا۔ کتنی چھوٹی بڑی صنعتیں ان کے ہاتھوں میں آ کر صناعی بن گئیں۔ زردوزی کی صنعت اس کی مثال ہے۔ یہ صنعت پہلے سے چلی آتی تھی۔ دلی کے صنعت کاروں نے یا کہیے کہ صناعوں نے اپنی اختراعات سے اسے چار چاند لگا دیئے۔ زردوزی میں کلابتون کا استعمال ہوتا تھا۔ دلی کے کاریگروں نے ایک اختراع کی کہ اس میں تار جسے مقیش کہتے ہیں شامل کر دیا۔ زردوزی کے کام میں اس ایک اضافہ سے کتنی چمک پیدا ہوگئی۔ پھر مقیش کو توڑ مڑوڑ کر انہوں نے گوکھرو بنائے۔ پھر اسی مقیش سے سلمہ ستارے کے کام کی راہ نکالی۔ اور سلمہ ستارے کے کام نے تو وہ مقبولیت حاصل کی کہ ادھر قلعہ میں شہزادیاں اس پر ریجھی ہوئی تھیں ادھر شہر میں عوام وخواص نے اسے سر چڑھایا۔ تاروں کو تھوڑا کوٹ کر چپٹا کر لیا اور سوئی میں پرو کر دوپٹوں پر باریک باریک پھول کاڑھ لیے۔ اس ہنر نے کامدانی کا نام پایا اور مقبولیت حاصل کی۔

ظروف سازی' چتائی کاری' ہاتھی دانت کا کام' سنگ تراشی' جوتا سازی۔ کیسی کیسی صنعت دلی کے کاریگروں کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ اور ہر صنعت میں انہوں نے کیسی کیسی باریکیاں پیدا کیں اور مقبولیت حاصل کر کے اپنی صناعی کی داد پائی۔ اور ہاں جوتا سازی۔ جوتا تو سب ہی جگہ پہنا جاتا تھا۔ سو جوتے شہر شہر بنتے تھے۔ مگر دلی کے جوتے سازوں کو تو قلعہ میں منہ دکھانا ہوتا تھا۔ شہزادیوں کے نازک پیران کے دھیان میں ہوتے تھے۔ سو انہوں نے ایسے نازک شاہانہ پیروں کو دھیان میں رکھ کر نازک قسم کی زرنگار جوتیاں بنائیں۔ وصلی کی جوتی کو بھی انہیں کی ایجاد جانو۔

اور سنگ تراشی کی صنعت کو تو اس شہر میں فروغ پانا ہی تھا۔ مغلوں کو عمارتیں بنانے کا شوق تھا۔ سنگ تراشوں کی بہت مانگ تھی۔ اس میدان میں یہاں کیسا کیسا ہنر مند پیدا ہوا اور اپنی چھینی اور ہتھوڑے کی مدد سے پتھر پہ کیسے کیسے دلکش نقش بنائے اور کیا کیا پھول پتیاں تراشیں۔

ایک وہ ہنر تھا جس کے ماہر بندھیرے کہلاتے تھے۔ یہ تھا موتی بیندھنے کا ہنر۔ موتیوں اور دوسرے ہیرے جواہرات میں باریک باریک سوراخ کیے جاتے تھے۔ خاص طور پر موتیوں میں۔ یہ مثل تو ہم نے سن ہی رکھی ہے کہ جو بیندھ گیا سو موتی نہیں تو کنکر۔ اور واقعی یہ نازک کام ہے۔ بیندھنے میں موتی کہیں چیخ گیا تو بس سمجھ لو کہ موتی نہیں رہا' کنکر بن گیا۔

اسی سے ملتا جلتا ہنر جڑائی کا تھا۔ زیوروں میں ہیرے جواہر جڑنے کا کام۔ یہ ہنر مند جڑیا کہلاتے تھے۔ اور خود زیوروں کی تیاری کونسا چھوٹا کام تھا۔ دلی کے سنار شہزادیوں کے لیے کیا کیا زیور تیار کرتے تھے اور کیسی کیسی باریکیاں ان میں پیدا کرتے تھے۔

کچھ ایسے کام تھے جنہیں عورتوں نے اپنایا اور اپنا ہنر دکھایا۔ سب سے بڑھ کر سلمہ ستارے اور گوٹے کا کام تھا جس میں عورتوں نے بہت ہنر مندی دکھائی اور نام پیدا۔ خیاطی کے پیشے میں تو انہیں اس لیے آنا پڑا کہ شہزادیاں اور دلی کی شریف زادیاں یہ پسند نہیں کرتی تھیں کہ ان کا لباس مرد سیئیں۔ بھلا ان کی حیا یہ اجازت دے سکتی تھی کہ ان کی انگیا کرتی درزی سیئیں۔ ان کی اس حیا نے درزنوں کو جنم دیا جو مغلانیاں کہلاتی تھیں۔

ایک ہنر خطاطی کا تھا۔ دلی میں کیا کیا خطاط پیدا ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں پروان چڑھ کر خطاطی آرٹ کے مرتبہ تک پہنچ گئی۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ طغرے اور وصلیاں ان خطاطوں سے حاصل کرتے تھے اور ان سے اپنے گھروں کی آرائش کرتے تھے۔ سید محمد امیر رضوی کیا خوب خطاط تھے۔ بہادر شاہ ظفر بھی ان کے ہنر کے قائل تھے۔ خوب خطاط تھے کہ پنجہ بھی لڑاتے تھے۔ خطاطی میں کمال حاصل کیا اور میر پنجہ کش کے نام سے شہرت پائی۔ انگلیوں میں جلال و جمال یکجا ہو گئے تھے۔ خط نفیس و لطیف' پنجہ فولادی۔

1857ء میں چورانوے کے پیٹے میں تھے۔ مگر جوش ایسا کہ جنگ میں کود پڑے اور فرنگیوں کی گولی کا نشانہ بن گئے۔

یہ اس زمانے کی صنعتیں اور صناعیاں تھیں۔ باقی وہ کاروبار بھی تھے کہ پیشہ کی سطح پر رہے' ہنر نہ بن

پائے۔ ان پیشوں میں کچھ ایسے پیشے تھے کہ زمانے کے ساتھ رخصت ہوگئے۔ جب مشعلیں نہ رہیں تو مشعلچی کہاں سے رہ جاتے۔ وہ زمانہ مشعلوں کا تھا۔ دیوان خانوں میں شمعیں اور فانوس۔ باہر گلیوں میں مشعلیں۔ شرفارات کو کسی محفل میں شریک ہونے کے لیے گھر سے قدم نکالتے تو آگے آگے مشعلچی چلتا۔

مشعلچیوں کے ساتھ حمامی بھی رفت گذشت ہوگئے۔ یہاں کی گرمی نے مغلوں کو بہت ستایا۔ اس گرمی کے توڑ پر انہوں نے حمام بنائے۔ حمام نے حمامی کے پیشہ کو جنم دیا۔

پیشوں میں ایک پیشہ شہدے گیری کا بھی تھا۔ زمانے کی ستم ظریفی دیکھو کہ اس نے شہدے کو بدمعاش لفنگا بنا دیا۔ دلی میں یہ اچھا بھلا پیشہ تھا۔ بلکہ درباری پیشہ تھا۔ بادشاہ کے خاصے کا پلنگ اٹھانے کی خدمت شہدوں کے سپرد تھی۔ شہدے خوار اس وقت ہوئے جب بادشاہت رخصت ہوگئی۔ جب مشعلیں بجھ گئیں اور حمام ٹھنڈے ہوگئے تو مشعلچی بھی رخصت ہوگئے اور حمامی بھی چلے گئے۔ شہدوں کے ساتھ خرابی یہ ہوئی کہ بادشاہت کا زمانہ رخصت ہوگیا۔ مگر وہ رخصت نہیں ہوئے۔ بادشاہ سلامت نہ رہے تو پھر انہوں نے شرفا کے گھروں کا رخ کیا۔ جہاں شادی بیاہ کا ہنگامہ دیکھا وہاں جا دھمکے اور اسی قسم کے دعائیہ فقرے دہرانا شروع کردیے جو قلعہ میں خدمت کرتے ہوئے دہرایا کرتے تھے۔ بس اسی میں رسوا ہوگئے۔

وہ شاہی زمانہ تھا۔ محلات ہی میں نہیں، حویلیوں میں بھی ڈیوڑھیوں میں دربان کھڑے نظر آتے تھے اور مرد تو خیر ہوتے ہی تھے۔ محلات کے تو زنان خانوں کے بھی دروں پر دربان عورتیں تعینات نظر آتی تھیں اور اس شان کے ساتھ کہ وہ شمشیر زنی اور نیزہ بازی میں بھی مہارت رکھتی تھیں۔ زمانے کے ساتھ دربان عورتیں تو یکسر رخصت ہوگئیں۔ ہاں حویلیوں، بنگلوں اور کوٹھیوں میں دربان نام کی مخلوق اب بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

پھولوں کا چلن دلی میں بہت تھا اور خاص طور پر قلعہ میں۔ سوگل فروش بھی نظر آتے تھے اور مالنیں بھی۔ پھول تو اب بھی بکتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر سہرے، ہار، گجرے اب بھی خریدے جاتے ہیں۔ سوگل فروش کی اصطلاح بیشک ٹکسال باہر ہوگئی۔ مگر یہ پیشہ تو بہرحال برقرار ہے۔ ہاں مالن اس زمانے تک تھی۔ اب نظر نہیں آتی۔

یہ پیشے تھے مشتے نمونہ از خروارے۔ ورنہ پیشے تو اور بھی تھے۔ قصائی، کنجڑے، تیلی تنبولی، بنئے، بقال، ورق ساز، نانبائی، بھڑ بھونجے، عطار، عطر فروش، نائی دھوبی، گدی حلوائی، سب ہی ہوتے تھے اور خالی نائی نہیں، نائنیں بھی ہوتی تھیں اور ڈومنیاں بھی اور ستے جن کا بازاروں میں کٹورا بجتا تھا، شرفا اور خاص طور پر بیبیاں

انہیں بہشتی کہنا زیادہ پسند کرتی تھیں۔ پھر رنگریزوں کا ذکر بھی لازم ہے کہ دوپٹے اور چنریاں رنگنے میں ماہر تھے۔ ان میں کتنے ایسے پیشے ہیں کہ یوں اب بھی ہیں مگر اس تہذیب میں جو روایتیں ان سے وابستہ تھیں اور جس قسم کے کردار بن کر وہ ابھرے تھے اور تہذیب کا حصہ نظر آتے تھے وہ اب باقی نہیں ہے۔ تہذیب کا حصہ تھے تب ہی تو ان سے محاوروں نے بھی جنم لیا۔ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ نائی نائی بال کتنے کہ ججمان آگے آئے جاتے ہیں۔ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ کنجڑی اپنے بیروں کو کھٹا کب بتاتی ہے۔ تیلی رے تیلی ہے تیرے سر پہ کولہو اور میر نے تو عطار سے گزر کر عطار کے لونڈے کو ایک کردار عطا کر دیا تھا۔ ع

کیفیتیں عطار کے لونڈے میں بہت ہیں

اور ہاں دلی والے کھٹ بنے کو تو برداشت کر سکتے تھے مگر کھاٹ کا لفظ ان کی سماعت پر بار گزرتا تھا۔ سو ایک کھٹ بنا جب دلی کے ایک کوچے میں کھاٹ بنالو کھاٹ کی بولی لگاتا نمودار ہوا تو اہل محلہ نے اس کی پٹائی کر دی اور خبردار کیا کہ خبردار جو آئندہ شرفا کے محلّہ میں آ کر کھاٹ کا لفظ منہ سے نکالا۔ کہنا ہی ہے تو پلنگ کہو، چھپرکٹ کہو، چارپائی کہو۔

رنگ، خوشبوئیں، ذائقے

کہتے ہیں کہ شیر شاہ کو شیر شاہ بننے سے پہلے ایک دفعہ بابر کے دستر خوان پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ سامنے سینی میں بکرے کی بڑی بڑی رانیں رکھی ہوئی تھیں۔ شیر شاہ کی سمجھ میں جب نہ آیا کہ ان رانوں سے کیسے انصاف کیا جائے تو اس نے نیام سے تلوار نکالی اور ایک ران کو آگے سرکا کر اس کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کے کھانی شروع کر دیں۔

مغلوں کی زندگی ابھی بڑی حد تک شمشیر و سناں سے عبارت تھی۔ اس وقت شاید ان کا دستر خوان بھی اسی رنگ کا تھا کہ تلوار سے ہی اس کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا تھا۔ مگر بابر سے بہادر شاہ ظفر تک آتے آتے مغلیہ دستر خوان بہت سے مراحل سے گذر کر کیا سے کیا بن چکا تھا۔ تہذیبیں اپنے دستر خوانوں سے بھی تو پہچانی جاتی ہیں۔ ہر تہذیب میں آغاز میں تو زندگی جتنی سادہ ہوتی ہے اتنا ہی دستر خوان بھی سیدھا سادھا ہوتا ہے۔ گنے چنے کھانے، گنے چنے ذائقے۔ مگر جب تہذیب میں رچاؤ آتا ہے تو جہاں دوسرے شعبوں میں ہنر مند اپنے ہنر میں مینا کاریاں کرتے ہیں وہاں مطبخوں میں بیٹھے باورچی بھی اپنا ہنر دکھاتے ہیں۔ یہ مغلوں کا دور آخر تھا۔ مغل اقتدار سمٹ سمٹا کر لال قلعہ تک رہ گیا تھا۔ مگر مغل دستر خوان کتنا پھیل گیا تھا اور کتنا رنگا رنگ ہو گیا تھا۔ یہ بابر کا دستر خوان نہیں تھا جہاں ایک الھڑ پٹھان نے تلوار سے ران کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر کھانی شروع کر دیں۔ یہ شہنشاہ ہند ظل سبحانی حضرت بہادر شاہ ظفر کا دستر خوان جنت نشان تھا۔ اس کے اپنے ادب آداب تھے۔ لیجئے ڈیڑھ پہر دن چڑھا۔ خاصے کا وقت آ گیا۔ چوبدارنی نے خاصے والیوں کو پکارا۔ خاصے والیاں ہڑ بڑا کر دوڑیں۔

سفید براق دستر خوان بچھا۔ اس کے بیچوں بیچ ایک چوکی بچھائی گئی۔ اس پر بھی دستر خوان بچھایا

گیا۔ اس پر بیٹھ کر بادشاہ سلامت خاصہ کھائیں گے۔ باقی دستر خوان پر بیگمات' شہزادے' شہزادیاں بیٹھ کر کھانا تناول کریں گی۔

خوان چلے آ رہے ہیں۔ کھانا چنا جا رہا ہے۔ کیا کیا غذائیں ہیں اور ایک ایک غذا کی کتنی کتنی قسمیں ہیں۔ ذرا گننا شروع کرو۔ اول پلاؤ کے خوان۔ یخنی پلاؤ' موتی پلاؤ' نکتی پلاؤ' نور محلی پلاؤ' کشمش پلاؤ' نرگسی پلاؤ' زمردی پلاؤ' لال پلاؤ' مزعفر پلاؤ' فالسائی پلاؤ' آبی پلاؤ' سنہری پلاؤ' روپہلی پلاؤ' مرغ پلاؤ' بیضہ پلاؤ' اناناس پلاؤ' کوفتہ پلاؤ' بریانی پلاؤ' سالم بکرے کا پلاؤ' بونٹ پلاؤ' کھچڑی' شولہ (گوشت میں پکی ہوئی کھچڑی) قبولی ظاہری۔

خوانوں کی رنگت بدلتی ہے۔ قلیہ' دوپیازہ' ہرن کا قورمہ' مرغ کا قورمہ' مچھلی' بینگن کا بھرتا' آلو کا بھرتا' چنے کی دال کا بھرتا' الو کا دلمہ' بینگن کا دلمہ' کریلوں کا دلمہ' بادشاہ پسند کریلے' بادشاہ پسند دال' سیخ کباب' شامی کباب' گولیوں کے کباب' تیتر کے کباب' بٹیر کے کباب' نکتی کباب' خطائی کباب' حسینی کباب۔

اب روٹیوں کے خوان آتے ہیں۔ روٹیاں قسم قسم کی۔ چپاتیاں' پھلکے' پراٹھے' روغنی روٹی' بیسنی روٹی' خمیری روٹی' گاؤ دیدہ' گاؤ زبان' کلچہ' غوصی روٹی' بادام کی روٹی' پستے کی روٹی' چاول کی روٹی' گاجر کی روٹی' مصری کی روٹی' نان' نان پنبہ' نان گلزار' نان تنکی۔ شیر مال۔

اب میٹھے خوانوں پر ایک نظر ڈالیے۔ متنجن' زردہ مزعفر' کدو کی کھیر' گاجر کی کھیر' کنگنی کی کھیر' یاقوتی' نمش' روے کا حلوہ' گاجر کا حلوہ' کدو کا حلوہ' ملائی کا حلوہ' بادام کا حلوہ' پستے کا حلوہ' رنگترے کا حلوہ۔

مربے...... آم کا مربا' سیب کا مربا' بہی کا مربا' ترنج کا مربا' کریلے کا مربا' رنگترے کا مربا' لیموں کا مربا' اناناس کا مربا' گڑھل کا مربا' کروندے کا مربا' بانس کا مربا۔

مٹھائیاں...... جلیبی' امرتی' برفی' پھینی' قلاقند' موتی پاک' بالوشاہی' درِبہشت' اندرسے کی گولیاں' حلوہ سوہن' حلوہ حبشی' حلوہ گوندے کا' حلوہ پیڑی کا' لڈو موتی چور کے' مونگ کے' بادام کے' پستے کے' ملائی کے لوزیں مونگ کی' دودھ کی' پستے کی' بادام کی' جامن کی' رنگترے کی' فالسے کی۔ پیٹھے کی مٹھائی۔ پستہ مغزی۔

یہ مزے دار رنگا رنگ کھانے قابوں' رکابیوں' طشتریوں اور پیالوں پیالیوں میں سجائے گئے ہیں۔ مشک زعفران اور کیوڑے کی خوشبو سے مہک رہے ہیں۔ چاندی کے ورق ان پر جھلملا رہے ہیں۔ یوں مغلیٰ دستر خوان نے دستر خوانوں کی دنیا میں اپنا منفرد مقام حاصل کیا۔

اور اس دستر خوان سے وابستہ کیا تکلفات تھے کیا ادب آداب تھے۔ ایک طرف ہاتھ دھونے' کلی

کرنے کے لیے چلمچی، آفتابہ، بیسن دانی اور صندل کی ٹکیوں کی ڈبیاں رکھی ہیں۔ ساتھ ہی رومال خانے والیاں رومال، زانو پوش، دست پاک (ہاتھ پونچھنے کا رومال)، بینی پاک (ناک پونچھنے کا رومال) لیے کھڑی ہیں۔ بادشاہ چوکی پر آ کر بیٹھے۔ دستر خوان پر دائیں طرف ملکہ اور بیگمات آ کر بیٹھیں دائیں ہاتھ پر شہزادے شہزادیاں۔ کس ادب کے ساتھ نیچی نگاہ کیے کھانا کھا رہے ہیں۔ بادشاہ نے اپنے سامنے سے کوئی شے اٹھا کر کسی کو دی تو اس نے کس طرح ادب سے کھڑے ہو کر عطیہ قبول کیا اور پھر بیٹھ کر کھانے لگا۔

کھانے کے بعد صندل کی ٹکیاں ہاتھوں پر مل کر انہیں دھویا۔ کلی کی۔ بادشاہ سلامت خواب گاہ میں آئے۔ پلنگ پر بیٹھ کر بھنڈا نوش کیا۔ پھر داروغہ نے برف میں لگی ایک صراحی کی مہر توڑی اور گنگا کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی بادشاہ کو چاندی کے کٹورے میں بھر کر پیش کیا۔ ادھر بیگمات بھی ہاتھ دھو کر کلی کر کے فراغت پا چکی ہیں۔ اب منہ میں گلوری ہے اور ہونٹوں کے بیچ حقے کی نے ہے۔ گاؤ تکیوں سے کمر لگائے بیٹھی ہیں۔ سامنے ڈومنیاں بیٹھی میٹھے سروں میں گا رہی ہیں۔

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

بابر نے خالی شعر کہا تھا۔ اولاد نے اس کی تفسیر کر ڈالی۔

یہ کھانے قلعہ تک کب تک محدود رہ سکتے تھے جبکہ یہاں سے خوان کے خوان باہر امیروں، رئیسوں کی حویلیوں میں بھیجے جاتے تھے اور خاص خاص موقعوں پر مثلاً رمضان المبارک میں افطاری کی تقریب سے جامع مسجد بھی پہنچتے تھے۔ سوان رنگا رنگ کھانوں کی مہک دلی کی حویلیوں، گھروں، کوچوں بازاروں میں بھی پہنچ رہی تھی۔ دلی والے بلا کے چٹورے۔ سب نہیں تو قلعہ کے کتنے کھانے اپنا لیے۔ اور کچھ عوامی رنگ میں نئے ذائقے دریافت کیے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں کا حلیم واہ واہ سبحان اللہ۔ پھر کسی ظالم باورچی نے نہاری کے نام سے ایک کھانا تیار کیا۔ شروع میں تو اس کے پیش نظر مزدور پیشہ مخلوق تھی۔ مگر پھر خاص و عام میں مقبول ہوئی اور دلی کی خاص غذائی ایجاد سمجھی گئی۔ آگے چل کر ایسے کبابی پیدا ہوئے جنہوں نے سیخ کباب میں وہ ذائقہ پیدا کیا کہ باہر کے شہروں سے چٹورے ان کی دکانوں پر پہنچتے اور ہونٹ چاٹتے واپس ہوتے۔ سیخ کباب کو ان کے ہاتھوں کتنی عزت مل گئی۔

اور مٹھائیاں۔ کم از کم ایک مٹھائی والے کے متعلق تو طے ہے کہ اس کی دکان کی مٹھائی قلعۂ معلّٰی میں بھی پہنچتی تھی۔ یہ تھا گھنٹے والا شاہی حلوائی جس نے چاندنی چوک میں مٹھائی کی دکان کھول رکھی تھی۔ 'عالم میں انتخاب دلی' کے مصنف مہیشور دیال کی تحقیق یہ ہے کہ اس دکان کا بانی اصل میں لالہ سکھ لال نام کا

ایک حلوائی تھا۔ 1712ء میں وہ جے پور سے دلی پہنچا۔ پہلے اس نے پٹڑی پر اپنا خوانچہ لگایا۔ پھر بیچ چاندنی چوک میں ایک دکان کرائے پر لی اور یہ انوکھا انداز اپنایا کہ دکان میں گھنٹیاں لٹکا لیں۔ ایک نوکر مستقل یہ گھنٹیاں بجاتا رہتا۔ یوں تو اس کی سب ہی مٹھائیاں ایسی تھیں کہ جو کھاتا ہونٹ چاٹتا واپس ہوتا۔ مگر سب سے بڑھ کر لذیذ یہاں کا حلوہ سوہن پٹڑی والا اور قلاقند تھا۔ اور ہاں نان خطائی۔ یہ تینوں مٹھائیاں خاص طور پر قلعہ والوں کو مرغوب تھیں۔

ان غذاؤں میں خوشبوؤں اور رنگوں کا بہت عمل دخل تھا۔ کھانے ہوں مہکتے ہوئے۔ اور پھر انہیں آنکھیں بھی تو قبول کریں۔ زعفران کے استعمال سے یہ دونوں ہی تقاضے پورے ہو جاتے تھے۔ سو قورمے ہوں یا پلاؤ بریانی یا زردہ متنجن یا مٹھائیاں ان میں زعفران کا استعمال لازم ٹھہرا۔ کھانوں کی بات جانے دیں۔ یہاں تو دواؤں کا بھی مہکتا ہوا ہونا ضروری تھا۔ ماکولات، مشروبات، ادویات سب مہکتی ہوئیں اور رنگ برنگی۔

پھولوں اور عطریات کا چلن بھی اسی لیے بہت تھا کہ دلی والا خوشبو کے بغیر تو سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ دلی کے سیلانیوں کا ذرا طور دیکھو۔ سج بن کر گھر سے نکلے اور تیر کے موافق جامع مسجد کے چوک پہنچے۔ گجرے والے سے موتیا بیلے کا ایک گجرا لے کر کلائی میں لپیٹا۔ عطر والے سے عطر کی ایک پھریری لے کر کان میں رکھی۔ تنبولی سے ایک گلوری لے کر کلے میں دبائی اور چلے معطر معطر خراماں خراماں چاوڑی کی طرف۔

جہاں جائیے، جس محفل میں جس دیوان خانے میں، جس بیٹھک میں قدم رکھئے بیلے موتیا چنبیلی گلاب کی مہک آپ کا استقبال کرے گی۔ کسی گھر میں قدم رکھئے اور دیکھئے۔ گھڑونچی پہ کوری ٹھلیا پانی سے بھری رکھی ہے۔ موتیا کی لڑی اس کے گرد لپٹی ہے۔ حوض کے برابر چند درخت کھڑے ہیں۔ ان میں ادبدا کر ایک درخت انار کا ہوگا۔ انار کی لال لال کلیوں نے کیا بہار دکھائی ہے کہ پوری فضا میں ایک رنگ دوڑا ہوا ہے۔ رنگوں میں سب سے بڑھ کر زعفرانی رنگ۔ پلاؤ میں یہ رنگ نہ جھلملائے تو پھر وہ تو دھوبیا پلاؤ ہوا۔ ہر کھانے میں ہر غذا میں زعفران۔ شربت میں اگر کیوڑہ یا گلاب کا عرق شامل نہیں تو وہ شربت نہیں۔

بسنت رت لگی تو پھر سب رنگوں سے بڑھ کر بسنتی رنگ۔ ساڑھیاں، دوپٹے، پگڑیاں سب بسنتی۔ ایک برس ایسا ہوا کہ بسنت پنچمی کے عین دن بہادر شاہ ظفر کی سالگرہ آ گئی۔ بس پھر پوری دلی بسنتی رنگ میں رنگی گئی۔ کسی ایسی ہی گھڑی میں میر نے کسی گلفام کو دیکھا ہوگا کہ یہ شعر کہا ؎

بسنتی قبا پر تری مر گیا ہوں
کفن دیجیو میر کو زعفرانی

یہ سارا نقشہ دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ تہذیب غالب طور پر حواس خمسہ کی تہذیب تھی۔ پانچوں حواس کی تسکین کے لیے کیا کیا سامان فراہم کیے گئے تھے اور کس طرح وہ زندگی کے لوازمات میں شامل ہو گئے۔ ہاں مگر حواس خمسہ کی تسکین اس کا منتہا نہیں تھی۔ حواس خمسہ کا اقرار کر کے وہ اس سے آگے جاتی نظر آتی ہے۔ خوشبو حسیاتی تجربوں سے گذر کر روحانی تجربوں میں راہ پاتی ہے اور عقیدت کی خوشبو بن جاتی ہے۔ درگاہوں میں، عزاخانوں میں رنگ برنگے پٹکے۔ اگردان میں اگربتیاں جلتی ہوئیں۔ اس کے ساتھ ایک مہک لوبان کی۔ علموں کے گرد، تابوتوں پر، مزاروں پر پھولوں کی لڑیاں سجی ہوئیں۔ اب یہ مہک حسیات کے دائرے سے نکل کر کسی عالم ماورا کی خبر لاتی محسوس ہوتی ہے۔

عقیدت کی خوشبو اور تخیل کے رنگ نے مل جل کر چیزوں کو کیا سے کیا بنا دیا تھا کہ ہر معلوم کے گرد نامعلوم کا ایک ہالہ نظر آتا تھا۔ اور جانے پہچانے آثار میں ایک بھید چھپا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اور گھاٹ ویسے نگمبو دگھاٹ۔ مگر نہیں۔ جب خلقت نے یہ جانا کہ جمنا کے اس گھاٹ آ کر برہما جی نے باس کیا تھا اور اس کی برکت سے انہیں ویدیں جنہیں وہ بھول گئے تھے یاد آ گئی تھیں تو پھر اس گھاٹ کی حیثیت ہی بدل گئی۔ پھر جیسے اور مندر ویسے اکاس مندر اور کالکا مندر۔ مگر نہیں، ان مندروں کو مذہبی تخیل نے اور ہی مقام عطا کر دیا تھا۔ اکاس مندر کے آگے سنگ سرخ کے دو شیر دائیں بائیں کھڑے تھے۔ کالکا مندر کے بارے میں روایت یہ تھی کہ یہاں کسی بھولے بسرے زمانے میں دیوتا براجمان تھے۔ انہیں دو راکشسوں نے بہت پریشان کیا۔ تب انہوں نے برہما جی سے فریاد کی۔ برہما جی نے انہیں مشورہ دیا کہ مہا مائی پاربتی جی کے پیروں پڑو۔ وہ تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتی ہیں۔ دیوتاؤں نے ایسا ہی کیا۔ تب مہامائی کے منہ سے ایک دیوی برآمد ہوئی۔ کوشکی اس کا نام تھا۔ کوشکی نے ان راکشسوں کے سردار کو ہلاک کر ڈالا۔ مگر ہوا یہ کہ اس کے خون کے قطروں سے کتنے راکشس پیدا ہو گئے۔ تب کوشکی کی بھوں میں سے کالی دیوی برآمد ہوئی۔ اس کی شان یہ تھی کہ ایک ہونٹ اس کا پربت تھا اور دوسرا آکاش پر۔ اب کوشکی نے راکشسوں کو مارنا شروع کیا۔ اور کالی دیوی کا کام یہ تھا کہ ان کے خون کی کوئی بوند زمین پر نہ گرنے دے۔ جتنے راکشس مارے گئے سب کا خون اس نے چاٹ لیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر کالی دیوی نے یہاں اس پہاڑی پر استھان کیا۔ بس اس کے بعد یہاں ایک مندر بن گیا۔ کالکا مندر وہی مندر ہے۔

اب جوگ مایا مندر کا بھی احوال سن لو۔ قطب صاحب کی لاٹھ کے پاس ہی یہ مندر ہے۔ کہتے ہیں کہ جب دیوکی رانی نے کرشن جی کو جنم دیا تھا تو بسدیو جی نے انہیں گود میں اٹھایا۔ گوکل جا کر انہیں جسودھا

کے گھر میں چھوڑا اور جسودھا کی نوزائیدہ بیٹی کو اٹھا لائے۔ کنس نے سمجھا کہ دیوکی نے اسی بچی کو جنم دیا ہے۔ کنس نے اس بچی کو ان کی گود سے لے کر زمین پر دے مارنا چاہا مگر اس نے بجلی کا روپ دھارا اور وہاں سے غائب ہوگئی۔ پھر اس نے یہاں آ کر استھان کیا۔ تو یہ مندر اس تقریب سے وجود میں آیا۔

اب اس لوہے کی لاٹھ کی سنو جو مسجد قوۃ الاسلام کے احاطہ میں کھڑی ہے۔ ہندو خلقت کہتی ہے کہ یہ وہی کیلی ہے جو پرتھی راج نے جوتشیوں کے کہنے پر گڑوائی تھی۔ جوتشیوں نے اسے بتایا تھا کہ یہاں زمین کی تہہ میں اس وقت راجہ باسک براجے ہوئے ہیں۔ ان کے پھن میں اگر کیل ٹھونک دی جائے تو پھر وہ یہاں سے سرک نہیں سکیں گے۔ پھر ان کے یہاں ہوتے ہوئے تمہارے راج کو کوئی کھٹکا نہیں رہے گا۔ سدا قائم رہے گا۔ کیل پھن میں جا کر پیوست ہوگئی تھی۔ مگر مورکھ راجہ نے کیل کو اکھڑوا کر اپنا اطمینان کرنا چاہا۔ اطمینان کر لینے کے بعد اس نے ترنت اسے پھر گڑوا دیا۔ مگر اس دوران میں راجہ باسک لہر کھا کر آگے نکل گئے۔ کیلی گڑی رہ گئی۔

ادھر مسلمانوں کے جوش عقیدت نے کتنی روایتوں کو جنم دیا اور یہاں کے کتنے مقامات کو کیا سے کیا بنا دیا۔ ذرا سنو کہ حوض شمسی کیسے بنا۔ سلطان التمش ایک تالاب بنوانا چاہتا تھا۔ مگر کوئی موزوں جگہ ملتی تو بنواتا۔ وہ مل نہیں رہی تھی۔ ایک رات خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ حضرت علیؓ گھوڑے پر سوار آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اے شمس الدین تالاب اس مقام پر بنوا۔ صبح ہوئے پر التمش نے یہ خواب حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کو سنایا اور اس مقام پر لے گیا جس کا اشارہ اسے خواب میں ملا تھا۔ دونوں نے دیکھا کہ اس مقام پر سموں کے نشان ہیں اور ان میں سے پانی نکل کر بہہ رہا ہے۔ لیجیے طے ہوگیا کہ تالاب یہاں بنے گا۔ نام اس کا حوض شمسی رکھا گیا۔

مقبرہ صفدر جنگ کے سامنے درگاہ شاہ مرداں ہے جسے محمد شاہ بادشاہ کی بیگم نواب قدسیہ صاحب الزمانی نے تعمیر کرایا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس بیگم کو کسی نے ایک پتھر لا کر دیا جس پر حضرت علی کے قدم کا نشان تھا۔ یہ پتھر اس درگاہ کی عمارت میں جوڑ دیا گیا۔ تو درگاہ شاہ مرداں کو عوامی عقیدے کے مطابق حضرت علی کے نقش قدم سے مزین ہونے کا شرف حاصل ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ کے ساتھ ایک باولی بھی بنی ہوئی ہے۔ اس سے بھی ایک روایت وابستہ ہے۔ کہتے ہیں کہ جب یہ باولی تعمیر ہو رہی تھی تو ادھر غیاث الدین تغلق کا قلعہ بھی تعمیر ہو رہا تھا۔ سلطان تغلق اس بزرگ صوفی سے شاید ان کی بے نیازی کے باعث خار کھاتا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ کوئی

مزدوردن کے اوقات میں درگاہ کی طرف نہ جائے۔ محبوب الٰہیؒ نے سوچا کہ پھر باولی کی تعمیر کا کام رات کو کرایا جائے۔ سو مزدور دن بھر قلعہ کی تعمیر کا کام کر کے رات کو اس طرف آجاتے اور چراغوں کی روشنی میں باولی کی تعمیر میں لگ جاتے۔ بادشاہ کو جب اس کا پتہ چلا تو اس نے یہ پابندی لگائی کہ تیل درگاہ والوں کو فروخت نہ کیا جائے۔ محبوب الٰہی نے یہ سن کر کہا کہ تیل نہیں ملتا ہے نہ ملے باولی کا پانی تو ہے۔ لیجئے چراغوں میں تیل کی جگہ پانی استعمال ہونے لگا۔ اس بزرگ کی کرامت سے باولی کا پانی جب چراغ میں پڑتا تو تیل بن جاتا۔

جامع مسجد سے جو روایت وابستہ چلی آتی ہے اس کا ذکر آ ہی چکا ہے۔ مسجد جب بن کر کھڑی ہوگئی تب یہ کھلا کہ وہ قبلہ کے رخ پر نہیں ہے۔ منتظمین پریشان تھے اور بادشاہ ازردہ خاطر۔ تب ایک درویش کسی سمت سے نمودار ہوا۔ احوال معلوم کیا۔ کہا کہ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ آگے بڑھ کر مسجد کی دیوار سے پشت لگائی۔ لیجئے مسجد قبلہ رخ ہوگئی۔ درویش جس طرح نمودار ہوا تھا اسی طرح غائب ہوگیا۔

اس بستی کے بیچ ایک پرانا برگد کھڑا ہے جو شاہ بولا کے بڑو کے نام سے مشہور ہے۔ وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ کسی بھلے زمانے میں اس کی چھاؤں میں شاہ بولا نام کے ایک مجذوب نے دھونی رما رکھی تھی۔ اس بڑ سے باروں مہینے بڑولیاں گرتی رہتیں۔ شاہ بولا کا طور یہ تھا کہ ادھر سے گذرنے والوں کے وہ مستقل بڑولیاں مارتے رہتے۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ کوئی شہزادہ بیمار پڑا۔ حکیموں نے جواب دے دیا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ سب طرف سے مایوس ہو کر شہزادے کو شاہ بولا کے پاس لایا گیا۔ شاہ بولا نے کہا کہ تیل لاؤ۔ تیل آگیا۔ اسے پیالے میں بھرا۔ پھر شہزادے سے کہا کہ پیالے میں اپنی صورت دیکھ۔ شہزادے نے پیالے میں صورت دیکھی۔ پھر شاہ بولا نے پیالہ منھ سے لگایا اور غٹ غٹ سارا تیل پی گئے۔ اور پھر بڑ کی چھاؤں میں آنکھیں موند کر لمبے لیٹ ہوگئے۔ پھر کیا ہوا کہ ادھر شاہ بولا دنیا سے سدھارے اور ادھر شہزادے کی صحت بحال ہوگئی۔

مطلب یہ ہوا کہ حواس خمسہ کی تسکین اور آسودگی کے سب سامان اپنی جگہ مگر اس سارے معاملہ کی ایک جہت اور بھی تھی۔ جو حواس خمسہ سے ماورا تھی۔ اور یوں یہ تہذیب معلوم سے نامعلوم کی طرف اور موجود سے ماورا کی طرف سفر کرتی نظر آتی تھی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ آخر یہ شہر خالی بادشاہوں کی راجدھانی تو نہیں تھا۔ اسے بائیس خواجہ کی چوکھٹ ہونے کا مرتبہ بھی تو حاصل تھا۔ تصوف اس کی فضا میں رچا بسا چلا آ رہا تھا۔

بائیس خواجہ کی چوکھٹ

بھانت بھانت کی بولی۔ رنگ رنگ کا جناور۔ زندگی کے کتنے طور جلوہ دکھا رہے تھے اور کس کس ڈھب کی مخلوق یہاں شاد آباد تھی۔ ہر طور دوسرے طور کی ضد۔ پھر بھی کس کمال سے ایک سانچہ میں ڈھلے تھے کہ کوئی طور بے طور نظر نہیں آتا تھا۔ جس رنگ کو دیکھو لگتا تھا کہ سارا جہان آباد اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ تخت و تاج کی نال بھی یہیں گڑی تھی اور بائیس خواجہ کی چوکھٹ بھی یہی تھی۔

بائیس خواجہ کی چوکھٹ۔ کیسے کیسے ولی نے آ کر یہاں ڈیرا کیا۔ اور مرجع خلق بن گیا۔ خواجہ بختیار کا کیؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلویؒ۔ زمانہ ہوا یہ بزرگ آسودۂ خاک ہوئے۔ مگر ان کے مزاروں نے وہ رونق پکڑی تھی کہ مزار سے بڑھ کر دارے بن گئے تھے۔ ان کے سوا بھی کتنے اولیا نے یہاں دھونی رمائی اور خاص و عام کا مرجع بن گئے۔ ہر ولی کا اپنا اپنا طور تھا، سید حسن رسولؒ نما نے اپنے ڈیرے میں ایک کھونٹی گاڑی ہوئی تھی۔ ایک رسی گلے میں ڈال کر اس کھونٹی سے اسے باندھا۔ اس کھونٹی کے گرد مستقل پھرا کرتے تھے۔ اور یہ مصرعہ پڑھتے تھے ع

ہستم سگِ رسولؐ رسن درگردنِ ماست

ان کے بارے میں مشہور تھا کہ جس پر مہربان ہو جاتے اسے حضور رسول مقبول ﷺ کی زیارت کرا دیتے۔

شیخ نور الدینؒ یار پراں کیا کمال کے بزرگ تھے۔ غیاث الدین بلبن کے زمانے میں یہاں آئے اور جمنا کنارے ڈیرا ڈالا۔ یہاں پہلے سے ایک بزرگ دھونی رمائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ تم بادشاہ کی اجازت کے بغیر یہاں اپنا ٹھکانا نہیں بنا سکتے۔ بادشاہ سلامت اس وقت ٹھٹھے میں مقیم تھے۔ روایت یوں

ہے کہ وہ اپنی باطنی قوت کے زور پر دم کے دم میں وہاں پہنچے۔ بادشاہ سے احوال بیان کیا اور جمنا کنارے ڈیرے کی اجازت طلب کی۔ بادشاہ ان کا قائل ہوا اور اجازت دی۔ فوراً ہی اجازت نامہ لے کر واپس آ گئے۔ دیکھنے والے حق دق رہ گئے کہ یہ بزرگ چشم زدن میں کیسے ٹھٹھ گئے اور اجازت نامہ لے کر آ گئے۔ اڑ کر ہی گئے ہوں گے۔ بس ان کے نام کے ساتھ پراں کا لقب جڑ گیا۔

ترکمان دروازہ اس وجہ سے ترکمان دروازہ ہوا کہ وہاں حضرت شاہ ترکمانؒ بیابانی آسودۂ خاک ہیں۔ بیابانی اس وجہ سے کہلائے کہ شہروں سے نفور تھا۔ صحرا و بیابان میں مارے مارے پھرتے تھے۔ جانے کیا افتاد پڑی کہ بیابان سے بھٹک کر اس نگر میں آئے اور یہیں اللہ کو پیارے ہوئے۔ مزار نے درگاہ کا مقام پایا اور دادا پیر کی درگاہ اس کا نام پڑا۔

ایک تھیں بی بی فاطمہ سامؒ۔ بابا فریدؒ کی مریدنی۔ صاحب کرامت مانی گئیں۔ دلی والوں نے ان کو بی بی شام کہنا شروع کر دیا۔

اور ایک تھے بابا ابو بکر طوسیؒ جو آگے چل کر بابا ہنڈے والے کہلائے۔ اس وجہ سے کہ کسی بزرگ نے ان کے مزار پر آ کر منت مانی کہ اگر میری مراد بر آئی تو آپ کے مزار پہ چاندی کا مٹکا چڑھاؤں گا۔ مراد پوری ہوئی۔ اس نے چاندی کا مٹکا چڑھایا۔ لیجئے عقیدتمندوں کا تانتا بندھ گیا۔ دعا کر رہے ہیں اور مٹکا چڑھانے کی منت مان رہے ہیں۔ منت پوری ہوئی۔ مٹکا مزار پر چڑھایا گیا۔ دیکھتے دیکھتے مزار کے سامنے ان گنت مٹکے مٹکے نظر آنے لگے۔ بس اسے ہنڈے والی درگاہ کا نام دے دیا گیا۔

نام گناتے چلے جایئے' درگاہوں کا شمار کرتے چلے جایئے۔ شمار مشکل نظر آئے گا۔ پتہ نہیں کس نے اس چوکھٹ کو بائیس خواجہ تک محدود کر دیا ورنہ کتنے اولیا' کتنے قلندر اس خاک میں پڑے سوتے ہیں۔

جو جاگ رہے ہیں وہ ان پر مستزاد۔ جاگ رہے ہیں مگر اس طرح کہ کوئی تحیر میں ڈوبا ہوا ہے' کوئی عالم جذب میں ہے۔ لباس کے نام کسی نے خالی لنگوٹی باندھ رکھی ہے۔ کسی نے اس تکلف کو بھی روا نہ رکھا۔ بدن پر راکھ ملی ہے۔ ننگ دھڑنگ بیٹھے ہیں۔ کتنے ایسے مجذوب ایسے درویش اس شہر میں جابجا ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ دین علیؒ شاہ کی شان یہ تھی کہ لباس کے نام جسم پہ تار نہیں۔ رہائش کے نام اپنا کوئی جھونپڑا نہیں۔ قدم شریف کی نواح میں ایک گنبد تھا وہاں دھونی رمائی تھی۔ باتیں اول جلول کرتے تھے۔ مگر عقیدتمند انہیں اول جلول باتوں میں گہرے معنی تلاش کر لیتے تھے۔

میر احمدؒ ایسے مجذوب ہوئے کہ دیوانہ کہلانے لگے۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز۔ بے مقصد بے مطلب

گھومتے پھرتے۔ رات ہوئی تو جس دکان کو خالی پایا وہاں پڑ رہے۔

میر قطبیؒ ان سے بڑھ کر نکلے۔ میر احمدؒ دیوانہ دیوانے لگتے تھے۔ مگر ہر قید سے آزاد مگر لباس کی قید سے آزاد ہونا ضروری نہ سمجھا۔ میر قطبیؒ نے ساری قیود کے ساتھ لباس کی قید سے بھی رسہ تڑا لیا۔

شاہ عبدالنبیؒ کیا خوب مجذوب تھے۔ دونوں وقت دہی بیڑے کھاتے اور قرآن مجید بہ خط نسخ لکھتے رہتے۔ جہاں آباد کے امرا میں ایک تھے بخشی بھوانی شنکر۔ وہ اس بزرگ کے ایسے مرید ہوئے کہ شب و روز ان کی خدمت میں مصروف رہتے۔

مگر سید عسکریؒ تو اچھے بھلے تھے۔ سید حسن رسول نما کے نواسے ضرور تھے مگر سیدھے سچے دنیادار آدمی۔ سپاہی پیشہ۔ نوکری چاکری میں مصروف۔ مگر کہیں ایک دفعہ الور میں گذر ہوا۔ وہاں ایک بزرگ مولوی محمد حنیفؒ کی خدمت میں حاضری دی اور کہیں یہ شعر پڑھ بیٹھے ؎

مستم چناں بکن کہ ندانم ز بے خودی

در عرصۂ خیال کہ آمد کدام رفت

اس بزرگ نے نگاہ بھر کر انہیں دکھا اور کہا کہ جا اپنے نانا کی قبر پہ جا بیٹھ۔ بس انہوں نے حواس کھوئے۔ گریبان چاک کیا اور دلی آ کر حسن رسول نماؒ کے مزار پہ آن بیٹھے۔ جذب و جنون اتنا بڑھا کہ زنجیروں میں جکڑے گئے۔

ایک تھیں بائی جی۔ نام جو کچھ بھی ہو لوگوں میں وہ اسی نام سے جانی جاتی تھیں۔ شہر سے باہر ایک چھپر تلے پڑی رہتی تھیں۔ انا اعلطینک الکوثر کا ورد کرتی رہتیں۔ منتوں مرادوں والے جوق در جوق ان کے پاس پہنچتے۔ جواب میں وہ یہ کرتیں کہ مراد مانگنے والا جو مال لے کر حاضر ہوتا اس میں سے سترہ کوڑیاں الگ کر کے زمین پہ رکھتیں۔ سترہ دفعہ رکھتیں، سترہ دفعہ اٹھاتیں۔ ہر دفعہ انا اعطینا پڑھتیں۔ پھر جو منھ میں آتا سائل کو کہہ دیتیں۔ سائل اسی بے مطلب جملہ سے مطلب نکال لیتا اور خوش خوش گھر واپس جاتا۔

انہیں مجذوبوں کے پہلو بہ پہلو وہ مجذوب بھی تھے جو رسول شاہی کہلاتے تھے۔ ان کا اپنا ایک طور تھا۔ چار ابرو کا صفایا رکھتے، لنگوٹی باندھتے، شراب نوشی کو جائز گردانتے۔ ایک تھے شاہ فدا حسین۔ الور جا کر اپنے پیر مولوی محمد حنیفؒ سے درس لیتے رہے۔ علمی شان کی کتابیں لکھیں۔ پھر مرشد کے حکم پر یہ سب کتابیں کنوئیں میں ڈبو دیں۔ واپس دلی آئے۔ طور یہ تھا کہ ڈاڑھی مونچھیں صاف۔ لباس کے نام ایک لنگوٹی۔ باقی بدن پہ راکھ ملی ہوئی۔ سر سید احمد خاں سے رشتہ یہ تھا کہ ان کے نانا کے بھائی تھے۔ چالیس برس تک ایک

حجرے میں پڑے رہے۔ اس طرح کہ بدن پہ راکھ ملے تنہا بیٹھے ہیں۔ نیند آئی تو سرہانے تکیہ کے طور پر اینٹ رکھی اور سو گئے۔

اس نقشہ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ جہاں آباد اولاً صوفیوں اور مجذوبوں کی بستی تھا۔ مگر ذرا جا بجا اپنے اپنے ٹھیوں پر بیٹھے ہوئے شاعروں کو دیکھو۔ لگے گا کہ یہ شہر اصل میں شاعروں کی بستی ہے۔ ان سے ذرا صرف نظر کر کے حکیموں کے کوچوں میں جھانکو۔ معلوم ہوگا کہ یہ شہر سب سے بڑھ کر طبیبوں، حکیموں کا شہر ہے۔ اور علما کو دیکھو تو احساس ہوگا کہ یہ شہر اولاً عالموں کا قریہ ہے۔

امرا، علما، حکما، شعرا، جس طبقہ جس گروہ پر نظر ڈالو لگے گا کہ بس یہی اس معاشرے کے رکن رکین ہیں اور جہان آباد انہیں سے عبارت ہے۔ سب سے بڑھ کر طبیب تھے کہ طبیب بھی تھے اور طبیب سے بڑھ کر بہت کچھ تھے۔ ان کے مطب بیماروں کا مرجع تو تھے ہی مگر ساتھ میں مجلسی زندگی کے مرکز بھی تھے۔ اور جس طبیب کا رشتہ قلعۂ معلیٰ سے قائم ہو گیا وہ شاہی طبیب ٹھہرا۔ حکیم احسن اللہ خاں طبیب بھی تھے اور طبیب سے بڑھ کر بہت کچھ۔ گورے چٹے، گول چہرہ، سفید ڈاڑھی، سفید لباس۔ طب کے ساتھ تاریخ کے بھی شناور تھے۔ شعر و ادب سے بھی شغف تھا۔ داستان سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی تھی۔ ظہیر دہلوی کو آمادہ کر کے اس راہ پہ ڈالا اور ایک داستان ان سے لکھوائی جو 'قصہ ممتاز' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے معالج خاص تھے۔ مگر خالی علاج تھوڑا ہی کرتے تھے۔ سارے امور سلطنت میں دخل رکھتے تھے۔ گویا طبیب سے بڑھ کر وزیر اور مشیر بن گئے تھے۔ کتنے خطابات سے نوازے گئے۔ احترام الدولہ، عمدۃ الحکما، معتمد الملک، حاذق الزماں، حکیم محمد احسن اللہ خان بہادر ثابت جنگ۔

حکیم محمود خاں دربار سے دور تھے۔ مگر ان کا مطب اپنی جگہ ایک دربار تھا۔ خاندانِ شریفی کی طبی روایات کے امین۔ حکیم شریف خاں جنہوں نے اس شہر میں بیٹھ کر طب میں کمالات دکھائے زمانہ ہوا گذر چکے تھے۔ ان کے بیٹے صادق علی خاں بھی کچھ چھوٹے طبیب نہیں تھے۔ انہوں نے اکبر شاہ ثانی کا زمانہ دیکھا اور ساتھ میں زمانے کی ہوا جس نے انہیں دربار سے دور اور خلقت سے قریب کر دیا۔ اب بہادر شاہ ظفر کا زمانہ تھا اور حکیم صادق علی خاں کے فرزند حکیم محمود شریفی مسند پہ بیٹھے تھے۔ قلعہ سے دور، شاہی نوازشات سے بے نیاز۔ مگر خلقت میں ان کی طب کا ڈنکا بجتا تھا۔ کیا خوب وضع تھی۔ جاڑے، گرمی، برسات وہی ایک لباس۔ سر پہ دو پلی ٹوپی، بر میں تن زیب کا انگرکھا۔ روز صبح کو گھوڑے پہ سوار ہو کر سید حسن رسول نما کے مزار پہ جا کر فاتحہ پڑھنا۔ شام کو فٹن پہ سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے نکلنا۔ امیر غریب سب کا

علاج یکساں توجہ سے کرنا۔ اور کیا کمال کے طبیب تھے۔ نسخہ دو پیسے والا' علاج لاکھ روپے کا۔ علاج کے طریقے بھی خوب تھے۔ ایک مریض پیٹ کے درد سے بلبلاتا آیا۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی۔ کہا کہ جا چنے کھالے۔ مریض نے چنے چبائے۔ پیٹ کا درد غائب۔ کسی نے پوچھا کہ حکیم صاحب چنے کھانے سے پیٹ کا درد کیسے جاتا رہا۔ اسے تو اور بڑھنا چاہیے تھا۔ بولے' اس کے ہاتھوں کی چکنائی اور چربی کی بو سے میں نے جانا کہ کمبخت نے بریانی کھا کر ٹھنڈا پانی پی لیا ہے۔ سواس کا علاج تو یہی تھا کہ چنے کھلائے جائیں کہ وہ چکنائی کو جذب کرلیں۔

ایک معزز اور معمر بزرگ بخار کی شکایت لے کر آئے۔ نسخہ لکھا اور کہا کہ اس سے پسینہ آئے گا اور بخار اتر جائے گا۔ نسخہ استعمال کیا مگر نہ پسینہ آیا نہ بخار اترا۔ نسخہ میں ترمیم کی۔ پھر بھی نہ پسینہ آیا' نہ بخار اترا۔ وہ بزرگ شکایت لے کر مطب میں حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب نے غصے سے انہیں دیکھا اور گرج کر کہا کہ آپ نرے گدھے ہیں۔ اس غیرتمند بزرگ نے یہ سنا تو پسینہ پسینہ ہو گئے۔ تب حکیم صاحب نے نرمی سے کہا کہ صاحب میرے کہے کا برا مت مانئے۔ مگر آپ کا علاج یہی تھا۔ پسینہ آ گیا ہے۔ اب انشاءاللہ بخار اتر جائے گا اور بخار اتر گیا۔

اور ایسے حکیم بھی تھے جنہوں نے جتنے نسخے لکھے ان سے زیادہ غزلیں لکھیں۔ تو اب ہم انہیں اولاً حکیم جانیں یا شاعروں میں شمار کریں۔ مومن خاں بیشک طبیب تھے مگر زمانے نے انہیں طبیب کی حیثیت سے کم اور شاعر کی حیثیت سے زیادہ جانا۔ یوں نجوم ورمل میں بھی دخل رکھتے تھے۔ اور ایسا ویسا دخل نہیں۔ بلکہ شاعر نہ ہوتے تو نجومی ہوتے۔ مطب میں بیٹھے بیٹھے دیوار پہ چپکی چھپکلی پہ نظر ڈالی اور بولے "یہ اپنے نر کا انتظار کر رہی ہے۔ نر شمال کی جانب سے آئے گا۔"

ابھی یہ کہتے تھے کہ ایک پٹھان سر پہ کپڑے کے تھانوں کا گٹھر رکھے نمودار ہوا۔ تھان کھول کھول کر حکیم صاحب کو دکھانے لگا کہ کوئی کپڑا پسند آ جائے تو خرید لیں۔ ایک تھان جو کھولا تو اس میں سے ایک چھپکلی پھدک کر نکلی اور تیزی سے دیوار پہ چڑھ کر اس چھپکلی کے پاس پہنچی جو وہاں کتنی دیر سے چپکی ہوئی تھی۔ پھر دونوں تیزی سے دیوار سے چھت کی طرف چلیں اور غائب ہو گئیں۔

حکیم آغا جان عیش طبیب بھی تھے اور شاعر بھی۔ کہنے کو شاہی طبیب تھے مگر قلعہ میں کم اور قلعہ کی دیوار کے آس پاس منڈلاتے زیادہ نظر آتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس دیوار تلے ایک مجذوب شاہ بھورے نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ یہ ان کے مرید تھے۔ شاعر تھے اور ساتھ میں دگی باز بھی۔ بھرے مشاعرے میں غالبؔ کو

مخاطب کر کے یہ قطعہ پڑھ ڈالا ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزہ کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

شاعر ایسے کہ بارہ دیوان موٹے موٹے مرتب کر ڈالے۔ مگر چھپائے بیٹھے رہے۔ مرتے وقت بیٹے کو وصیت کر گئے کہ کلام نہ تو چھپوانا نہ کسی کو دکھانا نہیں تو قیامت میں دامنگیر ہوں گا۔

شاعری کے حساب میں کس کس کا نام گنایا جائے۔ لگتا ہے کہ یہ تو تھا ہی شاعروں کا شہر۔ اور شاعر بھی کیسا کیسا۔ میر تقی میر۔ شاعر جتنے بڑے اتنے ہی نک چڑھے۔ کسی نے پوچھا میر صاحب اس زمانے میں شاعر کون کون ہیں۔ کہا ایک تو سودا' دوسرا یہ خاکسار۔ رکے' پھر بولے' آدھے خواجہ میر درد۔ کسی نے میر سوز کا نام لیا۔ تیوری چڑھا کر کہا کہ اچھا میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں۔ پھر تھوڑا نرم پڑے اور بولے چلو پاؤ شاعر وہ بھی سہی۔ یوں انہوں نے اپنے پورے عہد کو پونے تین شاعروں میں سمیٹ دیا۔

میؔر غزل میں یکتا۔ سودا قصیدہ اور ہجو میں لاثانی۔ ایک کا کلام آہ' دوسرے کا کلام واہ۔ اور سودا کے یہاں قصیدہ واہ تو ہجو واہ واہ۔ جہاں کسی سے برہم ہوئے خدمت گذار کو کہ نام اس کا غنچہ تھا پکارتے ''غنچہ' لانا ذرا میرا قلمدان۔'' غنچہ نے قلمدان لا کر سامنے رکھا۔ یہ حضرت قلم اٹھا کر شروع ہو گئے ع

چل مرے خامے بسم اللہ

ایسی ہجو لکھتے کہ حریف منہ چھپاتا پھرتا۔ مگر کوئی لازم نہیں تھا کہ حریف ہمعصروں ہی کی ہجو لکھیں۔ آتے جاتے ایک نکڑ پہ ایک بھٹیاری کو دیکھتے اور اس کی الھڑ بیٹی کو جو ہمیشہ اس سے تو تو میں میں کرتی رہتی۔ ایک دن اسی کی شان میں رواں ہو گئے ؎

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے
نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنٹر پیلے

یہ ہجو جب افراد کے جھمیلے سے نکلی اور معاشرہ اس کا موضوع بنا تو وہ شہر آشوب بن گئی۔ ہجو میں افراد کا پردہ چاک کیا جاتا تھا۔ شہر آشوب میں پورے معاشرے کا پردہ چاک ہوتا نظر آتا ہے۔

رہے میر درد تو بیشک میر کے حساب سے آدھے شاعر ہی ہوں مگر کیا خوب بزرگ تھے۔ کیسے وضع

کے پکے اور کیسے اپنے حال پہ صابر و شاکر۔ جب دلی کا نقشہ ابتر ہوا تو دلی کا اچھا اچھا شاعر اور بڑا بڑا اینٹھے خاں شہر چھوڑ کر لکھنؤ کی طرف نکل گیا۔ یہ اپنے ٹھئے پہ جمے بیٹھے رہے۔

اور میر سوز۔ میر صاحب انہیں پاؤ شاعر بتاتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے انہیں اردو شاعری کا شیخ سعدی کہا۔ تشبیہ استعارہ اور فارسی ترکیبوں سے کنارہ کیا۔ سادہ و آسان بیان کو شعار کیا۔ پھر شعر کے ساتھ شعر خوانی کا ایسا ڈھنگ نکالا کہ شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا۔ ایک محفل میں ایک قطعہ پڑھا ؎

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے
سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفلِ پری رُو
ارے رے رے ارے رے رے ارے رے رے

چوتھا مصرعہ پڑھتے پڑھتے پنچی کھائی اور ڈھیر ہو گئے۔ لوگ سمجھے کہ جان سے گئے۔

شاعروں میں کوئی میر تھا کوئی مرزا۔ مرزا سودا تو خیر ہوئے۔ مگر اسی زمانے میں مرزا جان جاناں مظہر بھی تھے۔ باپ مرزا جان۔ بیٹا جان جاناں۔ تخلص مظہر۔ شاعری اور تصوف دونوں ہی باتوں سے شغف تھا۔ تیس برس تک مدرسوں اور خانقاہوں میں جھاڑو دیتے رہے۔ بس اسی میں پہنچے ہوئے بزرگ بن گئے۔ مریدوں میں مسلمان بھی تھے۔ ہندو بھی تھے۔ حسن و جمال کے قدر دان تھے۔ بلکہ حسن پرستی گھٹی میں پڑی تھی۔ شیر خوارگی کے زمانے میں یہ عالم تھا کہ خوبصورتوں کی گود میں ہمک کر جاتے تھے۔ بدصورت کی گود سے بدکتے تھے۔

مریدوں میں ایک تھے میر عبدالحی تاباں۔ کیا خوب شاعر تھے اور کیا خوب جوانِ رعنا تھے کہ یوسف ثانی کہلاتے تھے۔ سدا سیاہ لباس پہنتے۔ گوری رنگت سیاہ پوشاک کے ساتھ کیا خوب بہار دکھاتی۔ اوپر سے ایسی شاعری ؎

جب پان کھا کے پیارا گلشن میں جا ہنسا ہے
بے اختیار کلیاں تب کھلکھلائیاں ہیں

مگر یہ شاعر خوب رو بھری جوانی میں اپنے مداحوں قدر دانوں کو داغ جدائی دے گیا۔

اور مرزا جانجاناں مظہر کے ساتھ کیا گذری۔ آدمی صوفی صافی۔ عقیدہ اور مسلک یوں بیان ہوا ؎

ہوں تو سنی پر علی کا صدقِ دل سے ہوں غلام
خواہ ایرانی کہو تم خواہ تورانی مجھے

انجام اس صوفی منش شاعر کا اس طرح ہوا کہ ساتویں محرم کی شب کوئی شخص مرید بن کر آیا اور قرابین ایسی ماری کہ گولی سینے کے پار ہوگئی۔ اپنا شعر زبان پر آیا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طنیت را

یہی شعر کہتے کہتے دنیا سے سدھار گئے۔ گھر ہی میں دفن کیے گئے۔ پھر وہ گھر خانقاہ بن گیا۔

شاعروں کی یہ نسل اپنی آن بان دکھا کر رخصت ہوئی تو ایک اور نسل دندناتی آ گئی۔ ان شاعروں کا اپنا ٹھسا اپنی وضع تھی۔ قلعہ میں استاد ذوق کا سکہ چلتا تھا۔ قلعہ سے باہر غالب کا طوطی بولتا تھا۔ مومن خاں کی اپنی آن بان تھی۔ غزل کی ان کی اپنی شان تھی۔

پھر نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، مفتی صدر الدین آزردہ، امام بخش صہبائی۔ کیسا کیسا شاعر، کیسا کیسا جید عالم اپنے اپنے مقام پہ جما بیٹھا تھا۔

بانکے، انوکھے نرالے

آدھا سر منڈا ہوا۔ آدھے سر پر بالوں کا یہ حال کہ پٹا لٹک کر کانوں تک آ گیا ہے۔ کسی نے پٹے کو اسی طرح لٹکنے دیا۔ کسی نے اسے چوٹیا کی طرح گوندھ کر سینے پر ڈال لیا۔ کسی کی ایک مونچھ صاف، دوسری مونچھ اتنی لمبی کہ اس کا سرا ہی نہیں مل رہا ہے۔ ہر پائیجامہ بڑے بڑے پائینچوں والا مگر اس ڈھب کا کہ ایک پائینچہ گھٹنوں تک آ کر رہ گیا ہے، دوسرا اتنا نیچا کہ پیروں کے ساتھ زمین پر گھسٹتا چلا جا رہا ہے۔ ہاتھ میں دو دھار والا تیغہ یا ہنومان جی کے مگدر کی طرح کا بھاری مگدر۔ اچھے خاصے عوج بنوق بنے چلے جاتے ہیں۔ مگر مجال ہے کہ کوئی انگلی اٹھائے۔ انگلی کیا، اس کا سر بھی سلامت نہیں رہے گا۔ یا الٰہی یہ کون مخلوق ہے ؎

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کونسی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

بستی وہی جس کے متعلق میر نے خبردار کیا تھا ؎

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میرؔ
اور بستی نہیں یہ دلی ہے

اور یہ لوگ دنیا سے نرالے بانکے ہیں۔ دلی کے سوا کسی اور بستی میں اگر نظر آئیں تو سمجھ لیجئے کہ وہ لکھنؤ ہے۔ وہاں کے بانکوں کی سج دھج سرشار سے سنیئے:

''ترچھا تیکھا چنت دار انگرکھا پہنے، نکے دار کٹی ہوئی ٹوپیاں سر پر جمائے ڈھاٹا باندھے چلے جاتے ہیں۔ تینچے کی جوڑی کمر سے لگی دو دو ولائتیاں باندھے

چلے جاتے ہیں۔ قرابچہ، پیش قبض، کٹار، سروہی، شیر بچہ سب سے لیس خاصے او پچی بنے ہوئے۔"

آخر یہ کون لوگ تھے۔ ان کا آگا پیچھا کیا تھا۔ مولانا عبدالحلیم شرر کا خیال ہے کہ "دربارِ دہلی میں بکثرت قندھاری آآ کر فوج میں نوکر ہوتے۔ وہ لوگ چونکہ بہادر سمجھے جاتے اس لیے یہاں کے عام سپہ گروں میں ان کی وضع، لباس اور عادات وخصائل رواج پانے لگے۔ اور یہ انہیں کی برکت اور صحبت کا اثر تھا کہ دہلی میں بانکے بڑے بڑے کلیوں دار پائینچوں کے پاجامے پہنتے تھے۔ دہلی کے آخری عہد میں بانکوں کی وضعداری اور شجاعت اس قدر پسندیدہ ہوگئی کہ صدہا شریف زادوں نے بانکوں میں داخل ہوکے ان کی وضع اختیار کرلی اور شرفا جن میں اکثر اعلیٰ وضع پر تھے سب بانکے بنے ہوئے تھے۔"

خیر جو بھی ان کی اصل ہو تھے وہ اپنی وضع کے لوگ۔ آن پہ مرمٹنے والے، غریبوں ناداروں کے خیر خواہ، بے سہاروں کا سہارا، بیکسوں کے حامی و مددگار۔ وعدے کے پکے ایسے کہ وعدہ کرلیا تو بیشک جان چلی جاتی وعدہ پورا کر کے دکھاتے۔ جب ہی تو ان پر بہت اعتبار کیا جاتا تھا۔ اپنی ضرورت ہو یا کسی غریب محتاج کی ضرورت ہزاروں کا قرض مونچھ کے ایک بال کی ضمانت پر حاصل کر لیتے تھے۔ اور مہاجن کے لیے بانکے کے مونچھ کے ایک بال کی ضمانت امرا و رؤسا کی بڑی بڑی ضمانتوں سے بڑھ کر تھی۔ ایک بدمعاش نے ایک بانکے کو اپنی مونچھ کا ایک بال مہاجن کے پاس رکھ کر قرض لیتے دیکھا تو اس نے سوچا کہ یہ تو رقم اینٹھنے کا اچھا طریقہ ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد بانکوں کی سج دھج بنا کر اس مہاجن کے پاس پہنچا۔ مونچھ کا ایک بال اکھاڑ کر سامنے رکھا۔ کہا کہ یہ بال رہن رکھ لو اور مجھے تھوڑی رقم دلواؤ۔ مہاجن نے شک بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر بال کو الٹ پلٹ کر کہا کہ یہ بال تو ٹھیک نہیں ہے۔ بدمعاش نے جھٹ مونچھ سے دوسرا بال اکھاڑا اور کہا کہ لو یہ بال تو ٹھیک ہے۔ مہاجن پھر بھی مطمئن نہ ہوا تو اس نے مونچھ کے کئی بال اکھاڑ کر سامنے رکھ دیئے اور کہا کہ جو بال تمہیں ٹھیک نظر آئے وہ رہن رکھ لو۔

تب وہ مہاجن بولا کہ پتہ چل گیا کہ تو بانکا نہیں ہے۔ تو سچ مچ بانکا ہوتا تو جب میں نے پہلے بال کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا اسی وقت تیری تلوار نیام سے نکل آتی اور میرا سر قلم کر دیتی۔

بانکے سب سے زیادہ زوروں میں محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں تھے۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب سلطنت کا نقشہ ابتر تھا۔ قانون جیسے معطل ہوگیا ہو۔ نظم وضبط ختم تھا۔ شرفا کو اپنی عزت سنبھالنا مشکل ہورہا تھا۔ ایسے میں بانکوں نے اپنا فرض خوب ادا کیا۔ مشکل وقت میں شرفا کی وہی مدد کرتے تھے۔ اور شریف

زادیوں کی عزت و ناموس کے لیے مر مٹتے تھے۔ ایک محلّہ میں چند بدمعاشوں نے یہ وطیرہ اختیار کیا کہ گذرتی ڈولیوں پر چھاپے مارتے۔ ڈولی میں سوار شریف زادی کا گہنا پاتا اتروا لیتے۔ کبھی کبھی گہنوں کے ساتھ گہنوں والی کو بھی اغوا کر لیتے۔ ایک ہی گھرانے کے تین بھائیوں نے اس کاروبار میں بہت شہرت حاصل کی۔ تینوں چھنٹے بدمعاش۔ کسی کی کیا مجال کہ انہیں ٹوکے۔ ایک بانکے نے جب یہ خبر پائی تو ان بدمعاشوں کو ٹھکانے لگانے کا بیڑا اٹھایا۔ ایک روز بانکے میاں نے زنانہ لباس پہنا' زیور پہنے' ساتھ میں ہتھیار بھی سجا لیے۔ ڈولی میں بیٹھے اور کہا کہ فلاں محلّہ کی فلاں گلی سے گذرنا ہے۔ کہاروں نے ہچر مچر کی۔ بانکے میاں نے تھوڑی دھونس دی' تھوڑا پیسوں کا لالچ دیا۔ کہار تیار ہو گئے۔

ڈولی جب اس گلی سے گذری تو بدمعاشوں نے زیوروں سے بھرا ہاتھ ڈولی سے نکلا دیکھا۔ بس فوراً ہی ڈولی پر ٹوٹ پڑے۔ بانکے نے ڈولی سے نکل تلوار سونت لی اور دم کے دم میں تینوں کو ٹھنڈا کر دیا۔

محلّہ والوں نے خوب واہ واہ کی۔ خبر اڑتے اڑتے محمد شاہ رنگیلے تک پہنچی۔ بادشاہ نے فوراً طلب کیا۔ بانکے میاں اسی نسوانی لباس میں جس میں انہوں نے یہ معرکہ مارا تھا دربار میں پہنچے۔ بادشاہ نے انہیں انعام واکرام سے نوازا اور کہا کہ اب یہ عورتوں والا لباس اتار دو۔ بانکے میاں نے کہا کہ حضور گستاخی معاف' اب تو یہی لباس چلے گا۔ تو بانکے میاں عورتوں والے ہی لباس میں رہنے لگے۔ لوگوں نے انہیں بیگم کہنا شروع کر دیا۔ اور بانکے میاں اب بانکے میاں سے بانکے بیگم بن گئے۔

جب نادر شاہ نے دلی پر چڑھائی کی اور شاہی فوج پسپا ہو گئی تو بادشاہ کو بیگم کی یاد آئی۔ حیران کہ سلطنت پہ اتنا بھاری وقت ہے اور بیگم کا کوئی اتا پتہ ہی نہیں۔ تب بادشاہ کو بتایا گیا کہ بیگم نے اس معرکہ میں لڑ کر جان دے دی۔ بادشاہ کو بہت افسوس ہوا۔

بیگم کو معرکہ میں کام آنا ہی تھا۔ بانکے تلوار کے قائل تھے۔ ذرہ اور ڈھال کے مطلق قائل نہیں تھے۔ ان کا اصول یہ تھا کہ دشمن کا وار سینے پہ ہو۔ ڈھال اور ذرہ مردانہ غیرت کے خلاف چیزیں ہیں۔

لکھنؤ کے بھی ایک بانکے کا احوال سن لیجیے۔ یہ تھے بانکے جہانگیر بیگ۔ زمانہ تھا نواب سعادت علی خاں کا۔ بانکے کی حرکتوں کی خبر نواب تک پہنچی تو انہوں نے جہانگیر بیگ کے باپ کو بلا کر اس کے بانکے بیٹے کی شکایت کی۔

باپ نے گھر آ کر نواب کی شکایت زوجۂ محترمہ کو سنائی اور بیٹے پر بہت بگڑے۔ اور کہا کہ اس نالائق نے ہماری ناک کٹوا دی۔ اور ساتھ ہی نواب سعادت علی خاں کا فقرہ دہرایا جنہوں نے غصے میں آ کر

کہا تھا کہ "بیٹے سے کہہ دو کہ اپنے بانکے پن پر زیادہ نہ اترائے۔ میں اس کی ناک کٹوا دوں گا۔"

بگڑے دل بانکے نے جواب میں تلوار نیام سے نکالی اور ایک وار کر کے اپنی ناک کاٹ لی۔ ناک اٹھا کر باپ کے سامنے ڈال دی "ابا حضور، نواب صاحب آپ کو دھمکی دیتے تھے۔ ہم نے خود ہی اپنی ناک کاٹ لی۔ لیجئے ناک حاضر ہے۔" اور اس کے ساتھ اپنی کٹی ناک باپ کی طرف اچھال دی۔

بس اس روز سے وہ بانکے نکٹے مشہور ہو گئے۔

تو یہ تھیں بانکوں کی روایات۔

جن و پری، پیر فقیر

بچہ جنے چھ دن ہو گئے۔ سو اب چھٹی کی دھوم دھام ہے۔ ڈھولک بج رہا ہے۔ مبارکبادیاں گائی جا رہی ہیں ؂

نورنگ جوڑے والیاں میری بچّارانیاں
سوہا جوڑا پہن سہاگن موتی بھری مانگ
نورنگ جوڑے والیاں

دن گذر گیا۔ اب چھٹی کی رات ہے۔ زچہ کے تارے دیکھنے کی رسم ادا ہوگی۔ زچہ اور بچہ دونوں کا بناؤ سنگھار کیا گیا۔ زچہ بچے کو گود میں لے کر صحن میں آئی۔ چوکی پر کھڑی ہوئی، اس شان سے کہ سر پر قرآن دھرا ہے، گود میں بچہ ہے۔ دائیں بائیں دو عورتیں ننگی تلواریں لیے کھڑی ہیں۔ دائی آٹے کی چومک اٹھائے آگے آگے چلتی ہوئی چوکی تک آئی تھی۔ اب الگ کھڑی ہے۔ زچہ نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور سات ستاروں کی گنتی کی۔ دائیں بائیں کھڑی عورتوں نے تلواروں کی نوک سے نوک ملا کر زچہ کے سر پر قوس بنائی۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ مطلب یہ کہ اب کوئی جن، کوئی پری اوپر سے نہیں گذر سکے گی۔ تلواروں کا سایہ ہے۔ اب جن و پری کا سایہ نہیں پڑ سکتا۔

اس رسم سے اندازہ لگا لیجیے کہ اس تہذیب میں جن و پری کا کتنا چرچا تھا۔ ان کے سائے سے بچنے کے لیے کیسے کیسے جتن کیے جاتے تھے۔ مگر یہ سایہ پھر بھی تعاقب کرتا رہتا تھا۔ کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ کس پر کب کوئی جن آ جائے اور کب کسی پری کا سایہ پڑ جائے۔ میر کا بچپن سلامت گذرا۔ مگر بڑی عمر میں جا کر دماغ چل بچل ہوا اور چاند میں پری کی شکل نظر آنے لگی ؂

نظر آئی اک شکل مہتاب میں
کمی آئی جس سے خورو خواب میں

جنات کا بھی یہاں بہت چرچا تھا۔ اور لازم نہیں تھا کہ جن ہمیشہ ستانے ہی کے لیے آئے۔ بھلے جنات بھی تو ہوتے تھے۔ ایک مغلانی بی نے کہ سینے پرونے میں بہت مہارت رکھتی تھیں اپنی واردات یوں سنائی کہ اے بی مجھ کال کھاتی کو کیا پتہ تھا کہ کون لوگ مجھے لینے کے لیے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے گھر شادی ہو رہی ہے۔ دلہن کے جوڑے سلنے ہیں۔ ڈولی لے کے آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ چلو۔ میں ایسی بلتلی کہ پوچھا ہی نہیں کہ اے بھیا تم کون ہو' کہاں سے آئے ہو۔ بے پوچھے گچھے ڈولی میں سوار ہوگئی۔ سوار ہونے کو تو ہوگئی۔ اس کے بعد مجھ پہ وہم سوار ہو گیا کہ جانے یہ کون ہیں اور مجھے کہاں لیے جا رہے ہیں۔ پردے میں سے باہر جھانکا تو چاروں طرف گھنا جنگل۔ دل دھک سے رہ گیا۔ سو طرح کے وہم۔ پھر جو میری نظر کہاروں کے پیروں پہ گئی تو میری تو جان نکل گئی۔ اے بی ان کے تو پاؤں الٹے تھے۔ ایڑی آگے پنجے پیچھے۔ موئے کمبخت یہ تو جنات ہیں۔ دل میں ہولیں اٹھنے لگیں۔ اے لو ڈولی ڈیوڑھی میں داخل ہوگئی۔ ارے وہ گھر تھا' محل تھا محل۔ ریشمیں کپڑے کے تھان میرے سامنے ڈال دیئے کہ کپڑا یہ ہے۔ دلہن کے جوڑے تیار ہونے ہیں۔ مگر انصاف کی کہوں گی۔ انہوں نے ذرا جو ستایا ہو۔ بڑے شریف جن تھے۔ چلتے وقت جوڑا بیڑا دیا' اشرفیئں دیں۔ جس ڈولی میں آئی تھی اسی ڈولی سے ساتھ عزت کے واپس کیا۔ ڈولی سے میں اتری ہوں کہ ڈولی غائب۔ کہار بھی اڑنچھو ہو گئے۔ یا اللہ انہیں آسمان نے نگل لیا یا زمین کھا گئی۔''

جن و پری کا چرچا اصل میں مردوں سے زیادہ عورتوں میں تھا۔ پریوں کے اپنے اپنے نام تھے' لال پری' زرد پری' سبز پری' سیاہ پری' آسمان پری' دریا پری' نور پری' بیبیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت سے حضرت فاطمہؓ کے لیے بھیجا تھا کہ ان کی خدمت کریں اور ان کے ساتھ کھیل کر ان کا دل بہلائیں۔

کچھ خاص ناموں والے جن تھے جنہوں نے ان بیبیوں کے بیچ بہت شہرت پائی۔ وہ یہ تھے شاہ دریا' شاہ سکندر' زین خاں' صدر جہان' ننھے میاں' چہل تن مگر سب سے بڑھ کر شہرت شیخ سدو کو حاصل ہوئی۔ اس کا ذکر سودا کی ہجویات میں بھی ملے گا۔ رنگین نے بھی اس کا حوالہ دے رکھا ہے ؎

کسی کو جی سے ہے اخلاص شیخ سدو سے
کہے ہے آپ کو ننھے میاں کی کوئی حرم

گویا شیخ سدو اور ننھے میاں کی دھوم دلی سے لکھنؤ تک تھی۔

مگر یہ جن بھوت پریت زیادہ تھے، جن کم تھے۔ سودا نے ان سے کچھ اور کام بھی کرایا ہے ۔

ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر دھرایا

تب شیخ سدو اس پر ...... کھا کے آیا

اسی ہجو میں صدر جہاں، دریا خاں، ننھے میاں اور زین خاں کے حوالے بھی مل جائیں گے۔ مگر یہاں ان کا ذکر جنسی حوالوں کے ساتھ خاصی تضحیک سے ہوا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ ارواح خبیثہ ہیں۔

جن و پری کے ساتھ بھوت پریت، چڑیل اور پچھل پائی کا چرچا بھی بہت تھا۔ اسی لیے عاملوں، پیروں، فقیروں کی بھی بہتات تھی۔ جن اتروالو، ٹوہنا ٹوٹکا کرالو۔ جادو کرالو، جوتشیوں، نجومیوں، رمالوں کی بھی بہت مانگ تھی۔

گھر میں بیٹھی ہوئی بی بی نے آواز سنی ''بھجوادے تیرا بھلا ہوگا۔'' سمجھ لیا کہ فقیر ہے۔ جواب میں پکار کے کہا ''سائیں، برکت ہے۔''

''کہتی ہے کہ برکت ہے۔'' فقیر نے دروازے پہ کھڑے کھڑے گرج کر کہا ''ساڑھے سات آنے تکیہ کے نیچے رکھے ہیں۔ فقیروں سے جھوٹ بولتی ہے۔''

بی بی کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ سوچا کہ ضرور کوئی پہنچا ہوا فقیر ہے۔ سلائی کی اجرت ساڑھے سات آنے آج ہی اسے وصول ہوئے تھے جو اس نے تکیہ کے نیچے رکھ دیئے تھے۔ ایک آنہ تکیہ کے نیچے سے نکال دروازے پہ جا کر فقیر کے ہاتھ پہ رکھا اور معذرت کی کہ میرے میاں تو نوکری پہ پردیس گئے ہیں۔ گھر میں تنگی ہے۔ زیادہ خدمت نہیں کرسکتی۔ گھر میں اکیلی ہوں۔ میں ہوں، میری بیٹی ہے۔''

یہ سن کر فقیر نے کچھ سوچا اور اپنی جھولی میں ہاتھ ڈال کر ایک تھیلی سے سوکھی ہوئی کسی درخت کی جڑ نکالی۔ اس کے دو ٹکڑے کیے۔ ان پر پڑھ کر کچھ پھونکا۔ بی بی کو دے کر کہا ''آج رات کو ان میں سے ایک جڑ کپڑے میں لپیٹ کر اپنے بازو پر اور دوسری جڑ بیٹی کے بازو پر باندھ دینا۔ سب دلدر دور ہو جائیں گے۔''

آگے فراق دہلوی سے سنو، بارہ بجے رات کو ایک آواز نے اسے جگایا ''جڑی بیچاری کیا کرے۔ تنبولوں باندھی۔'' یہ آواز ٹھہر ٹھہر کر آتی تھی اور قرینہ کہتا تھا کہ رات کے سناٹے میں دور تک جاتی تھی۔ ''جڑی بیچاری کیا کرے۔ تنبولوں باندھی۔'' یہ آواز آدمی کی آواز سے ملتی جلتی نہ تھی۔ بلکہ یہ آواز پتھر کی یا زمین کی یا کسی لکڑی کی غیر معمولی آواز تھی۔ بھیانک تھی۔ ڈراؤنی تھی۔ اس آواز کو سن کر امراؤ بیگم اور ان

کی لڑکی کا کلیجہ بیٹھا جاتا تھا۔ وہ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ آواز رہ رہ کر آتی تھی۔ ایک گھنٹہ بعد امراؤ بیگم سمجھیں کہ یہ آواز اس جڑی کی ہے جو تنبول کے پیڑ میں باندھ کر وہ بھول گئی اور اپنے اور اپنی بچی کے بازو پر نہ باندھی۔ یہ جڑی جادو کی ہے اور میں باندھ لیتی تو خدا جانے مجھ پر اس کا کیا اثر ہوتا۔ روتی جاتی تھیں اور دعا کرتی جاتی تھیں کہ الٰہی، اس گھر کا وارث بھی گھر پر نہیں۔ کوئی بھائی بند بھی یہاں نہیں ہے۔ دیکھئے کیا بنتی ہے۔

پو پھٹی۔ وہ آواز آنی بند ہوگئی۔ امراؤ بیگم دل کڑا کر کے اٹھیں۔ کوٹھری میں سے باہر آئیں۔ وضو کیا۔ صبح کی نماز پڑھی۔ ابھی یہ جانماز سے اٹھی بھی نہ تھیں کہ دروازے پر کئی محلے والے آئے اور کنڈی کھٹکھٹائی۔ یہ دروازہ پر گئیں تو محلّہ والوں نے کہا ''بی امراؤ بیگم آدھی رات سے تمہارے گھر کے اندر سے صبح تک یہ آواز آتی رہی ہے ''جڑی بیچاری کیا کرے۔ تنبولوں باندھی۔'' یہ کیا بات ہے۔

امراؤ بیگم نے کل کا سارا قصہ بیان کیا اور کہا ''میں کوٹھری میں چلی جاتی ہوں۔ تم گھر میں آ کر وہ جڑی دیکھ لو۔''

پردہ ہوگیا۔ پڑوسی گھر میں آئے اور جڑی تنبول کے پیڑ میں بندھی دیکھی اور ان لوگوں میں سے ایک بڑے میاں نے کہا ''میں اس جوگی کو پچاس برس سے جانتا ہوں۔ یہ بھوری بھٹیاری کے محل کے پاس رہتا ہے۔ بڑا جادوگر ہے۔ امراؤ بیگم اپنے یا لڑکی کے بازو پر یہ جڑی باندھ لیتیں تو باؤلی ہو کر جوگی کے پاس جاتیں۔''

دو چار دبنگ آدمیوں نے بڑے میاں سے پتہ لیا اور بھوری بھٹیاری کے محل پر پہنچے اور جوگی کی خوب دھن کٹی کی۔''

خوب لوگ تھے۔ فطرت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ مافوق الفطرت میں ایمان رکھتے تھے۔ اس ایمان نے کتنے توہمات، کتنے شگون اور بدشگنیوں کو جنم دیا تھا۔ اور کیا کیا رسمیں وجود میں آئی تھیں۔ شیخ سدو کسی عورت پر سوار ہو جاتا تو پھر اس کا اترنا دشوار ہو جاتا۔ اتارنے کے لیے بیٹھک کی جاتی۔ یعنی رات کو عورتیں مل کر گاتی بجاتیں۔ پھر بکرے کی قربانی دی جاتی۔ تب کہیں جا کر شیخ سدو ٹلتا۔ مگر دیدار پیر نیک روح تھے۔ ان کا کونڈا کیا جاتا۔ دیدار پیر بھی عورتوں ہی کے پیر تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دیدار پیر وہ پیر ہیں کہ مسافروں کو خیریت سے گھر واپس لا کر ان کا دیدار کراتے ہیں۔ تو سفر کے ساتھ رسم یہ وابستہ تھی کہ جانے والے کے دائیں بازو پر امام ضامن کا روپیہ قند میں لپیٹ کر باندھا جاتا۔ ماتھے پر دہی کا ٹیکہ لگایا جاتا۔

بادیئے میں کڑوا تیل بھر کے رکھا جاتا۔ مسافر تیل میں اپنی صورت دیکھتا۔ اڑو کے چار دانے ڈالتا۔ یہ تیل حلال خوری کو دے دیا جاتا۔ صدقے کے ٹکے غریبوں میں تقسیم کر دیئے جاتے۔ پھر دیدار پیر کا کونڈا کیا جاتا۔ یعنی نذر جلیبیوں پر یا زردے پر یا شکرانے پر۔

پیروں فقیروں کے ساتھ ساتھ جوتشیوں نجومیوں کی بھی پوچھ تھی۔ کیا راجہ کیا پرجا' کیا بادشاہ سلامت کیا عوام الناس جوتشیوں نجومیوں کی ہر جگہ مانگ تھی۔ اور یہ آج کی بات تھوڑا ہی تھی۔ صدیوں سے اس نگر میں یہی ہوتا چلا آ رہا تھا۔ ہندو راجا تو جوتشی سے مشورہ کیے بغیر ایک قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ ان کا کہا پتھر کی لکیر تھا۔ جس نے ان پر اعتبار کرنے میں تامل کیا وہ مارا گیا۔ پرتھی راج کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ پہلے اس نے جوتشیوں کی بد یا پر ایسا اعتبار کیا کہ ان کے کہے پر جہاں انہوں نے کہا وہاں لوہے کی لاٹھ گڑوا دی مگر اس کے بعد اسے بے اعتباری نے آ گھیرا۔ اسی میں مارا گیا۔ یہی بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہوا۔ منجموں نے خبردار کیا تھا کہ ابھی رات ہے اور اندھیرا ہے۔ یہ تاریک ساعتیں تخت نشینی کے لیے مبارک نہیں ہیں۔ مگر وہاں تخت پر بیٹھنے کی عجلت تھی۔ آخر کو منجم ہی سچے نکلے۔ بدشگنیاں ہوتی چلی گئیں حتیٰ کہ 1857ء میں قیامت ٹوٹ پڑی ایسی کہ نہ تخت رہا نہ تاج رہا۔

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا

دلی نے ایک زمانے کے بعد سکھ کا سانس لیا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے تو ایسا لگتا تھا کہ دلی اب دلی نہیں' خانۂ انوری ہے۔ بلاؤں نے گھر دیکھ لیا تھا۔ جس مہم جو کو جھرجھری آئی وہ منھ اٹھا بگٹٹ دلی پر چڑھ دوڑا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کبھی نادر گردی' کبھی مرہٹوں کی دھما چوکڑی۔ بس یہی ہوتا رہا۔ انگریزوں سے معاملہ کے بعد قیمت اس کی جو بھی ادا کرنی پڑی ہوا اتنا تو ہوا کہ بادشاہ اور دلی دونوں ہی نے سکھ کا سانس لیا۔ دلی والے اس زمانے کو امی جمی کا زمانہ جانتے تھے۔ تو دلی والوں نے امی جمی کے دن دیکھے تو اگلی پچھلی کلفتوں کو دم کے دم میں بھول گئے۔ زندگی کی رونقیں کتنی جلدی واپس آ گئیں۔ چاندنی چوک' چاوڑی' چوک جامع مسجد' جمنا کا پل جہاں دیکھو سیلانیوں کے جمگھٹے' چھیل چھبیلوں کا ہجوم۔ ان سے ہٹ کر شعر و شاعری کا بازار گرم تھا۔ مشاعرے' داستان گوئی کی محفلیں۔ یہ نہیں تو پھر دیوان خانوں میں شطرنج کی بساط بچھی ہے یا گنجفہ ہو رہا ہے یا بزم نغمہ و ادب سجی ہے۔ اس وقت کون قیاس کر سکتا تھا کہ یہ جہان آباد کی آخری بہار ہے۔

مگر غالب نے کسی دوست کو خط لکھتے لکھتے قلعہ کے مشاعروں پر عجب تبصرہ کیا "میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں' کبھی نہیں جاتا۔ اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں۔ کیا معلوم ہے اب ہی نہ ہو۔ اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔"

اصل میں فضا میں اب کچھ درہمی نمودار ہو چلی تھی۔ دلی والوں نے اتنے انقلابات دیکھے تھے کہ ان کی حس بہت تیز ہو گئی تھی۔ ان کا وجدان کہہ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ شگون کے ویسے ہی بہت قائل تھے۔ زمین و آسمان پر ظاہر ہونے والے آثار سے شگن لیتے رہتے تھے' نیک بھی اور بد بھی۔ مگر اب تو انہیں

بدشگنیاں ہی بدشگنیاں دکھائی دیتی تھیں۔ دلی کے آسمان پہ انہیں دنوں کہیں ایک دمدار ستارہ دکھائی دیا۔ دلی والوں کے دل دھڑ دھڑ کرنے لگے۔ سو سو طرح کے وہم۔ اور غالب نے ایک دوست کو خط میں لکھا:

''اب ضرور آ پڑا ہے کہ کچھ حال اس ستارۂ دمدار کا لکھوں۔ جب زمانے کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تب سطح فلک پر یہ شکلیں دکھائی دیتی ہیں' جس برج میں یہ نظر آئے اس کا درجہ و دقیقہ دیکھتے ہیں' ہزار طرح کی چال ڈالتے ہیں تب ایک حکم نکالتے ہیں۔ شاہجہاں آباد میں بعد غروبِ آفتاب افقِ غربی شہر پر نظر آتا تھا۔ اور چونکہ ان دنوں میں آفتاب اول میزان میں تھا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ صورتِ عقرب میں ہے۔ درجہ و دقیقہ کی حقیقت نامعلوم رہی۔ بہت دن شہر میں اس ستارے کی دھوم رہی۔ اب دس بارہ دن سے نظر نہیں آتا۔

بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہرِ الٰہی کی ہیں اور دلیلیں ملک کی تباہی کی۔ قرِان النحسین۔ پھر کسوف' پھر نسوف' پھر یہ صورتِ پر کدوَت۔ عیاذاً باللہ و پناہ بخدا۔''

حکیم آغا جان عیش کے مرشد شاہ بھورے کہ قلعہ کی فصیل تلے ڈیرا ڈالے پڑے تھے۔ دنیا سے سدھار چکے تھے۔ اب اس مزار کے پاس ایک مجذوب نے ڈیرا ڈالا تھا۔ اس نے عجب طور اپنایا تھا۔ خالی رکابیوں کی ایک ڈھیری پاس پڑی رہتی۔ وہ بار باران خالی رکابیوں کو ایک کے اوپر ایک چنتا چلا جاتا۔ پھر ہاتھ مار کے گراتا اور چلاتا ''وہ لال قلعہ گرا دیا' ڈھا دیا۔''

ایک ماجرا ظہیر دہلوی نے دیکھا اور بیان کیا ''ایک روز میں پایہ والوں میں ایک کتب فروش کی دکان پر بیٹھا ہوا کتابوں کی سیر کر رہا تھا کہ یکا یک ایک بزرگوار لحیم شحیم دراز قامت' فربہ اندام' دراز ریش سیہ فام' کڑبڑی ڈاڑھی' ساٹھ برس کا سن وسال۔ ڈھیلا انگرکھا' شرعی پائجامہ' گول ٹوپی ہاتھ میں عصا۔ گلے میں تسبیح ڈالے وارد ہوئے۔'' آتے ہی قرآن مجید طلب کیا۔ پیش کیے جانے پر فوراً ہی تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ ایک رکوع ختم ہوا ہوگا کہ ان پر حالت جذب طاری ہوئی۔ ''آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ چہرہ تمتما گیا' گردن کی رگیں پھول گئیں اور حالتِ غیظ و غضب میں بازار کی جانب ہاتھ اٹھا کر فرمانے لگے' ایلو' ایلو' وہ مار ڈالا' وہ مار ڈالا۔ وہ پھانسی دے دیا' وہ پھانسی دے دیا۔ واہ واہ' کیا خوب تماشا ہے۔ ایک کو ایک مارے ڈالتا ہے۔ ایک کو ایک پھانسی دے رہا ہے۔ اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اور بار بٹن صاحب بیٹھے ہوئے تماشا دیکھ رہے

ہیں۔ یہ الفاظ فرما کر حافظ صاحب خود ہی فرمانے لگے۔ بس خاموش رہو۔ تم کو کس نے اذن دیا ہے کہ تم اسرارِ الٰہی فاش کرو۔ یہ کہہ کر حافظ صاحب نے گردن نیچے جھکالی اور پھر تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ ایک رکوع پڑھ کر پھر وہی حالت طاری ہوگئی اور دوبارہ پھر انہیں الفاظ میں وہی کلمات سابق ادا فرمائے۔''

تیسری بار پھر یہی ہوا۔ مگر پھر اس بزرگ پر سکوت طاری ہوگیا۔ کلام پاک کو بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا' سر پر رکھا۔ پھر ظہیر دہلوی کے حوالے کیا۔ حوالے کرتے کرتے بولے ''تم شہر میں بیٹھے ہوئے کیا کرتے ہو۔ باہر جواڑے کی سیر کیا کرو۔'' اسی کے ساتھ ایک مطالبہ ''عزیز' میرے واسطے پراٹھے اور میتھی کا ساگ پکوا کر لانا۔''

یہ کہہ کر اٹھے اور یہ جا وہ جا۔ کچھ پتہ نہیں چلا کہ یہ کون بزرگ تھے اور کیسے نظروں سے ایسے اوجھل ہوئے کہ پھر کبھی نظر ہی نہیں آئے۔

قلعہ میں ایک مشاعرہ ہوا۔ ایک مجذوب شاعر بھی ادھر آنکلا۔ دیکھا کہ ابھی مشاعرہ شروع ہونے میں دیر ہے۔ کہا کہ میں تو اپنا کلام سنائے دیتا ہوں۔ آگے تم جانو۔ غزل پڑھی جس کی ردیف تھی کچھ بھی نہیں۔ آخری شعر تھا ۔

شمع بھی گل بھی ہے بلبل بھی ہے پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں

اہل محفل کو سلام کیا اور کچھ بھی نہیں' کچھ بھی نہیں کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

ایک درویش صفت شخص تلاوت کلام پاک کرتے ہوئے ٹھٹھکا اور چلانے لگا ''ظالموں نے مار ڈالا' مار ڈالا۔''

ایک اجنبی شہر میں وارد ہوا۔ ہتھیلی کے برابر دو تولہ وزن کی ایک چپاتی ایک بھلے مانس کے ہاتھ میں پکڑائی اور ہدایت کی کہ پانچ ایسی ہی چپاتیاں پکا کر برابر کی بستی میں بھجوا دو۔ اس بھلے مانس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کیسی چپاتی ہے اور پانچ ایسی چپاتیاں برابر کی بستی میں بھجوانے کی کیا لم ہے۔ اس نے کسی دوسرے سے ذکر کیا۔ دوسرے نے تیسرے سے۔ تیسرے نے چوتھے سے۔ بس اسی میں یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی اور اسی کے ساتھ پورے شہر میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ اجنبی کون تھا اور کہاں گیا۔ مگر جو لوگ تھوڑی بہت خبر رکھتے تھے ان کا ماتھا ٹھنکا۔ اور اس کے ساتھ ہی افواہوں کا بازار گرم ہوا۔ ان افواہوں نے اس وقت اور زور پکڑا جب جامع مسجد کی دیوار پر ایک بڑا اشتہار چپکا نظر آیا۔ اشتہار پر ڈھال

اور تلوار کی شکل بنی تھی اور اعلان کیا گیا تھا کہ ایران مسلمانوں کو فرنگیوں سے آزاد کرانے کے لیے پہنچنا چاہتا ہے۔ بس اس کے فوراً بعد ایک افواہ گرام ہوئی کہ ایرانی لشکر درۂ بولان کے راستے مارا مار کرتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ روس اس کی کمک پہ ہے۔

اسی ہنگام رمضان کا مہینہ لگ گیا۔ وہ منجھلا روزہ تھا۔ دیرینہ دستور کے مطابق دن ڈھلے افطاری کے خوان سر پہ دھرے چوبدار قلعہ سے نکلے اور چلے جامع مسجد کی طرف۔ ناگہاں بہت سی چیلیں آسمان پر نمودار ہوئیں۔ انہوں نے خوانوں پر ایسا جھپٹا مارا کہ سب خوان اوندھ گئے۔ افطاری زمین پہ بکھر گئی۔

کتنی بڑی بدشگنی تھی۔ جس نے سنا حق دق رہ گیا۔ نیک بیبیوں نے دوپٹے کا آنچل پھیلا کر دعائیں مانگنی شروع کر دیں۔ الٰہی قلعہ معلّی کی خیر ہو۔ ہمارے صاحب عالم کو سلامت رکھیو۔

مگر کیسی خیر اور کہاں کی سلامتی۔ ایک بی بی کو اس واقعہ سے پچھلی رات کا اپنا مشاہدہ یاد آ گیا۔ ''اے بی، کل ہی کی تو بات ہے۔ سحری کھا کے میں انگنائی میں آئی تو اوپر نظر گئی۔ اے بی سچ جانیو سارا آسمان لال بوٹی کی طرح ہو رہا تھا۔ میرا تو دل دھک سے رہ گیا۔''

سننے والی بڑی بی نے ٹھنڈا سانس بھرا بولیں ''بی بی یہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ روز کوئی بدشگنی ہو جاتی ہے۔ اللہ دلی کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔''

مگر بدشگنیوں کے بیچ کوئی شگن بھی نکل آتا تھا۔ ایک بہشتی کو عجب طرح کا خواب دکھائی دیا۔ خواب کیا تھا دلی والوں کے حساب سے بشارت تھی۔ خواب اس نے یوں بیان کیا کہ جیسے میں جامع مسجد کے چوک میں کھڑا کٹورا بجار ہا ہوں اور پیاسوں کو پانی پلا رہا ہوں۔ اتنے میں اذان کی آواز کان میں آئی۔ میں لپک جھپک مسجد کے اندر گیا۔ نماز پڑھی اور جلدی سے واپس ہوا۔ سیڑھیاں اتر رہا ہوں تو جیسے کوئی کہہ رہا ہے ''پیاسا ہوں۔ کوئی اللہ کا بندہ ہے کہ مجھے ایک گھونٹ پانی پلا دے۔'' میں مڑ کر ادھر ادھر نظر ڈالتا ہوں۔ سیڑھیاں خالی۔ کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔ میں حیران کہ یا اللہ یہ کون تھا جو پانی مانگ رہا تھا۔ اچانک میری نظر حضرت سرمد شہید کے مزار پہ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس کے بیچ سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ میں ادھر کھنچا چلا گیا۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ قبر سے ایک ہاتھ نکلا ہوا ہے۔ اس میں ایک چمچماتا چاندی کا کٹورا۔ میں اپنی مشک کا دہانہ کھول کے اس میں پانی انڈیلتا ہوں۔ ہاتھ معہ کٹورے کے غائب۔ آن کی آن میں قبر سے ہاتھ پھر باہر آتا ہے کٹورے سمیت۔ کٹورا خالی ہے جیسے پانی کسی نے پی لیا ہو۔ مگر اس میں دو اشرفیاں پڑی ہیں۔ میں اشرفیاں لے لیتا ہوں مگر جیسے کہہ رہا ہوں کہ میں غریب آدمی۔ اشرفیوں کو بازار میں لے کے گیا

تو دکاندار سو طرح کے شک کریں گے۔ یہ سوچتا تھا کہ ایک آواز کان میں آئی۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہے کہ ان اشرفیوں کے طفیل تو بادشاہ کے حضور جائے گا۔ بادشاہ سے کہہ دیجیو کہ میں نے اپنا خون معاف کیا۔ انصاف سے حکومت کر۔ بے گناہوں کا خون بہانے سے پرہیز کر۔"

کیا خوب خواب تھا کیا نیک بشارت۔ حضرت سرمد شہید نے سلطنت کی بقا کی گارنٹی دے دی۔ ادھر شاہ نعمت اللہ ولی کی ایک پیشگوئی کا بہت چرچا ہو رہا تھا۔ پیشگوئی یہ تھی کہ فرنگی کا راج سو سال چلے گا۔ پھر ختم ہو جائے گا۔ اور جنگ پلاسی سے اب تک سو سال بس پورے ہونے کو تھے۔

انہیں پیشگوئیوں اور افواہوں کے بیچ رمضان کا مبارک مہینہ آ گیا۔ مگر پہلے ہی روزے پر بدشگنی ہو گئی کہ قلعہ سے افطاری کے جو خوان جامع مسجد بھیجے گئے تھے انہیں چیلوں نے جھپٹا مار کر اوندھا دیا۔ پھر کسی روزہ دار بی بی نے سحری کے وقت آسمان پر نظر ڈالی اور دیکھا کہ وہ بوٹی کی طرح سرخ ہو رہا ہے۔ انہیں ہولوں جولوں میں منجھلا روزہ آیا اور گذر گیا۔ اور آج سولھویں روزے کی مبارک صبح تھی۔ جہاں آباد کی صبح سبحان اللہ۔ اور پھر مئی کے بیچ طلوع ہونے والی صبح۔ اس مہینے کے دس دن گذر چکے ہیں۔ دھوپ میں پہلے چنچنی آئی اور اب یہ حال ہے کہ دوپہر میں قدم گھر سے نکالو گے تو پسینہ میں نہا جاؤ گے۔ مگر صبحیں ابھی سہانی ہیں۔ ان کی قدر کرو۔ اور دلی کے سیلانی ان کی قدر اس طرح کرتے کہ ادھر صبح ہوئی اور ادھر وہ لپک جھپک جمنا کنارے پہنچے۔ سو گھاٹ گھاٹ ہجوم ہوتا سیلانیوں کا اشنان کرنے والوں کا۔ یہ جو مہین ساڑھیوں میں لپٹے چاند سے چہرے قطار اندر قطار چلے جاتے ہیں ان سب کا رخ گھاٹ کی طرف ہے۔ لیکن یہ روزوں کی صبح ہے۔ سیلانی کم نظر آئیں گے۔ وہ تو سحری کھا کے سوئے پڑے ہیں۔ اتنی جلدی کہاں اٹھیں گے۔ سو گھاٹ کی طرف جانے والے سب پجاری ہیں اور پجارنیں۔

ادھر قلعۂ معلیٰ میں بھی ابھی جاگ باگ نہیں ہوئی ہے۔ شہزادے شہزادیاں سب سوئے پڑے ہیں۔ سحری کھا کر سوئے ہیں۔ اتنی جلدی کہاں اٹھ جائیں گے۔ سحری کھانے کے بعد کچھ زیادہ ہی نیند آتی ہے۔ لمبی تان کے سوئے ہیں۔ دیر ہی سے جاگیں گے۔ مگر ظل سبحانی حضرت بہادر شاہ ظفر جاگے ہوئے ہیں۔ فریضہ سحری ادا کر کے جھروکے میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ یہ ثمن برج ہے۔ اس کے نیچے پٹڑی پر دو سو خاص بردار سرمئی دستار اور سرمئی پٹکے باندھے بغلوں میں تلواریں دبائے دست بستہ کھڑے ہیں۔ اِدھر مٹیا محل کی سڑک پر بڑی حویلی کے بلند و بالا پھاٹک کے آگے فٹن تیار کھڑی ہے۔ یہ صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ کی فٹن ہے۔ شہر میں ایک ہی تو فٹن ہے اور وہ اس دولت سرا کے در پر نظر آتی ہے۔ مفتی

صاحب دولت سرا سے باہر آئے اور فٹن میں سوار ہو گئے۔ دو گھوڑوں والی فٹن فراٹے بھرتی چلی۔ کشمیری دروازے پہ پہنچی تو پوربئے پہریدار نے انگریزی قواعد کے مطابق بندوق اور سنگین سے صدرالصدور کو سلامی دی۔ مفتی صاحب یہاں سے گذر کچہری میں پہنچے۔ عدالت معمول کے مطابق شروع ہوئی۔

یہ انگریزی عدالت تھی۔ ادھر بہادر شاہ ظفر دربار کے لیے روانہ ہوا چاہتے تھے کہ تخت رواں اپنے سنہری ہودے کے ساتھ تیار تھا۔ مگر اٹھتے اٹھتے ان کی نظر جمنا کے پل کی طرف گئی اور وہ ٹھٹھک گئے۔ دیکھا کہ دریا پار آگ لگی ہوئی ہے، شعلے اڑ اڑ کر آسمان کو جاتے ہیں۔ فوراً ادھر سوار دوڑائے گئے۔ سوار دوڑ کر گئے اور دم کے دم میں خبر لے کر آئے کہ ایک لشکر دلی پر چڑھ آیا ہے۔ میر بحر کو مار ڈالا۔ اس کے بنگلہ کو آگ لگا دی۔ اب لوٹ مار پر اترا ہوا ہے۔ حکم شاہی ہوا کہ پل توڑ دو، کشتیاں کھینچ لو، قلعہ کا دروازہ معمور کر دو۔ قلعہ دار کو چاہیے کہ دروازے کی پوری پوری حفاظت کرے۔ دروازے شہر پناہ کے بند کرا دو۔ مگر ادھر احکامات جاری ہو رہے تھے اور ادھر باغیوں کا لشکر جو میرٹھ سے چلا تھا کشتیوں کے پل پر سے گذر کر جھروکہ تلے آ پہنچا۔ اپنی بغاوت کا احوال سنایا اور بادشاہ سے بغاوت کی قیادت سنبھالنے کی گذارش کی۔ بادشاہ کو اس کانٹوں بھری قیادت کو قبول کرنے میں تامل تھا۔

باغی ادھر سے مایوس ہو کر راج گھاٹ دروازے کی طرف چلے۔ راج گھاٹ دروازہ بند تھا۔ ادھر اشنان کرنے کے لیے ہندو عورتیں مرد گھاٹ پہ جانے کے لیے بضد تھے۔ ادھر باہر باغی شہر کے اندر داخل ہونے کے لیے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ مگر دروازے کے پہریدار ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پھر دروازہ کیسے کھل گیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر آسمانی امداد میں یقین رکھنے والوں نے جو وجہ بتائی وہ دلی والوں کے دلوں میں گھر کر گئی۔ وہ کہتے تھے کہ دو سبز پوش سوار نامعلوم سمت سے نمودار ہوئے۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ اور دروازہ کھلنا تھا کہ جیسے دریا کا بند ٹوٹ گیا۔ باغی سوار اندر گھس آئے اور پورے شہر میں قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔

ادھر مفتی صدرالدین بیٹھے مقدمات کی سماعت کر رہے تھے کہ ایک دم سے ایسا دھما کہ ہوا کہ زمین ہل گئی۔ کچہری میں بھاگڑ پڑ گئی۔ مگر مفتی صاحب ہیں کہ جمے بیٹھے ہیں۔ تب پیشکار نے آ کر عرض کی کہ ''حضور والا غدر پڑ گیا۔''

''ہائیں، کیسا غدر۔''

''دیسی فوج نے میرٹھ میں بغاوت کر کے فرنگیوں کو قتل کیا۔ وہی فوج اب دلی میں گھس آئی ہے۔

فرنگیوں کو مار کاٹ رہی ہے۔ کشمیری دروازے کے بارود خانے کو آگ لگادی۔ شہر میں قیامت برپا ہے۔ فٹن تیار کھڑی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔''

مفتی صاحب نے کہا ''انا اللہ وانا الیہ راجعون'' اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر اب دم کے دم میں ان کا عہدۂ جلیلہ دو ٹکے کا ہوگیا تھا۔ وہی کشمیری دروازے کا سنتری جس نے گھنٹہ بھر پہلے انہیں سلامی دی تھی اب ڈھیٹ بنا کھڑا ہے۔ کیسی سلامی۔ اب تو وہ سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ پیشکار صاحب صدرالصدور کا حوالہ دے رہے ہیں۔ مگر وہ دروازہ کھولنے سے انکاری ہے۔ پیشکار صاحب نے جیسے تیسے خوشامد درآمد کر کے اس سے دم بھر کے لیے دروازہ کھلوایا۔ مفتی صاحب کی فٹن اب واپس دولت سرا کی طرف جارہی تھی۔ مگر اب تو اس دولت سرا کے بھی دن گنے گئے تھے۔

اور وہ بڑی دولت سرا لال قلعہ اور دلی والوں کے حسابوں قلعۂ معلیٰ۔ مگر اب وہ معلیٰ کہاں رہا تھا۔ قلعہ کے معاملہ میں ظل سبحانی کے احکامات دھرے کے دھرے رہ گئے۔ قلعہ دار صاحب بچک گئے۔ دروازہ کھلا اور باغی اندر گھس آئے۔ اب قلعۂ معلیٰ میں پوربئے سپاہی دندنا رہے تھے۔ اب وہ دیوار کی صورت تھی نہ در کی صورت۔ سلطانی ٹھسا' شاہی ادب آداب' اردوئے معلیٰ میں رچے بسے القاب و خطابات سب ختم۔ اب ظل سبحانی صاحب عالم شہنشاہ حضرت بہادر شاہ ظفر خالی خولی بڑھو بن کر رہ گئے تھے۔ اور احترام الدولہ عمدۃ الحکما' حاذق الزماں معتمدالملک حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر مختصر ہو کر 'بھین' بن گئے تھے۔ اس عالم میں بہادر شاہ ظفر بدمزہ ہو کر بولے کہ ''میرے یہ دو بدنصیب کان پیک دان بن کر رہ گئے ہیں جس میں پوربئے بڑھو بڑھو کہہ کر مستقبل پیک کر رہے ہیں۔''

ظہیر دہلوی داروغۂ ماہی مراتب تھے۔ حکم پہنچا کہ فوراً قلعہ میں حاضری دو۔ وہ بھاگتے دوڑتے قلعہ پہنچے۔ قلعہ کے باہر جو نقشہ دیکھا وہ یہ تھا کہ انگریزی کتابوں کے اوراق پھٹے ہوئے اڑتے پھرتے ہیں۔ دروازے سے فاصلہ پر ایک مست ملنگ ننگ دھڑنگ بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں ایک پھٹا پرانا انگریزی جوتا ہے۔ جو ورق اڑ کر اس کے قریب آتے ہیں انہیں وہ سمیٹتا ہے اور سامنے رکھ کر غصے میں ان پر جوتے مارتا ہے۔ قلعہ کے اندر قدم رکھا تو دیکھا کہ دیوانِ خاص میں ایک ستون سے لگے محبوب علی خاں خواجہ سرا چپ بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے دوسرے ستون سے لگے ہوئے حکیم احسن اللہ خاں گم سم بیٹھے ہیں۔ باقی درباری دورویہ صفیں باندھے بیٹھے ہیں۔ وسط میں خیاط بیٹھا کفن سی رہا ہے۔ ظہیر دہلوی حیران کہ یہ کیا نقشہ ہے اور کفن کس کا سل رہا ہے۔ وہ چپکے چپکے برابر والے سے پوچھ رہے تھے کہ حکیم صاحب کے کان میں بھنک

پڑی۔ انہوں نے بآواز بلند کہا کہ ''اے عزیز واقعہ یوں ہے کہ صاحب ریزیڈنٹ بہادر کو باغیوں نے قتل کر دیا۔ حضور کو ان کے مارے جانے کا قلق ہے۔ ان کے حکم سے تجہیز و تکفین کا یہ اہتمام ہو رہا ہے۔ سات آدمی اور مارے گئے ہیں۔ ان کی لاشیں قلعہ کے دوراز ے کے قریب پڑی ہیں۔''

ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ کچھ گھڑ سوار باغی گھوڑوں سے اتر دیوان خاص میں داخل ہوئے، گلے میں لٹھے کے کرتے، ٹانگوں میں ڈھیلے ڈھالے غرارے دار پائجامے، سروں پر انگوچھا لپٹا ہوا، چندیا کھلی ہوئی۔ کسی کے پاس بندوق، کسی کے پاس طمنچہ، کسی کے پاس قرابین۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ کفن کے لیے آئے ہوئے تھان لوٹ لیے۔ پھاڑ پھاڑ کر سروں پر باندھ لیے۔ ایک نے بڑھ کر محبوب علی خاں کی توند پر طمنچہ رکھ دیا۔

یہ قلعہ کے اندر کا نقشہ تھا۔ باہر شہر میں گھڑ سوار باغی گھوڑے کداتے پھرتے تھے۔ ان کے سر پہ خون سوار تھا۔ دلی کی زمین ایک مرتبہ پھر خون سے رنگین نظر آ رہی تھی۔ مگر اس مرتبہ فرق یہ پڑا تھا کہ صرف فرنگی مولی گاجر کی طرح کٹ رہے تھے۔ دلی والوں کی جانیں بچی ہوئی تھیں۔ مگر یہ تو ابتدا تھی۔ تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ دلی والوں کو ابھی بہت کچھ دیکھنا تھا۔ جہاں آباد کی بساط ایسے ہی تھوڑا ہی لپٹ جائے گی ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
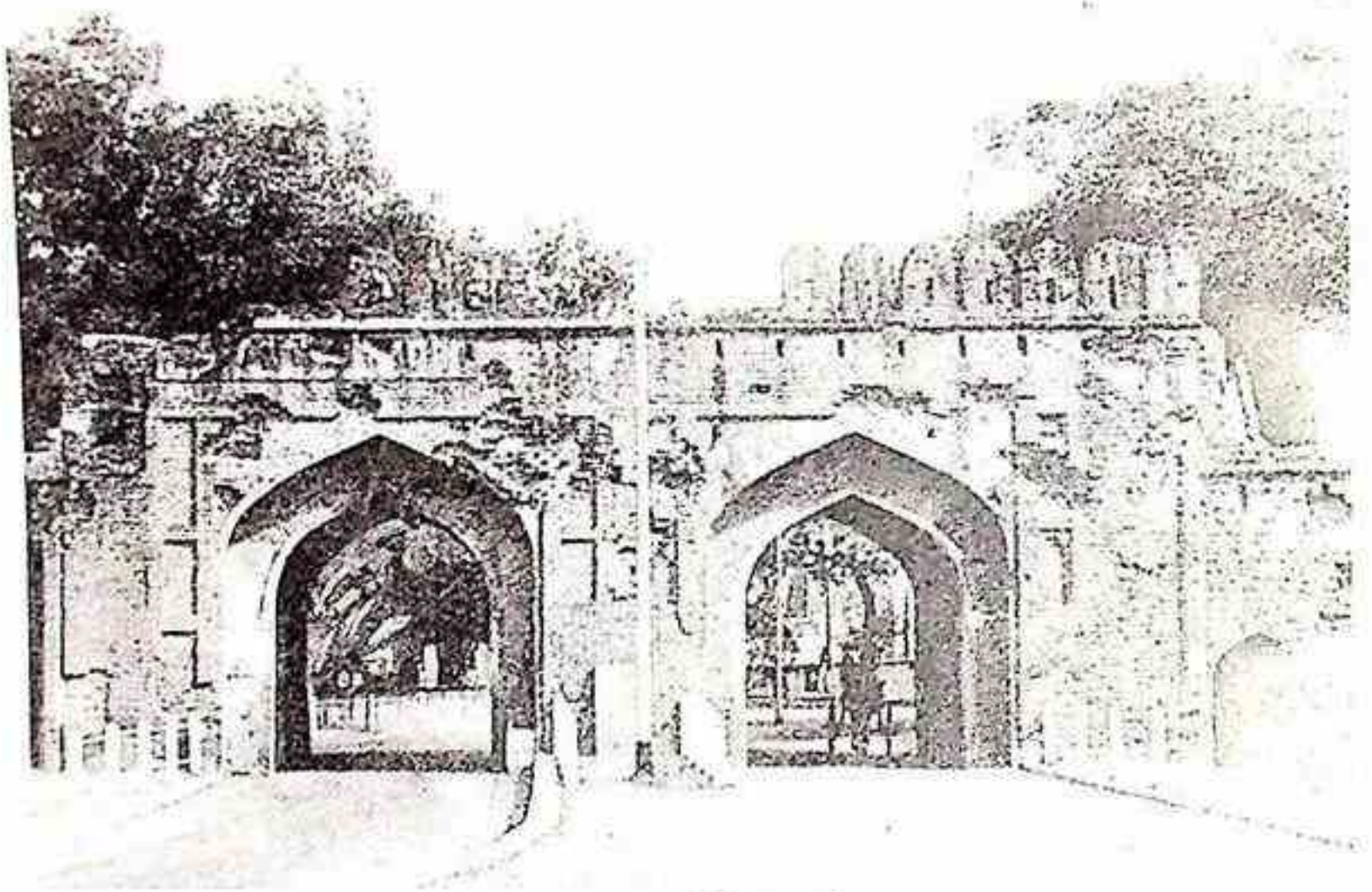
دہلی کا مشہور کشمیری دروازہ،
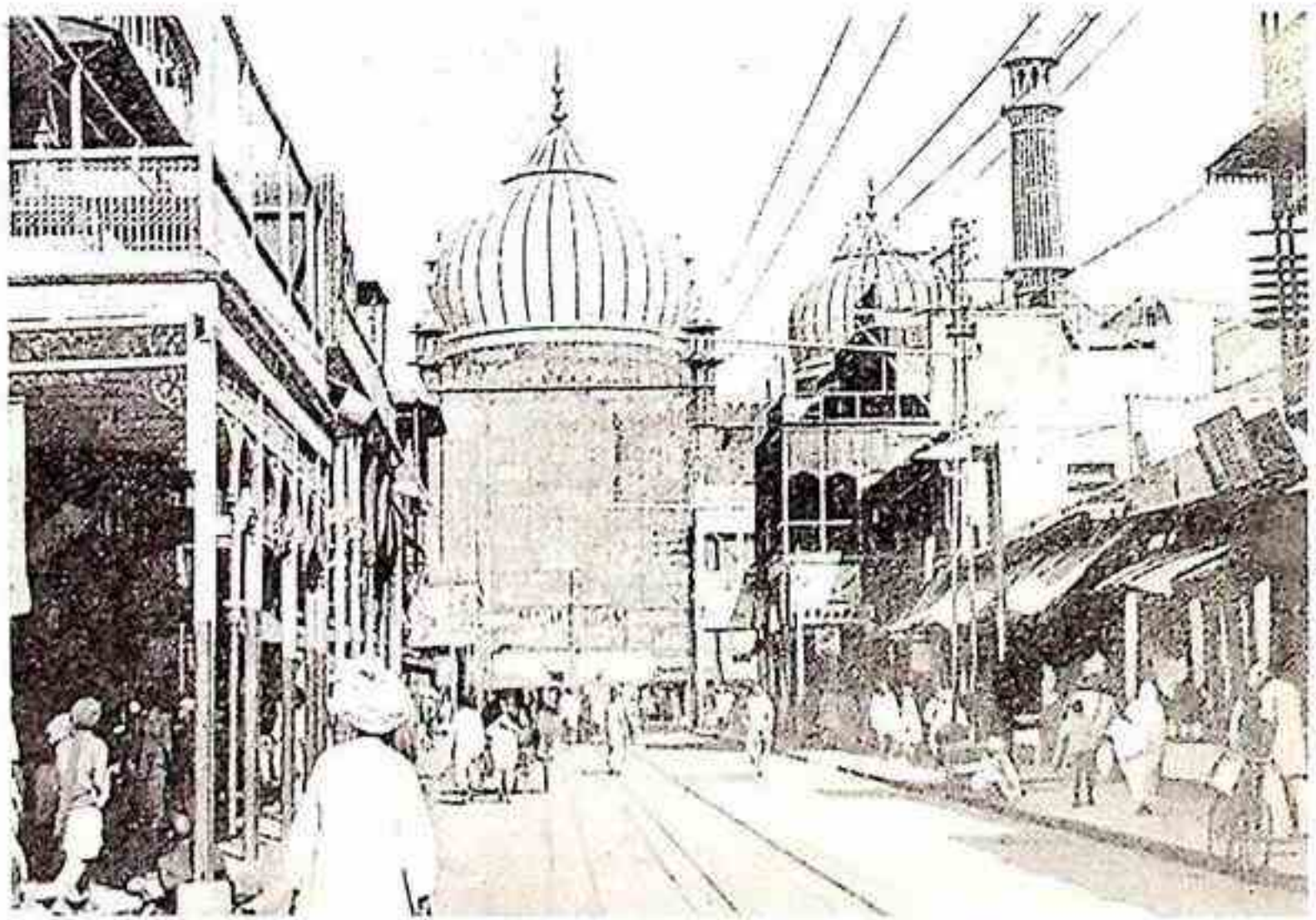
پُرانی دہلی کے ایک بازار کا منظر، عقب میں جامع مسجد جس کا گنبد دکھائی دے رہا ہے۔
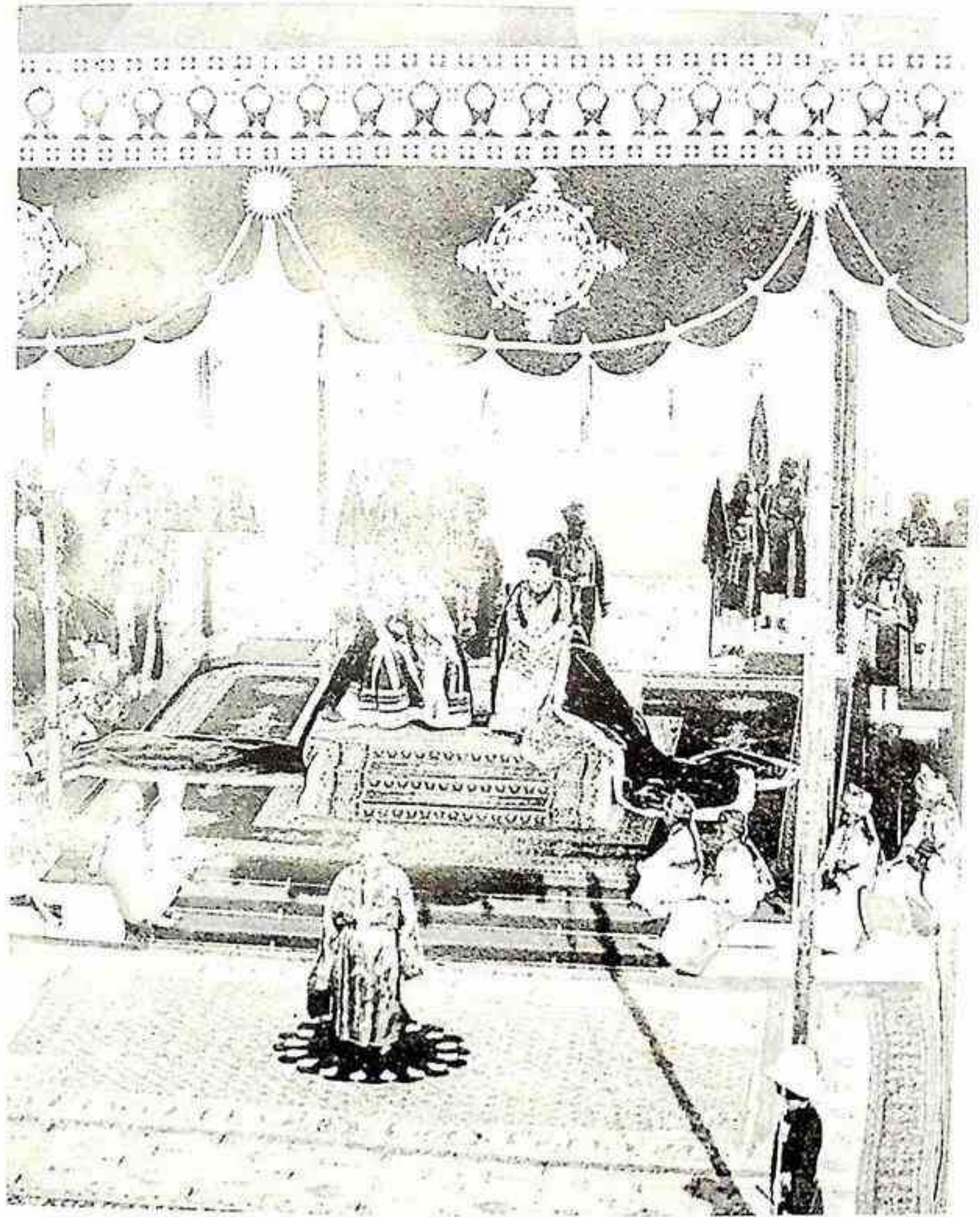
دہلی پھر دارالسلطنت مقرر کیا گیا۔ ملک معظم جارج پنجم کے ۱۹۱۱ء کے دربار کا ایک منظر۔

گیارہ مئی کے بعد

جہاں آباد کا تو اب نقشہ ہی اور تھا۔ بس یک بیک اک ہوا چلی اور نگر کا رنگ اور سے اور ہو گیا۔ امی جمی کے دن گئے۔ سکون و عافیت اب کہاں۔ نہ چاندنی چوک میں وہ رونقیں نہ چوک جامع مسجد میں وہ جمگھٹے۔ مشاعرے موقوف' داستان گوئی کی محفلیں معطل۔ کیسی شاعری کہاں کی داستان گوئی۔ وہ تو ساری بساط ہی جیسے الٹ گئی ہو۔ نہ قلعہ وہ قلعہ رہا نہ کوچے وہ کوچے رہے کہ انہیں اوراق مصور کہیں۔ دلی کے سیلانی اور ترچھے بانکے چھیل چھبیلے سب غائب غلہ ہو گئے۔ اب اور ہی مخلوق شہر میں دندنا رہی تھی۔ پہلے پوربی سپاہیوں نے ہلہ بولا۔ پھر بریلی سے جنرل بخت خاں آندھی دھاندی چلا اور دلی میں آ کر ڈیرا ڈالا۔ پھر انگریزی رسالے مارا مار کرتے آئے اور شہر کے باہر پہاڑی پہ مورچہ جما لیا۔ لیجئے دونوں طرف سے توپیں چلنے لگیں۔

مگر بہادر شاہ ظفر کیا کر رہے تھے۔ آگے تو انگریزوں نے انہیں بے دست و پا کر رکھا تھا۔ مغلیہ سلطنت کی ساری چمک دمک غائب۔ بس ان کی صورت ایک شمع ٹمٹما رہی تھی۔ مگر اب تو باغیوں نے انگریزوں کو مار مار کے نکال باہر کر دیا تھا اور بادشاہ سے گذارش کر رہے تھے کہ سچ مچ کے شہنشاہ ہند بنو اور بغاوت کی قیادت قبول کرو۔ باغیوں کو ایک قائد کی تلاش تھی اور صرف میرٹھ کے باغیوں کو نہیں بلکہ ان سب کو جو ہندوستان بھر میں جا بجا سر اٹھا رہے تھے۔ اور سب کی نگاہیں ہر پھر کر دلی کی طرف اٹھیں اور بہادر شاہ ظفر پر مرکوز ہو گئیں۔ مغل بادشاہ کی جو حیثیت بھی رہ گئی ہو بہر حال مرکزی حیثیت تو اسے ہی حاصل تھی۔ تو باغیوں کو ایک قائد کی تلاش تھی۔ اور بہادر شاہ ظفر کو گئی ہوئی مغلیہ عظمت کا خیال رجھا بھی رہا تھا' ڈرا بھی رہا تھا۔ ایک تذبذب کا عالم تھا۔ پھر اس بادشاہ نے کیا فیصلہ کیا۔

ہمارے سامنے اس بادشاہ کی دو تصویریں ہیں۔ ایک تو وہ تصویر ہے جو اس قیامت کے گذر جانے

کے بعد ان تذکرہ نویسوں نے پیش کی ہے جو خود دلی والے تھے اور اب برکاتِ سلطنت انگلیشیہ کے قائل تھے۔ دوسری وہ تصویر ہے جو بعد کے ان مورخوں کے یہاں نظر آتی ہے جنہوں نے اس بغاوت کو غدر کہنے سے انکار کیا اور جنگ آزادی کہنے پر اصرار کیا۔ ان کے بیانات سے ایک اور تصویر ابھرتی ہے۔ آزادی کا اعلان کرنے والے نواب اور راجے شہنشاہ ہند حضرت بہادر شاہ کو نذریں بھیج رہے ہیں اور شہنشاہ موصوف ہنسی خوشی بصد تمکنت و وقار وہ نذریں قبول کرر ہے ہیں۔ بخت خاں جب دلی میں وارد ہوتا ہے تو وہ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اسے ڈھال تلوار سے نوازتے ہیں اور فوج کی کمان اس کے سپرد کرتے ہیں۔

اس وقت دو کتابیں میرے سامنے رکھی ہیں۔ ایک تو ظہیر دہلوی کی 'داستانِ غدر' ہے۔ ظہیر دہلوی قلعہ سے بحیثیت داروغہ ماہی مراتب وابستہ چلے آتے تھے۔ انہوں نے دلی اور قلعہ کا احوال باغیوں کی آمد سے سقوط تک جس نظر سے دیکھا اور سمجھا بیان کیا۔ اس بیان میں بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا حال کچھ اس طرح کا نظر آتا ہے کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ انگریزوں کے چنگل سے نکلے تو باغیوں کے نرغے میں آ گئے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بغاوت کی قیادت کیا کرر ہے ہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ ع

دستِ تہہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

بخت خاں کندہ ناتراش۔ شاہی ادب آداب سے ناواقف۔ مگر بادشاہ سلامت کیا کریں۔ اسے نوازنے پر مجبور ہیں۔

میرے سامنے ایک دوسری کتاب بھی ہے۔ 'CRY FOR FREEDOM' یہ کتاب 1857ء کی جنگ سے متعلق کچھ دستاویزات کا مجموعہ ہے جو سلیم الدین قریشی نے انڈیا آفس میں دستاویزوں کے لگے انبار سے ٹٹول کر برآمد کی ہیں۔ یعنی یہاں قیاس کے گھوڑے نہیں دوڑائے گئے ہیں بلکہ دستاویزیں پیش کی گئی ہیں۔

کچھ دستاویزیں ایسی بھی ہیں جو بتائیں گی کہ ایسا نہیں تھا کہ دلی والے بے خبری میں پکڑے گئے ہوں۔ اندر ہی اندر کھچڑی اچھے خاصے دنوں سے پک رہی تھی۔ وہ جو جامع مسجد کی دیوار پر ایک اشتہار لگا تھا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے وہ صرف اسی دیوار پر نہیں لگا تھا بلکہ دیکھتے دیکھتے دلی کی ہر گلی ہر کوچے میں دیواروں پہ چپکا نظر آنے لگا۔ اور اس اشتہار کی ذمہ داری ایک شخص نے قبول بھی کر لی۔ اس نے اپنا نام محمد صادق خاں بتایا اور دعویٰ کیا کہ ایرانی سپاہی نو سو کی تعداد میں ہندوستان میں داخل ہو چکے ہیں۔ ان میں سے پانچ سو بھیس بدل کر دلی میں گھوم پھر رہے ہیں۔ اپنے متعلق کہا کہ میں بھی اسی سلسلہ میں دلی آیا ہوں۔ اپنی آمد

کی تاریخ اس نے 2 مارچ بتائی تھی۔ یعنی 11 مئی سے ایک مہینہ کچھ دن پہلے۔ اور دعویٰ کیا کہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے اسے اطلاعات موصول ہوتی ہیں اور وہ یہ ساری اطلاعات لکھ کر شاہ ایران کو بھیجتا ہے۔ 'صادق الاخبار' نے اپنی 19 مارچ 1857ء کی اشاعت میں اس اشتہار پر تبصرہ کیا۔ کیا خوب تبصرہ تھا کہ پہلے تو اس پر تنقید کی اور محمد صادق خاں کو آڑے ہاتھوں لیا کہ آخر وہ دہلی آیا کیوں ہے پھر اس بات کا مذاق اڑایا کہ شاہ ایران ہندوستان پر آ کر قبضہ کرلیں گے اور یہ سوال اٹھایا کہ کیا ہمارے ہندو اہل وطن اس بات کو پسند کریں گے۔ پھر ایک ٹکڑا لگایا کہ ہاں اگر شاہ ایران شاہ عباس صفوی کی مثال پر عمل کرتے ہوئے ہمارے بادشاہ سلامت کو ان کا تخت واپس دلا دیں تو ہندو اہل وطن کے لیے اس میں خوشی کا پہلو موجود ہے۔ پھر ایک اور ٹکڑا لگایا۔ لکھا کہ اگر ایسا ہو تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ آخر تیمور ہی نے تو ایرانیوں کو خودمختاری کی نعمت سے نوازا تھا۔ اور اسی احساس نے تو شاہ عباس کو ہمایوں کی مدد کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

اس بات کو چھوڑیئے کہ شاہ ایران نے ایسا کوئی قدم اٹھایا تھا یا قدم اٹھانے کا ارادہ بھی کیا تھا۔ برصغیر کے مسلمان شروع ہی سے اسلامی ممالک کے متعلق خوش فہم رہے ہیں۔ کب کب انہوں نے ان سے مدد کی توقعات نہیں باندھیں، کبھی ایران سے، کبھی افغانستان سے، کبھی ترکی سے۔ تو بیشک اس افواہ کی کوئی بنیاد نہ ہو مگر اس سے محکوم مخلوق کے ارادوں کا تو پتہ چل رہا تھا۔ اور یہ کہ دلی والوں کے دلوں میں بھی بہت کھد بد ہو رہی تھی۔ انہیں سن گن ہو گئی تھی کہ انگریزوں سے کوئی نپٹا ہونے والا ہے۔ آنے والے وقت سے توقعات بھی باندھ رہے تھے مگر ڈر بھی رہے تھے۔ سو سو طرح کے اندیشے اور وسوسے انہیں گھیرے ہوئے تھے۔ بدشگنیاں، اچھے برے خواب، قیاس آرائیاں، پیشگوئیاں، ڈھکے چھپے اشارے۔ اتنا کچھ ہو رہا تھا تو بہادر شاہ ظفر کیا اس سے یکسر بے خبر تھے۔ بلکہ شاہی فوج کی طرف سے جاری کردہ اعلان جس کی دستاویز سلیم قریشی نے انڈیا آفس سے برآمد کی ہے۔ کچھ اور ہی کہتی ہے۔

یہ دستاویز ایک اعلان ہے 'دلی کی شاہی فوج' کی طرف سے ہندوستانیوں کے نام۔ جب ستمبر 1857ء میں انگریزوں نے لال قلعہ پر قبضہ کیا تو دوسرے کاغذات کے ساتھ ایک یہ دستاویز بھی ان کے ہاتھ آئی۔ یہ بیان اردو میں تھا۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں کرایا گیا اور پھر اس کا بغور مطالعہ کیا گیا۔

اس اعلان میں سمجھئے کہ بغاوت کا جواز پیش کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ انگریزوں نے کیا کیا زیادتیاں کیں، کیا کیا ظلم ڈھائے جس کی وجہ سے یہ بغاوت برپا ہوئی۔ اس میں بہشتی کے خواب کا بھی ذکر ہے۔ بتایا گیا ہے کہ بہشتی کے خواب میں جو اشرفیاں ملی تھیں وہ جاگتی آنکھوں بھی اس کے تصرف میں تھیں۔

وہ انہیں لے کر بازار میں گیا تو واقعی اس سے پوچھ گچھ شروع ہوگئی۔ پوچھا گیا کہ یہ اشرفیاں تجھے کہاں سے ملیں۔ کہا کہ بادشاہ سلامت کی عطا ہے۔ شاہی آدمی اسے پکڑ کر بادشاہ کے حضور لے گئے۔ بہادر شاہ ظفر نے اس کا حال زار دیکھا۔ کہا کہ ہاں ہم نے یہ اشرفیاں اسے عطا کی تھیں۔ مگر اس کے بعد اس بہشتی کو روک لیا گیا۔ تخلیہ میں اس سے پوچھا گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ یہ اشرفیاں تیرے پاس کہاں سے آئیں۔ بہشتی نے اپنا خواب سنایا اور ساتھ میں وہ نصیحت بھی جو بادشاہ کو کی گئی تھی۔ اس پر بادشاہ نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا کہ ''میں ضعیف و ناتواں۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ مگر یہ فال نیک ہے۔ دیکھیں پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔''

اور پردۂ غیب سے جو نمودار ہوا وہ آس و یاس کی ملی جلی فضا میں نمودار ہوا۔ بہادر شاہ ظفر کا معاملہ بھی یہی تھا۔ بہت سی یاس۔ بیچ بیچ میں تھوڑی آس۔ ابتدا میں تذبذب۔ پھر رفتہ رفتہ جیسے امید پیدا ہو چلی ہو یا باغیوں کی طاقت پر اعتبار آ گیا ہو یا پھر سوچا ہو کہ بغاوت کی قیادت کا تاج سر پہ رکھ ہی دیا گیا ہے تو اسے اللہ عزیز کر کے قبول کرلو اور دیکھو کہ پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔ تو باسی کڑی میں ابال آیا۔ بادشاہ نے اس بغاوت میں نظم و ضبط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بیٹوں کے ہاتھ میں فوج کی کمان دی۔ مرزا مغل کو کمانڈر انچیف بنایا۔ مگر مرزا مغل نام ہی کے مغل نکلے۔ اس مغل نے کبھی میدانِ جنگ دیکھا ہوتا تو پتہ ہوتا کہ جنگ کیا ہوتی ہے اور سپہ سالار کو کیا کرنا ہوتا ہے۔

تو جنگی محاذ پر مرزا مغل کوئی نظم و ضبط پیدا نہ کر سکے مگر بہادر شاہ ظفر نے سول محاذ پر مختلف اقدامات کیے اور حالات میں تھوڑی بہتری پیدا ہوئی۔ ایک سنگین مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب ایک مولوی نے کہ مولوی محمد سعید کے نام سے جانے جاتے تھے جہاد کا نعرہ لگایا اور جامع مسجد میں جا کر جہاد کا پرچم نصب کر دیا۔ بہادر شاہ ظفر نے فوراً ہی یہ پرچم اتروا دیا اور ایک بیان جاری کیا کہ ہماری نظروں میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر ہیں۔ اور پھر انہیں کی کوششوں سے عید قربان آنے پر یہ ہوا کہ گائے کی قربانی مطلق نہیں ہوئی۔ اور اب بریلی سے ایک گھڑ سوار لشکر کے ساتھ جنرل بخت خاں بھی آ پہنچا تھا۔

بخت خاں یکم جولائی کو دلی میں وارد ہوا۔ بخت خاں انگریزی فوج سے وابستہ رہا تھا۔ بریلی بریگیڈ نے جو گھڑ سواروں کا ایک دستہ تھا پہلی افغان جنگ میں اس کی کمان میں بہت کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے اور بہت تمغے جیتے تھے۔ شہنشاہ ظفر نے اسے تلوار اور ڈھال سے نوازا اور فوج کے معاملات کا اسے نگراں بنایا۔ مگر مرزا مغل جہاں کے تہاں رہے۔ اور اس مغل شہزادے کو یہ کب گوارا تھا کہ بریلی سے ایک

رہیلہ سردار آ کر اس کے کام میں مداخلت کرے۔ سو جنگی محاذ پر دو عملی پیدا ہوگئی۔ اور اب یہاں بھی سازشوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جو قلعہ میں پہلے ہی سے گرم تھا۔ بہرحال اس کے آنے سے جوش کی ایک نئی لہر پیدا ہوگئی۔ اہل شہر میں بھی حوصلہ پیدا ہوا۔ اور شہر کے علما نے اکٹھے ہو کر ایک فتویٰ جاری کیا اور لوگوں کو تلقین کی کہ اس معرکہ کو جہاد جانو اور سردھڑ کی بازی لگا دو۔

مگر ادھر انگریزی فوجوں کی طاقت میں بھی بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ بریگیڈیئر نکلسن بھی بہت سے جنگی ساز و سامان کے ساتھ آن دھمکا تھا۔ یعنی فیصلہ کن معرکے کا وقت قریب آن پہنچا تھا۔

ہاں بخت خاں تو تھا ہی مگر اس کے ہمراہ ایک نگ اور آیا تھا۔ یہ ایک یورپی ماہر جنگ تھا۔ بغاوت سے پہلے وہ انگریزی فوج میں سارجنٹ میجر تھا اور بریلی میں تعینات تھا۔ اب بخت خاں کا ساتھی تھا اور انگریزوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اس کا تفصیل سے ذکر پی جے اوٹیلر نے اپنی تصنیف 'A Star Shall Fall' میں کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شہنشاہ ظفر نے اسے بھی ایک اہم عہدے پر مامور کیا تھا جو بخت خاں کے عہدے سے دوسرے نمبر پر تھا۔ جب انگریزی فوج نے شہر پر یلغار کی تو کشمیری دروازے پر معرکہ پڑا اس میں وہ جان توڑ کر لڑا تھا۔

اور آخر کو وہ وقت آن پہنچا جس کے آثار پہلے سے نظر آنے شروع ہوگئے تھے۔ قلعہ میں مسکوٹیں ہو رہی تھیں۔ حکیم احسن اللہ خاں اور مرزا الٰہی بخش کہ بادشاہ کے سمدھی تھے بادشاہ کو مشورے دے رہے تھے کہ جنگ کو سلام کرو اور قلعہ سے نکل لو۔ اور انگریزوں کی طرف سے یقین دلا رہے تھے کہ جان کی اماں پاؤ گے اور عزت کے ساتھ بخشے جاؤ گے۔ اور بالآخر وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔

لیجیے لال قلعہ سے کوچ کا وقت آن پہنچا۔ انگریزی فوج کشمیری دروازے سے شہر میں داخل ہو چکی ہے۔ قیامت کا رن پڑا ہوا ہے۔ معرکہ سخت ہے۔ خون کی ندی بہہ رہی ہے۔ جامع مسجد میں مٹھی بھر لوگ جمع تھے۔ فرنگی فوج کو مسجد کی طرف بڑھتے دیکھا تو تلواریں سونت کر نکل پڑے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ یہاں سے وہاں تک لاشیں ہی لاشیں۔ اور اب گلیوں محلوں سے لوگ سر سے کفن باندھ کر نکل رہے ہیں۔ جس کے پاس تلوار نہیں اس نے لاٹھی سنبھالی اور نکل پڑا۔ جسے لاٹھی میسر نہ آئی اس نے باورچی خانے سے پھکنی لی اور چل کھڑا ہوا۔ گلی گلی لڑائی ہو رہی ہے۔ جن میں بوتا نہیں وہ گھروں کو چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ جو آج نہیں بھاگے وہ کل بھاگیں گے کہ فرنگیوں پر خون سوار ہے۔ انتقام پر تلے ہیں۔ نہتے ان کی زد میں ہیں۔ عورتیں اور بچے جان کی اماں مانگتے ہیں اور نہیں پاتے۔ ایسے میں اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ شہر سے

نکل سکتے ہو تو نکل چلو۔ دلی خالی ہو رہی ہے۔ جہان آباد کی بساط لپٹ رہی ہے۔ شہر کے دروازے فی الحال کھلے ہیں۔ خلقت کو یہ کھلی چھٹی ہے کہ نکل سکتی ہے تو نکل جائے۔

لال قلعہ میں ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ شہزادے شہزادیوں کے لیے اب یہ قلعہ جائے عافیت نہیں رہا۔ قلعہ کی دیواریں کھانے کو دوڑ رہی ہیں۔ جس کا جدھر منہ اٹھا نکل گیا۔ اب ان کا کوئی سر دھرا نہیں ہے۔ جو سر دھرا تھا اس کی اپنی جان کے لالے پڑے ہیں۔ شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر اب کہاں کے شہنشاہ رہ گئے۔ ملکہ زینت محل اور کمسن شہزادہ جواں بخت کو ساتھ لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ نہ ہاتھی کی سواری نہ سونے کی عماری۔ نہ پالکی نہ نالکی۔ کیسا تخت رواں اور کیسی نوبت۔ بس منہ چھپا کر نکل جانا چاہتے ہیں۔ لال قعہ خالی ہو رہا ہے۔ نوادر پر دو سو برس بعد وہ اپنے مکینوں کو پریشان و مضطرب نکلتے دیکھ رہا ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے لال قلعہ کو آخری سلام کیا

دمدموں میں دم نہیں اب خیر مانگو جان کی
اے ظفؔر بس ہو چکی شمشیر ہندوستان کی

اب ان کا رخ مقبرۂ جہانگیر کی طرف ہے۔

بخت خاں نے آخری بار مقبرۂ ہمایوں میں جا کر حضور میں جا کر گذارش کی کہ ابھی کچھ نہیں گیا ہے۔ ایک دلی کا مورچہ ہی تو گیا ہے۔ سارا ہندوستان پڑا ہے۔ اور جا بجا مورچے جمے ہیں۔ ہمارے ساتھ نکل چلیے۔ مناسب مقام پر پہنچ کر مورچہ جماتے ہیں۔ سارا ہندوستان آپ کی طرف دیکھ رہا ہے۔

مگر بہادر شاہ ظفر جی چھوڑ چکے تھے۔ بڑھاپے کا حوالہ دے کر معذرت کر لی۔ بخت خاں ہونٹ چباتا پیر پٹختا نکلا اور اپنے لشکر کو لے کر نامعلوم سمت میں روانہ ہو گیا۔

ادھر لال قلعہ اپنے مکینوں کو رخصت کر کے بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ خانۂ خالی را دیو می گیرد۔ بہادر شاہ ظفر 19 ستمبر کو قلعہ سے نکلے تھے۔ 20 ستمبر کو دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور جنرل ولسن بصد کر و فر لال قلعہ میں داخل ہوئے۔ دیوان خاص اب ان کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

بہادر شاہ ظفر نے مقبرہ ہمایوں کو جائے اماں جانا تھا۔ مگر جائے اماں اب دلی میں کہیں نہیں تھی۔ کیپٹن ہڈسن نے جنرل ولسن سے اجازت لی اور مقبرہ ہمایوں کی طرف دوڑ پڑا۔ مولوی رجب علی نے اندر جا کر بہادر شاہ کو اونچ نیچ سمجھائی، فرنگیوں کی طرف سے اطمینان دلایا اور شیشے میں اتار لیا۔ اور لیجیے بہادر شاہ ظفر نے باہر آ کر اپنے آپ کو ہڈسن کے حوالے کر دیا۔ زینت محل اور جواں بخت ان کے ساتھ ہیں۔ لیجیے

پھر واپس لال قلعہ کی طرف لے جائے جا رہے ہیں۔

اچھے رہے وہ مغل بچے جو اپنے پہ بھروسہ کر کے جدھر سینگ سمائے نکل گئے۔ بہت خوار ہوں گے' بہت مصیبتیں سہیں گے۔ مگر جان تو بچی رہے گی۔ وہ تین بدنصیب شہزادے مرزا مغل' خضر سلطان اور مرزا ابوبکر' انہوں نے کیا سوچا تھا کہ بادشاہ سلامت کے پیچھے چل پڑے اور مقبرۂ ہمایوں میں جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔ یہی سوچا تھا کہ بادشاہ سلامت کے صدقے میں ان کی بھی جانیں بچ جائیں گی۔ اب پتہ چلا کہ ان کی تو قضا انہیں وہاں کھینچ کر لے گئی تھی۔ ہڈسن کے تو سر پہ خون سوار تھا۔ بہادر شاہ ظفر کو تو اس نے اس لیے چھوڑ دیا کہ جنرل ولسن کی طرف سے ہدایت تھی کہ بادشاہ کو زندہ لے کر آنا ہے۔ شہزادوں کے سلسلہ میں تو ایسی کوئی ہدایت نہیں تھی۔

ہڈسن لپک کر پھر مقبرۂ ہمایوں پہنچا۔ اور پھر مولوی رجب علی نے اپنا ہنر دکھایا۔ اسے بگڑے ہوؤں کو راہ پہ لانے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس نے شہزادوں کو جانے کیا پٹی پڑھائی اور کونسا شیشہ دکھایا کہ وہ جھٹ پٹ راہ پہ آ گئے سو اندر سے پیغام آیا کہ شہزادے اپنے آپ کو حوالے کرنے پہ آمادہ ہیں۔ ہڈسن نے اس پر دس آدمی اندر بھیجے۔ اور لیجئے تینوں شہزادے رتھ میں بیٹھے چلے آ رہے ہیں۔ اس حال میں کہ پانچ پہریدار دائیں' پانچ پہریدار بائیں۔ آتے ہی انہوں نے سوال کیا کہ جان کی اماں ملے گی۔ ہڈسن نے تڑاخ سے جواب دیا "ہرگز نہیں۔"

ہڈسن نے پہلے تو اس ہجوم سے جو وہاں جمع تھا ہتھیار رکھوائے۔ پھر شہزادوں کو حکم دیا کہ یہ کپڑے لتے اتارو۔ پھر رائفل لے کر باری باری تینوں کو گولی ماری۔ پھر اپنے سپاہیوں سے کہا کہ ان لاشوں کو اٹھا کر شہر لے جاؤ اور جہاں باغیوں نے انچاس یورپیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا وہیں لے جا کر انہیں ڈھیر کر دو۔ اور پھر اس نے بغلیں بجائیں کہ آج اس نے تیمور کے گھرانے کا صفایا کر دیا ہے۔

اور لیجئے بہادر شاہ ظفر ہر پھر کر پھر لال قلعہ پہنچ گئے۔ مگر یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا۔ دنیا ہی بدل گئی۔ نہ لال قلعہ وہ لال قلعہ رہا نہ شاہ بہادر شاہ ظفر شاہ بہادر شاہ ظفر رہے۔ زمانے نے عجب طرح سے کروٹ لی کہ قلعہ میں جہاں مغل شہزادیاں شہزادے اتراتے پھرتے تھے اب فرنگی دندنا رہے تھے۔ کتنے فرنگی افسر اپنے اپنے ٹبر کو لے کر یہاں آن دھمکے تھے۔ اور لٹس پڑی ہوئی تھی۔ شاہی پوشاکیں گہنے پاتے ہیرے جواہرات یہ سب اغیار کے لیے لوٹ کا مال تھیں۔ اور مغلیہ تخت اور شاہجہانی قلعہ کا وارث اس قلعہ کے ایک برباد گوشے میں مقید بیٹھا تھا۔ کس حال میں بیٹھا تھا۔ یہ انہیں سے سنیے جنہوں نے اسے ان حالوں

پہنچایا تھا۔ اور کس کی مجال ہے کہ لال قلعہ میں جا کر جھانکے۔ اب وہاں فرنگیوں کی ریل پیل تھی۔ وہی معزول بادشاہ کے حال کے چشم دید گواہ بنے۔

طے یہ ہوا تھا کہ معزول بادشاہ کو جان کی اماں دی جائے گی۔ اور یہ کہ اس کے مقام و مرتبہ کا پاس لحاظ کیا جائے گا۔ پہلی شرط کو تو نبھایا گیا۔ مگر دوسری شرط کو پرکاہ کی اہمیت نہیں دی گئی۔ ہوگا بادشاہ۔ اب تو وہ فرنگیوں کا قیدی تھا۔ اس حال میں جنہوں نے دیکھا ان میں دو ایسے چشم دید گواہ ہیں جنہیں اعتبار کا درجہ حاصل ہے۔ ایک رچرڈ ٹمپل اور دوسرے لندن ٹائمز کے نامہ نگار رسل۔ رچرڈ ٹمپل کو تو اس مقدمے کے سلسلہ میں جو معزول بادشاہ پر چلنے والا تھا ملنا تھا۔ رسل نے اخباری نمائندے کی حیثیت سے ملاقات کی۔ پہلے رسل نے جو کچھ بیان کیا وہ سنیے:

''جہاں ہم اس وقت کھڑے تھے وہ ایک تنگ و تاریک راستہ تھا جو ایک کھلے صحن کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس سے آگے ایک کوٹھری تھی جو اس جگہ سے بھی زیادہ تاریک تھی۔ اس جگہ ایک نحیف و نزار بوڑھا شخص اکڑوں بیٹھا تھا۔ بر میں میلا کچیلا ململ کا کرتا۔ سر پہ چھوٹی سی ایک ٹوپی منڈھی ہوئی۔ پاؤں ننگے۔ ہم غلط وقت پر آئے تھے۔ اصل میں معزول بادشاہ بیمار تھا۔ اسے قے آ رہی تھی۔ قے کرنے کی کوشش میں وہ سامنے رکھے پیتل کے تسلے پر جھک کر بالکل دہرا ہو گیا تھا......

دیر بعد متلی رکی۔ لیکن اب بھی وہ رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ جواب وہ ہاتھ کے اشارے سے دے رہا تھا۔ ساتھ میں کچھ بڑبڑاتا جاتا تھا۔''

سر رچرڈ ٹمپل نے کس حال میں دیکھا' یہ بھی دیکھتے چلئے:

''مجھے معزول بادشاہ سے بھی ملنا تھا۔ عجب منظر تھا کہ وہ بوڑھا شخص اپنے ہی محل کی ایک تیرہ و تار کوٹھری میں بیٹھا تھا۔ تیکھے نقوش' محرابی بھویں' خمیدہ کمر' رنگ پیلا پھدق' چہرے پر ایک تشنج کی کیفیت۔ پتلی نازک انگلیوں کے بیچ گردش کرتی ہوئی تسبیح۔ ساتھ میں کچھ بڑبڑاتا جاتا تھا۔ بے ربط باتیں۔ مل جل کر عجب سی تصویر بنتی تھی کہ دیکھنے والے کو اگر ایشیا کی تاریخ سے تھوڑی واقفیت ہو تو وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ شخص جو یہاں اس حال میں بیٹھا تھا مغلیہ عظمیٰ کی آخری نشانی تھا۔ ان شہنشاہوں کی اولاد جنہوں نے دو سو برس تک دنیا کے دوسرے سب سے بڑی آبادی والے علاقے پر ٹھسے سے حکمرانی کی تھی۔ اور اگرچہ یہ بادشاہ پچھلے شہنشاہوں کی بس پرچھائیں کی حیثیت رکھتا تھا اسے بھی بہت شاہانہ عزت و وقار حاصل تھا۔ اور اب اسی شخص کی ان منصفوں کی عدالت میں پیشی ہونی تھی جن کے اجداد اس کے اجداد سے

لطف و کرم کے متمنی رہا کرتے تھے۔"

یہ بادشاہ کا حال تھا۔ اور اس کے شہر کا حال۔ مت پوچھو۔ دلی میں قیامت مچی ہوئی تھی۔ وہ مائی کے لال جو ہندوستان کو آزاد کرانے کا عزم لے کر اور مغل تخت و تاج کی بحالی کا ارادہ باندھ کر یہاں پہنچے تھے بساط بھر معرکہ آرائی کر کے تتر بتر ہو گئے۔ اب دلی کے شہری تھے اور مغلوب الغضب فرنگی تھے۔ ان کے دلوں میں آتش انتقام بھڑکی ہوئی تھی۔ جن سے انتقام لینا تھا وہ تو انہیں جل دے کر نکل گئے۔ نزلہ بر عضو ضعیف' شہری مخلوق جو لینے میں نہ دینے میں وہ اب مولی گاجر کی طرح کٹ رہی تھی۔ باقی غالب کی زبانی سنیے ؎

بسکہ فعالِ مایرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جاسکے یاں کا

غالب کے تو خاندانِ شریفی کی ہمسائیگی آڑے آ گئی۔ اس گھرانے کے حکیموں کا تعلق راجہ پٹیالہ سے چلا آتا تھا۔ اور راجہ پٹیالہ کا معاملہ انگریزوں کے ساتھ تھا۔ سو جب دلی پر فرنگیوں کا نزلہ گرا تو ریاست کے آدمی شریف منزل کی حفاظت کی خاطر کوچہ بلیماراں میں آ کر بیٹھ گئے۔ یوں پورے کوچے کی جان بچ گئی۔ اور غالب کی تو شریف منزل کی دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی۔ "بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے۔ اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں۔"

خیر جان تو بچی ہوئی تھی۔ مگر کس طرح۔ یہ غالب ہی سے سنیے کہ جو بھگتے وہ جانے:

"اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت

بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے شہر میں ہے کون۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدھم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر 1857ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں۔

جو دم ہے غنیمت ہے۔ اس وقت تک میں مع اہل و عیال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے کیا ہو۔ قلم ہاتھ میں لیے پر جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے۔ مگر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو ملیں گے۔ ورنہ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔''

مگر اس وقت تو پورے شہر کا معاملہ انا اللہ وانا الیہ راجعون ہی والا تھا۔ اس رستخیز بیجا میں کتنے دنوں موت کا بازار گرم رہا۔ فرنگیوں کی آتش انتقام کتنے دنوں بھڑکتی رہی۔ کتنے لوگ مارے گئے۔ کتنے جانیں اور عزت بچا کر شہر سے نکل گئے۔ اس کے بعد سناٹا۔ اور بقول غالب ''اجڑا ہو شہر نہ آدمی نہ آدم زاد۔''

اس اجڑے ہوئے شہر میں جب لندن ٹائمز کے رسل نے قدم رکھا تو عجب نقشہ دیکھا:

''میں نے اچانک اپنے آپ کو سنسان شہر کی تباہ و برباد سڑکوں پر پایا جہاں ہر مکان پر توپوں یا بندوق کی گولیوں کے نشان یا اس قسم کے آثار تھے جیسے یہاں بہت لوٹ مار ہوئی ہے۔ اس وقت معاً میرے تصور میں سیباسٹوپول شہر کا اس وقت کا نقشہ ابھرا جو مالاکوف کے شکست کھا جانے کے بعد وہاں نظر آتا تھا۔ جس وقت بلند و بالا لال فصیل کے سائے تلے ہماری گاڑی دوڑ رہی تھی تو سڑکوں پر بھوکے گدھوں اور ڈھیٹ کوؤں کے سوا کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا۔''

اور 'ہسٹری آف انڈین میوٹنی' کے مصنف چارلس بال نے اس اجڑے شہر کا جو رنگ دیکھا وہ یوں بیان کیا:

''مغلوں کا یہ عروس البلاد کھنڈروں اور ملبے کا ڈھیر بن کر رہ گیا تھا۔ مکانوں میں اور سڑکوں پر ہو کا عالم تھا۔ کوئی شخص یہاں حفاظت پر مامور نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے تباہ شدہ دروازوں اور منہدم میناروں پر ویرانی چھائی ہوئی تھی اور بربادی کا نقشہ تھا۔ اور بھنگی دلی کے اندر ہزاروں لوگوں کی لاشوں کو جمع کر کے گڑھوں میں دبا رہے تھے جنھوں نے مغلیہ تخت کی بحالی کے لیے اپنی جانیں قربان کی تھیں۔ اور اب پورے شہر میں کوئی ایک آدمی ایسا نہیں رہ گیا تھا جو شہر کے فاتحوں کے خلاف چوں بھی کر سکے۔''

کہاں گئے وہ لوگ

''صاحب، تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقعہ ہوا۔ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم باہم دوست تھے۔ اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت پیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔ اس زمانے میں ایک بزرگ تھے۔ اور ہمارے تمہارے دلی دوست تھے۔ منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر ان کا تخلص۔ نہ وہ زمانہ نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔

''بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب آیا۔ ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال متخلص بہ تفتہ ہو۔ اور میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا دلی۔ اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں سے نہیں پایا جاتا۔

واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر کیا غریب کیا اہل حرفہ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہندو البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔''

غالب نے صحیح کہا۔ وہ جنم اور تھا۔ اور دنیا ہی اور تھی۔ اس کا نام تھا جہان آباد۔ اس رستخیز بیجا میں وہ دنیا ملیامیلٹ ہو گئی۔ اب جو ہنگامہ کسی قدر ٹھنڈا پڑا تو کیا دیکھا کہ سارا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ وہ لوگ کہاں گئے۔ وہ دوستیاں، وہ محبتیں، وہ رفاقتیں کیا ہوئیں۔ وہ نگر جس میں یہ سب کچھ تھا اس کی تو بساط ہی الٹ چکی تھی۔ بستیاں بستے بستے بستی ہیں اور دھیرے دھیرے اجڑتی ہیں۔ یہی طور دیکھنے میں آیا ہے۔ مگر یہ نگر ایک جشن کے ساتھ شروع ہوا اور ایک دھماکے کے ساتھ بکھر گیا۔ 1648ء میں لال قلعہ کے افتتاح کے ساتھ

جہان آباد کا افتتاح ہوا۔ اور 1857ء میں جب آخری مغل تاجدار لال قلعہ کو آخری سلام کہہ رہا تھا اس نے کشت و خون کے بیچ آخری سانس لیا اور دم دے دیا۔

جب طوفان کا زور ٹوٹا تو غالب نے آنکھ کھول کر ارد گرد نظر ڈالی کہ کیا کچھ چلا گیا اور کیا کچھ بچ گیا۔ پتہ چلا کہ ''سینکڑوں عزیز راہیِ ملک عدم ہوئے۔ سینکڑوں ایسے مفقود الخبر ہو گئے کہ ان کے مرگ و زیست کی خبر نہیں۔ دو چار باقی رہتے ہیں' خدا جانے کہاں بستے ہیں۔'' مگر پھر رفتہ رفتہ ان دو چار میں سے تین کا پتہ پایا۔ ''میرٹھ میں مصطفےٰ خاں' سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں' بلی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم۔''

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اور صدرالدین آزردہ دونوں ہی مجرم ٹھہرے تھے۔ شیفتہ کو سات برس کی قید ہوئی تھی۔ مگر پھر ان کی تقصیر معاف ہوئی اور رہائی ملی۔ مگر صرف رہائی کا حکم ہوا۔ ''جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔''

مفتی صدرالدین کا جرم تو واضح تھا۔ انہوں نے جہاد کے فتوے پر دستخط کیے تھے۔ سو دھرے گئے۔ پھر کیا گذری۔ یہ غالب سے سنیے:

> ''حضرت مولوی صدرالدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف' جائیداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹننٹ گورنر نے از راہ ترحم نصف جائیداد واگذاشت کی۔ اب نصف جائیداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں۔ اگرچہ یہ امداد ان کے گذارے کو کافی ہے اس واسطے سے کہ ایک آپ اور ایک بی بی۔ تیس چالیس روپے مہینے کی آمدنی۔ ضعفِ پیری نے گھیر لیا ہے۔''

اس پریشاں حالی و درماندگی میں پرانے رفیقوں کو یاد کرتے تھے اور روتے تھے۔ اسی عالم میں ایک مرثیہ لکھا ؎

ٹکڑے ہوتا ہے جگر' جان پہ بن آتی ہے
مصطفےٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیوں نہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

امام بخش صہبائی کو پھانسی لگی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔ احمد حسین میکش کا کیا انجام ہوا' یہ غالب سے سنیے: ''احمد حسین میکش کا حال کچھ تم کو معلوم ہے یا نہیں۔ مخنوق ہوا' گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں۔''

جہاں آباد اپنی بساط لپیٹتے لپیٹتے اپنے کتنے فرزندوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ چاندنی چوک کے بیچ پھانسی کا تختہ نصب تھا۔ آگے یہاں ہزاری بزاری گھومتے پھرتے تھے۔ دم کے دم میں سینکڑوں ہزاروں کا سودا ہوتا۔ اب یہاں موت کی گرم بازاری تھی۔ ادھر دہلی دروازے کے باہر میدان میں کتنے معززین مقید بیٹھے تھے اور اپنی اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد اور 'دہلی اردو اخبار' کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر بھی تھے۔ باپ نے موت کی سزا پائی۔ بیٹا بھیس بدل کر اور استاد کا دیوان بغل میں داب کر شہر سے نکلا اور دربدر پھرتا پھراتا لاہور کی طرف نکل گیا۔ 'City of Djinns' کے مصنف کے حساب سے تین ہزار دلی والے بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہوئے اور موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ کسی کو پھانسی' کسی کو گولی اور کسی کو توپ کے دہانے سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ اس کے بیان کے مطابق فرنگی سپاہیوں کا ایک شوق یہ تھا کہ پھانسی پر چڑھنے والوں کو تڑپتا ہوا دیکھیں۔ سو وہ جلادوں کو رشوت دیتے تھے کہ ملزم کو دیر تک لٹکائے رکھو کہ تڑپنے کا تماشہ دیکھا جا سکے۔

قصہ مختصر جو زد میں آ گیا وہ مجرم ٹھہرا اور پھانسی پر چڑھ گیا۔ بقول غالب ''ہر شخص کی نوشت کے مطابق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے' نہ قاعدہ۔ نہ نظیر کام آئے نہ تقریر پیش جائے۔'' کتنے جان بچا کر بھاگے اور شہر سے نکل گئے۔ ان کی قسمت میں دربدری خاک بسری لکھی گئی۔

آدمیوں کے ساتھ یہ گذری۔ پھر سنگ و خشت کی باری آئی۔ جہان آباد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ بھاوڑا بجنے لگا۔ کدالیں چلنے لگیں۔ محلے برباد' کوچے اجاڑ۔ غالب نے ایک دوست کو لکھا کہ ''ایک شیر زور آور اور پیل تن بندر پیدا ہوا ہے۔ مکانات جا بجا ڈھاتا پھرتا ہے۔ فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو جو گلدستے ہیں جس کو عوام گمزی کہتے ہیں انہیں ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنا ڈھا دی۔ اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ واہ رے بندر۔ یہ زیادتی اور شہر کے اندر۔''

ایک فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر موقوف تھوڑا ہی تھا۔ حویلیاں' مسجدیں' سرائیں سب برباد۔

غالب نے دیکھا اور یوں بیان کیا:

''یہاں شہر ڈھے رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار'خاص بازار'اور اردو بازار' اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا۔ اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبانِ امکنہ و دکاکین' نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی۔ برسات بھر مینہ نہیں برسا۔ اب تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکان گر گئے۔

''بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچہ کا بقیہ مٹایا گیا۔ کشمیری کٹڑے کی مسجد زمین کا پیوند ہوگئی۔ سڑک کی وسعت دو چند ہوگئی۔

''مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مقام ہو جائے۔

''مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کوئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہوگیا' یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہوگیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہتے ہیں۔ باقی سب مٹ گیا۔ آہنی دروازے کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہوگیا۔ پنجابی کٹڑہ' دھوبی واڑہ' راجی گنج' سعادت خاں کا کٹڑہ' جرنیل کی بی بی کی حویلی' رام جی داس گودام والے کے مکانات' صاحب رام کا باغ اور حویلی۔ ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔

''کشمیری کٹڑہ گر گیا ہے۔ وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دو رویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔ کشمیری کٹڑے کی مسجد زمین کا پیوند ہوگئی۔

''آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزاخانہ ہے۔ ایک بنائے قدیم' رفیع مشہور۔ اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا۔

''قصہ مختصر شہر صحرا ہوگیا۔

اور پھر اس کے بعد۔ اس کے بعد کا احوال یوں ہے:

''شہر چپ چاپ۔ نہ کہیں پھاوڑا بجتا ہے نہ سرنگ لگا کر کوئی مکان اڑایا جاتا ہے۔ نہ آہنی سڑک آتی ہے نہ کہیں دمدمہ بنتا ہے۔ دلی شہر شہرِ خموشاں ہے۔''

بلکہ یوں کہئے کہ اب جہان آباد شہر برباد ہے۔ غالب کے لفظوں میں ایک غارت زدہ شہر۔

مگر جہان آباد کی دو بڑی نشانیاں ابھی تک باقی تھیں۔ لال قلعہ اور جامع مسجد۔ ان کا کیا بندوبست کیا جائے۔ ویسے تو شروع میں انہیں بھی ڈھانے ہی کے منصوبے باندھے گئے تھے۔ 'سٹی آف جنز' کے مصنف نے ایک فرنگی ہگ چیسٹر کا یہ بیان نقل کیا ہے:

''شہر میں کتنی ہی مسجدیں ہیں کہ کمال خوبصورت ہیں۔ لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ ان سب کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ ان اجڈ بدمعاشوں نے ہمارے گرجا گھروں اور قبرستانوں کی بے حرمتی کی ہے۔ سو میری دانست میں تو ہمیں ان کے بدبودار مذہب کا کوئی پاس لحاظ نہیں کرنا چاہیے۔ پہلے تو یہ دستور چلا آتا تھا کہ ان مسجدوں میں قدم رکھنے سے پہلے جوتے اتار دیئے جاتے تھے۔ بادشاہ کے حضور جانے سے پہلے بھی یہی رسم برتی جاتی تھی۔ لیکن ہم اب یہ پروا نہیں کرتے۔ اور وہ سوٗر بوڑھا بادشاہ' میں اسے دیکھ آیا ہوں۔ بالکل بوڑھا پھونس ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی خدمت گار ہے۔''

تو منصوبے تو یہ تھے مگر شاہجہاں کی بنائی ہوئی عمارتیں ڈھانے والوں پر بھاری پڑیں۔ یہ احوال غالب سے سنیے:

''اللہ اللہ قلعہ میں اکثر اور شہر میں بعض بعض وہ شاہجہانی عمارتیں ڈھائی گئی ہیں کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں۔ بلکہ قلعہ میں تو ان آلات سے کام نہ نکلا۔ سرنگیں کھودی گئیں اور بارود بچھائی گئی اور مکانات سنگین اڑا دیئے گئے۔''

ابتدائی منصوبہ تو یہی تھا کہ پورے قلعہ کو ڈھا دیا جائے اور اس کی جگہ وکٹوریہ فورٹ تعمیر کیا جائے۔ شہر کی فصیل کو بھی ڈھانے کا منصوبہ تھا۔ اصل میں تو منصوبہ یہ تھا کہ پورے شہر کو نیست و نابود کر کے اپنی فتح کی خوشی میں ایک نیا شہر آباد کیا جائے۔ مگر جو کام جوش انتقام میں آسان نظر آ رہا تھا پتہ چلا کہ وہ مشکل کام ہے۔ فصیل کے سلسلہ میں تو جان لارنس نے صاف صاف کہہ دیا کہ سات میل لمبی فصیل کو ڈھانے کے لیے جتنا بارود چاہیے وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ قلعہ کی کتنی عمارتیں ڈھا دی گئیں' کتنے خوبصورت گوشے تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ مگر پھر یہ کام بھی مشکل نظر آیا۔ آخر صلاح یہ ٹھہری کہ اسے ڈھا دینے سے بہتر یہ ہے کہ یہاں فوج ڈیرا کرے۔ جامع مسجد کے سلسلہ میں لارڈ ایجرٹن نے تجویز پیش کی کہ اسے مسمار کر دیا جائے۔ بعض افسروں نے اس تجویز میں اضافہ کیا اور کہا کہ ڈھا کر یہاں گرجا گھر تعمیر کیا جائے۔ لیکن شہر' قلعہ اور

مسجد کے سلسلہ میں کسی ایک تجویز پر بھی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ یا کہہ لیجئے کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ سو قلعہ کا نقصان تو بہت ہوا مگر بچ گیا۔ جامع مسجد سالم بچ گئی۔ ہاں دو اور مسجدیں تھیں۔ مسجد فتحپوری اور زینت المساجد۔ مسجد فتحپوری کا مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ لالہ چھنامل نے کہ اب وہ دلی کے بہت بڑے بینکر تھے اسے خرید لیا۔ زینت المساجد میں بیکری کھل گئی۔

فلک بالِ ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی

صاحبو! لال قلعہ میں اب ایک نیا گل کھلا ہے۔ لال قلعہ کا خاص الخاص گوشہ دیوانِ خاص۔ اس مرمریں عمارت ہی کے بیچ تو تخت طاؤس رکھا گیا تھا۔ اندر کے رخ محرابوں کے اوپر سونے کے پانی سے لکھا ہوا یہ شعر ہے

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

گویا شاہجہاں نے یہاں زمین پر ایک جنت بنائی تھی۔ اور آج اس شاہجہانی جنت میں فرنگی کی فوجی عدالت لگی تھی اور اس جنت کا وارث آخری مغل تاجدار تاج و تخت سے محروم ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ فردِ جرم عائد ہو چکی تھی۔ گواہیاں ہو رہی تھیں اور گواہوں پر جرح۔ بے تاج بوڑھا بادشاہ ایسے بیٹھا تھا جیسے اس سارے قصے سے بے تعلق ہو۔ اپنے آپ میں گم۔ آنکھیں خلا میں گھورتی ہوئیں۔ بیچ بیچ میں اونگھ آ جاتی۔ آنکھیں مند جاتیں۔ پھر ہڑبڑا کر آنکھیں کھولتا۔ جاری بیان میں سے کوئی فقرہ کان میں پڑتا اور وہ سرگرمی سے اس کی تردید کرتا۔ غلط، بالکل غلط۔ مگر پھر فوراً ہی بے تعلق ہو جاتا اور جب اس سے جرح کرنے کو کہا جاتا تو اس سے معذرت کر لیتا۔

غلام عباس کا بیان ہو رہا ہے۔ یہ شخص بادشاہ کا وکیل ہے۔ مگر اسے گواہی بھی دینی ہے کہ وہ بہت سے معاملات کا چشم دید گواہ ہے۔ ''اس کے کچھ ہی دیر بعد۔'' اس نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا'' دونوں پیدل کمپنیاں جو قلعہ کے دروازے پر محافظ تھیں مع مفسد رسالہ کے جو میرٹھ سے آیا تھا دربارِ خاص کے سامنے کے میدان میں آ گئیں اور اپنی بندوقیں، قرابینیں اور تمنچے ہوا میں اڑانے لگیں اور بڑا غل مچایا۔

بادشاہ یہ غل سن کر باہر نکل آئے اور دربارِ خاص کی چوکھٹ پہ کھڑے ہو کر اپنے خواصوں کو حکم دیا کہ رسالوں سے خاموش ہونے کے لیے کہیں اور ہندوستانی افسروں کو آگے بلایا کہ ان سے اس کارروائی کا منشا دریافت کریں۔ اس پر غل کم ہو گیا۔ اور رسالہ کے افسر آگے بڑھے اور بیان کیا کہ انہیں کارتوسوں کو منھ سے کاٹنے کا حکم دیا گیا تھا جس کا منشا یہ تھا کہ ہندو ہوں خواہ مسلمان اپنے اپنے مذہب سے گمراہ ہو جائیں کیونکہ کارتوسوں میں گائے اور سوٗر کی چربی لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے میرٹھ میں انگریزوں کو قتل کیا اور بادشاہ کی محافظت کے لیے یہاں آئے ہیں۔

بادشاہ نے جواب دیا ''میں نے تمہیں نہیں بلایا۔ اور جو کچھ تم نے کیا بہت برا کیا۔''

یہ سن کر سو یا دو سو مفسد پیادہ فوج جو اس وقت میرٹھ سے آئی تھی سیڑھیوں پر چڑھ کر کمرے میں آ گئی۔ اور کہا جب تک حضور یعنی بادشاہ ہمارے ساتھ نہ ہوں گے ہم سب بے سردار ہیں۔ اور حضور کے ساتھ ہونے سے ہم اپنے ارادے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

''اس پر بادشاہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور ہر سپاہی اور افسر غرض کہ کل یکے بادیگرے آگے بڑھے اور ہر شخص بادشاہ کے آگے سر جھکا کر کہتا تھا کہ 'حضور ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں۔'' بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور ہر شخص جو اس کے دل میں آیا کہتا ہوا واپس ہوتا گیا......

''دوسری صبح کو قلعہ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جو توپیں رات کے دس یا گیارہ بجے چھوٹی تھیں وہ دہلی کے دیسی توپ خانے والوں نے بادشاہ کی سلامی میں فائر کی تھیں۔''

سوال:۔ جب بادشاہ نے دیسی افسروں اور سپاہیوں کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کا کیا منشا تھا۔ کیا اس سے یہ مراد تھی کہ ان کی خدمات منظور کی گئیں؟

جواب:۔ یہ ان کی اطاعت اور خدمات کو منظور کرنے ہی کے برابر تھا۔ مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت بادشاہ کا کیا ارادہ تھا۔

سوال:۔ بادشاہ کے اختیارات دہلی میں کب عام طور پر مشتہر ہوئے یا یہ بات کب مشہور ہوئی کہ بادشاہ نے عنانِ حکومت اختیار کی؟

جواب:۔ مجھے نہیں معلوم کہ کوئی باقاعدہ شہرت اس بات کی دی گئی۔ ممکن ہے ایسا ہوا ہو اور مجھے اس کا علم نہیں ہوا ہو۔ مگر جس دن فساد ہوا اس دن بادشاہ کے اختیارات قائم ہو گئے تھے۔

سوال:۔ کیا اسی وجہ سے اس کی سلامی کی توپیں چھوٹی تھیں؟

جواب:۔ میں نہیں جانتا۔ جو کچھ میں نے سنا وہ یہ تھا کہ توپ خانہ والوں نے شاہی حکومت میں آنے کے موقع پر بطور سلامی فایر کی تھیں۔

سوال:۔ تمہیں معلوم ہے کتنی توپوں کی سلامی ہوئی تھی؟

جواب:۔ میرے خیال میں معمولی شاہی سلامی کی توپیں فایر ہوئی تھیں۔

سوال:۔ کس دن بادشاہ نے پہلا دربارِ عام کیا؟

جواب:۔ فساد کے دن ہی سے روزانہ دربار ہوتا تھا۔ رسالہ والوں کو جو پہلا موقع حاضری کا دیا گیا وہی اول دربار خیال کرنا چاہیے۔''

اب مقدمے کی سماعت کا چھٹا دن ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں عدالت میں کھڑے ہیں۔

سوال:۔ کیا تم مسمی محمد حسن عسکری واعظ ساکن دہلی سے واقف ہو؟

جواب:۔ ہاں میں جانتا ہوں۔ وہ دہلی دروازے کے قریب رہتا تھا اور بادشاہ کے پاس اکثر آیا کرتا تھا۔

سوال:۔ وہ بادشاہ کے پاس اکثر کس وقت آتا تھا اور کب پہلی پہل وہ بادشاہ کے روبرو پیش ہوا تھا؟

جواب:۔ عرصہ قریباً چار سال کا ہوا کہ وہ پہلی پہل بادشاہ کے روبرو پیش کیا گیا تھا۔ بادشاہ کی ایک لڑکی اس کی مرید ہوگئی۔ اور اس کی پرہیزگاری کی اس قدر تعریف کی کہ بادشاہ نے اسے اپنی بیماری کے زمانے میں اپنی صحت کے لیے دعا کرانے اور آرام کرنے کے لیے نوکر رکھا تھا۔ گذشتہ دو یا تین سال کے اندر اس کی آمدورفت بہت بڑھ گئی۔ یہ لڑکی دہلی دروازے پر حسن عسکری کے مکان کے قریب ہی رہا کرتی تھی اور مشہور تھا کہ وہ اس کی بیوی ہے۔

سوال:۔ کیا اس شخص حسن عسکری نے یہ بھی دھوکا دیا تھا کہ اسے مکاشفہ ہوتا ہے' آئندہ ہونے والے واقعات پہلے سے بتا سکتا ہے؟

جواب:۔ وہ خوابوں کی تعبیر دیا کرتا تھا اور آئندہ کے واقعات پہلے سے بتایا بھی کرتا تھا اور مکاشفہ کا اقرار بھی کیا تھا۔

سوال:۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس نے کبھی اس لڑائی کے متعلق بھی پیشین گوئی کی تھی جو اس وقت انگلستان اور شاہ فارس کے درمیان ہو رہی تھی؟

جواب:۔ جس زمانے میں انگریزوں اور شاہ فارس میں لڑائی ہو رہی تھی اس نے کچھ نہیں کہا۔ البتہ عرصہ دو

سال کا ہوا اس نے قیدی (یعنی بادشاہ) سے چار سو روپے لے کر ایک شخص کو دیئے اور یہ ظاہر کیا کہ وہ مکہ معظمہ جاتا ہے۔ مگر بعد میں یہ بات کھل گئی کہ وہ شخص حج کے لیے نہیں گیا بلکہ شاہ ایران کے پاس گیا۔ اس شخص کا نام شیدی قنبر تھا جو ابی سینیا کا رہنے والا تھا اور غالباً وہیں سے آیا تھا۔

سوال:۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس شخص کا مکہ جانا کیوں ظاہر کیا گیا اور شاہ فارس کے پاس جانا کیوں نہ ظاہر کیا گیا؟

جواب:۔ میں نے اس کی بابت استفسار نہیں کیا۔ مجھ سے عدالت کے جاسوس مسمی جٹویا جٹمل نے یہ کہا کہ حسن عسکری نے اس شخص کو بجائے مکہ کے ایران بھیجا تھا۔ اور عدالتی ملازمین سے دریافت کرنے پر اس خبر کی تصدیق ہوگئی۔

سوال:۔ تم نے کبھی سنا کہ اس سفارت کے بھیجنے کا کیا مطلب تھا؟

جواب:۔ نہیں۔ مگر قلی خاں اور بسنت بادشاہ کے دو جانثاروں سے یہ معلوم ہوا تھا کہ حسن عسکری نے شیدی قنبر کو کچھ کاغذات رات کے وقت دے کر جن پر شاہی مہر ثبت کرائی گئی تھی ایران روانہ کیا۔

سوال:۔ کیا قلعہ میں انگریزوں اور ایرانیوں کی لڑائی کے تذکرے اکثر ہوا کرتے تھے اور بادشاہ اس گفتگو پر دلچسپی ظاہر کیا کرتے تھے؟

جواب:۔ نہیں۔ اس مضمون پر دلچسپی اور گفتگو خاص کر نہ ہوتی تھی۔ ہندوستانی اخبار جو قلعہ میں آتا تھا اس سے لڑائی کی ترقی کا حال معلوم ہوتا تھا۔ اور بادشاہ کبھی کسی طرح ان میں قابل لحاظ دلچسپی ظاہر نہیں کرتے تھے۔

سوال:۔ کیا دہلی کے مسلمانوں میں اس لڑائی سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اور کیا یہ لڑائی ان کے نزدیک مذہبی لڑائی سمجھی جاتی تھی؟

جواب:۔ نہیں، دہلی کے مسلمان اہل سنت والجماعت ہیں۔ اور ایرانی امامیہ مذہب کے ہیں لہٰذا اول الذکر نے اس لڑائی سے زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کی۔

سوال:۔ تم نے یہ بھی سنا کہ بادشاہ نے ایک مکہ جانے والے قافلہ کے ساتھ کچھ آدمی قسطنطنیہ بھیجے تھے؟

جواب:۔ نہیں، مجھے نہیں معلوم۔

سوال:۔ کیا کوئی تحریر جس پر شاہ ایران کی مہر لگی ہوئی تھی جامع مسجد یا شہر کے کسی اور مقام پر فساد ہونے سے پیشتر چسپاں ہوئی تھی؟

جواب:- ہاں بلوہ سے چند ماہ پیش تر میں یہ سنتا تھا کہ شاہ ایران کی طرف سے کوئی اشتہار جامع مسجد میں چسپاں ہوا تھا؟

سوال:- کیا تم نے یہ بھی سنا تھا کہ یہ کاغذ کیوں آیا تھا؟

جواب:- نہیں۔ مگر یہ سنا تھا کہ اس کے مضمون سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اہل شیعہ نے اسے لکھا ہے۔

سوال:- اس کی عبارت کیا تھی؟

جواب:- میں نے یہ سنا تھا کہ اس میں مسلمانوں کے کل فرقوں کو نصیحت تھی کہ باہمی نفاق کو دور کر دیں اور موجودہ وقت میں سب مسلمان متفق ہو جائیں اس کی ضرورت ہے کہ ایک جھنڈے کے نیچے لڑنے کے لیے آمادہ ہو جائیں......

پھر جٹ مل لفٹنٹ گورنر آگرہ کا اخبار نویس حاضر عدالت ہوا اور باقرار صالح بیان کیا۔

سوال:- تم حسن عسکری نامی شخص سے واقف ہو؟

جواب:- ہاں میں واقف ہوں......وہ حسب معمول قلعہ میں آیا کرتا تھا اور کچھ پڑھ کر بادشاہ پر دم کرتا تھا۔ اس نے بارہا اپنی زبان سے کہا کہ مجھے خدا نے معجزہ ورسالت وقوت تعبیر خواب عطا کی ہے۔

اس وقت قیدی نے بیساختہ اپنے عقیدے کا اظہار کیا کہ حسن عسکری ان تمام قوتوں پر حاوی تھا جو اس سے منسوب کی جاتی ہیں۔

سوال:- کیا تم نے کسی خاص خواب کا حال بھی سنا؟

جواب:- ہاں، جس وقت ایرانی فوجیں ہرات میں آئیں اس وقت ایک خواب کا حال سنا تھا۔ اس وقت حسن عسکری نے اپنا ہی ایک خواب بادشاہ کے سامنے اس طرح بیان کیا تھا کہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ مغرب کی طرف سے سخت آندھی اٹھی اور اس کے بعد اس قدر بارش ہوئی کہ تمام ملک برباد ہو گیا۔ یہ طوفان جب فرو ہو گیا تو بادشاہ کو اس سے کسی قسم کی اذیت نہیں پہنچی بلکہ اس طوفان سے سنبھل گیا اور اپنے پلنگ پر بیٹھا رہا۔ اس خواب کی تعبیر حسن عسکری نے یہ دی کہ شاہ ایران ایشیا میں انگریزی فوجوں کو برباد کر کے بادشاہ کو اس کے تخت پر بٹھا دے گا۔ اور اس کی سلطنت پھر اس کے قبضے میں آجائے گی۔ اور کافر یعنی انگریز قتل ہو جائیں گے۔

سوال:- کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس شخص حسن عسکری کی معرفت شاہ ایران سے قیدی کی خط و کتاب ہوئی تھی؟

جواب:- ہاں مجھے معلوم ہے خط جایا کرتے تھے۔ عرصہ ڈیڑھ یا دو سال کا ہوا ایک قافلہ مکہ جا رہا تھا۔ شیدی

قنبر حبشیوں کے سردار نے قافلہ کے ساتھ حج پہ جانے کی درخواست کی۔ اس کی درخواست منظور ہوئی اور اس وقت کے رواج کے مطابق اسے ایک سال کی تنخواہ پیشگی دی گئی۔ یہ مشہور ہے کہ قیدی نے اسے ایک عرضی خدا کے نام دی کہ خانۂ کعبہ کی دیوار پر اس کی طرف سے باندھ دینا۔ آٹھ یا نو روز کے بعد میں نے یہ سنا کہ شیدی قنبر کا مکہ جانا محض حیلہ تھا۔ وہ شاہ دہلی کا خط شاہ ایران کے نام لے کر فارس گیا ہے۔

سوال:۔ کیا انگریزوں اور ایرانیوں کی لڑائی کا تذکرہ بادشاہ اور قلعہ کے آدمی اکثر کیا کرتے تھے؟

جواب:۔ ہاں قلعہ اور شہر میں اکثر اس کا چرچا رہتا تھا۔

سوال:۔ کیا اس لڑائی کا تذکرہ مذہبی پیرائے میں ہوتا تھا اور مسلمانانِ شہر کو یہ امید تھی کہ اس لڑائی کی بدولت وہ پھر با اختیار ہو جائیں گے۔

جواب:۔ ہاں ہر شخص کا یہی گمان تھا۔ مگر واقف کار تو یہ کہا کرتے تھے کہ شاہ ایران ہرگز انگریزوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔

سوال:۔ کیا تمہارے نزدیک قلعہ میں میرٹھ سے سپاہیوں کے آنے کا انتظار تھا؟

جواب:۔ ہاں ان کا انتظار تھا۔ اتوار کے دن اس مضمون کی چٹھیاں آئی تھیں کہ بیاسی سپاہیوں کو قید ہوئی ہے اور اس بنا پر سخت فساد ہوگا۔ باوجود اس کے قلعہ کے دروازے کے گارد نے اس خبر کو خفیہ نہ رکھا اور علانیہ اپنے ارادے کا اظہار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ رسالے میرٹھ میں غدر کر کے دہلی آویں گے۔

اظہار حسن عسکری

پیرزادہ حسن عسکری عدالت میں طلب ہوئے اور انہیں حلف دیا گیا۔

سوال:۔ اس عدالت میں یہ اظہار ہوا ہے کہ تم نے شیدی قنبر بادشاہی ملازم کو شاہ کی طرف سے خطوط دے کر ایران بھیجا تھا؟

جواب:۔ مجھے اس معاملہ کی اصلاً خبر نہیں ہے۔

سوال:۔ عدالت میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ تمہیں قوت پیشین گوئی حاصل ہے۔ تم خوابوں کی تعبیر دیتے تھے اور تم نے خدا سے ہمکلام ہونے کا حیلہ اور صاحب معجزہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا؟

جواب:۔ خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے کبھی اس قسم کی باتوں کا حیلہ نہیں کیا۔

سوال:۔ کیا تم نے اپنا یہ خواب بادشاہ سے بیان کیا تھا کہ ایک طوفان مغرب یا اور کسی سمت سے ہندوستان پر آیا

ہے اور طغیانی کے سبب روئے زمین برباد ہو گئی۔ اور اس سے بادشاہ کو فروغ ہوا اور انگریز تباہ ہو گئے۔

جواب:- خدا جانتا ہے نہ تو میں نے کبھی ایسا خواب دیکھا اور نہ کبھی ایسا خواب بیان کیا۔ البتہ قلعہ والوں نے اکثر ایسے خواب مجھ سے بیان کیے جس کی تعبیر میں نے توہمات سے کی۔ اور مجھ کو خواب پر اعتقاد نہیں ہے۔

اظہار مکند لال بادشاہ دہلی کا سکتر

مکند لال نے مختلف سوالوں کے جواب دیئے اور کہا ''اس دن (11 مئی) یہ ڈھنڈورا پٹا کہ خدا شہنشاہ عالم ہے اور بہادر شاہ اس ملک کے بادشاہ۔ اور ان کا حکم بالاتر ہے۔ دوسرے دن 12 مئی کو جب میرٹھ کے سوار اور دہلی کے رسالے ملے بادشاہ نے تخت پر بیٹھ کر وزیر محبوب علی خاں کو کل فوج کی دعوت کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ فوج میں شیرینی تقسیم ہوئی اور افسروں کو روپے بھی دیئے گئے۔ 1842ء سے پیشتر بادشاہ خاص خاص موقعوں پر چاندی کے تخت پر بیٹھ کر جو دربارِ خاص میں رہتا تھا انعامات دیتے تھے۔ مگر اس کے بعد ایجنٹ گورنر جنرل نے اس رسم کو بند کر دیا اور تخت کو اٹھوا کر بادشاہ کے خلوت خانے کے نیچے والے راستے میں رکھوا دیا۔ 12 مئی کو بادشاہ نے اسے منگا کر اس پر بیٹھ کر دربار کیا۔''

یہ تھیں اس مقدمے کی جھلکیاں بواسطہ میرزا حیرت دہلوی جنھوں نے انگریزی میں شائع ہونے والی روئیداد کا از اول تا آخر اردو میں ترجمہ کر ڈالا۔ یہ مقدمہ 27 جنوری 1857ء کو شروع ہوا اور اکیس پیشیوں کے بعد 9 مارچ کو اختتام پذیر ہوا۔

مگر یہ تو سب رسمی کارروائی تھی۔ یا کہہ لیجئے کہ مرے کو ماریں شاہ مدار۔ جاں بخشی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ نبھایا گیا۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ ذلیل و خوار بھی نہ کریں۔ سو فیصلہ توقع کے مطابق ہوا۔ جلاوطنی کی سزا سنائی گئی۔ تجویز کیا گیا کہ کالے پانی بھیج دیا جائے یا سرکار برطانیہ جہاں بھیجنا مناسب سمجھے۔ آخر کے تئیں فیصلہ یہ ہوا کہ رنگون بھیج دیا جائے۔

17 اکتوبر 1857ء کو مقید بادشاہ کی سواری لال قلعہ سے نکلی۔ یہاں سے نکل کر کہاں جاتا ہے یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ ہمراہ جو لوگ چلے ان میں ملکہ زینت محل، دو شہزادے جواں بخت اور شاہ عباس مخصوص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ قافلہ دلی سے نکل کر الٰہ آباد پہنچا۔ الٰہ آباد سے کلکتہ۔ کلکتہ پہنچ کر سرزمین ہند کو آخری سلام کیا اور جہاز پر سوار ہو کر رنگون کی طرف روانہ ہو گیا۔

اجاڑ شہر

''اجڑا ہوا شہر۔ نہ آدمی نہ آدم زاد۔ مگر ہاں دو ایک مصوروں کو آبادی کا حکم ہو گیا ہے۔ وہ رہتے ہیں۔ سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے لٹنے کے آباد ہوئے ہیں۔ تصویریں بھی ان کے گھروں سے لٹ گئیں۔ جو کچھ رہیں، وہ صاحبانِ انگریز نے بڑی خواہش سے خرید کر لیں۔''

غالب نے یہ خط منشی شیونرائن کو 23 اکتوبر 1857ء کو لکھا تھا۔ گویا سال سے اوپر گذر چکا تھا اور شہر اسی طرح اجڑا پڑا تھا۔ گلی کوچے ہو حق کر رہے تھے۔ جو خلقت گھروں کو چھوڑ کر باہر نکل گئی تھی وہ ہنوز شہر کے باہر ڈیرے ڈالے پڑی تھی۔ کتنے واپسی کے خیال سے مایوس ہو کر آگے نکل گئے۔ جس کے جہاں سینگ سمائے وہاں چلا گیا۔ مگر ایک بڑی خلقت نے زمین پکڑی تھی اور واپسی کی امید میں دن گن رہی تھی مگر واپسی نہ اب ہوتی ہے نہ تب ہوتی ہے۔ کتنے لوگوں نے سر چھپانے کے لیے کچے پکے گھر کھڑے کر لیے مگر فرنگی حاکموں کو یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ حکم نکلا کہ جو مکان بنے ہیں انہیں ڈھا دیا جائے اور آئندہ کے لیے تنبیہ کر دی جائے کہ کوئی مکان نہ بنائے۔

یہ حال تھا جب چند مصوروں کو اکتوبر 57ء میں شہر میں واپسی کی اجازت ملی۔ نومبر کے آتے آتے ہندوؤں کو بھی واپسی کی اجازت مل گئی۔ مسلمان ہنوز اس رعایت سے محروم تھے۔ مگر 1859ء کے شروع ہونے پر یہ سن گن ملی کہ اب شاید مسلمانوں کو بھی واپسی کی اجازت مل جائے مگر کس طرح۔ یہ غالب سے سنیے:

> ''اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بہ قدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی

رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے' آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھیے شہر میں بسنے کی کون مہورت ہے۔ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں' یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں' الملک للہہ والحکم للہہ۔''

خبر صحیح تھی۔ ٹکٹ بیٹنگ چھپے' اس عبارت کے ساتھ 'ٹکٹ آبادی درونِ شہر دہلی بشرط ادخال جرمانہ'۔ اور اس کے بعد کیا ہوا:

''ڈھنڈورا پٹوا کر ٹکٹ چھپوا کر اجرٹن صاحب بہادر بطریق ڈاک کلکتہ چلے گئے۔ دلی کے حمقا جو باہر پڑے ہوئے ہیں منہ کھول کر رہ گئے۔ اب وہ جب معاودت کریں گے تب شاید آبادی ہوگی یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے۔''

جو نئی صورت نکلی اس کا احوال بھی غالب ہی سے سنیے:

''لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کہ کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔''

اس پر جنرل برز نے لارنس کو مطلع کیا کہ ''جناب والا' میں نے حساب یہ رکھا ہے کہ دس افراد فی گلی کے حساب سے داخلہ کی اجازت دی جائے...... داخلہ کی زیادہ اجازت میں ہندوؤں کو دے رہا ہوں اس حساب سے کہ ہر گلی میں آباد ہونے والوں میں سے ایک بنیا ہو' ایک پنساری ہو' ایک حلوائی ہو...... اب تک پچاس ہزار لوگوں کی آبادی ہو چکی ہے...... ان میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔''[1]

بہر حال جنوری 1852ء میں بہت اپیلوں کے بعد آخر کے تئیں مسلمانوں کو بھی واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ مگر سخت پابندیوں کے ساتھ۔ پہلے اپنی بے گناہی ثابت کرو۔ پھر جو جرمانہ عائد کیا جائے وہ بھرو۔ تب داخلہ کا پروانہ ملے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ خانہ بربادوں نے یہ ساری ذلت و خواری سہی۔ جرمانے ادا

1۔ 'دہلی بٹیسوئن ٹو امپائرز' مصنفہ نرائنی گپتا صفحہ 23

کیے۔ لمبی لمبی ادائیگیاں کر کے داخلہ کا ٹکٹ حاصل کیا اور چلے اپنے گھروں کی طرف۔ اور پھر حیران ہوئے کہ وہ کوچہ کہاں گیا جہاں ان کا گھر تھا۔ اور وہ گلی کیا ہوئی جوان کے دم قدم سے کبھی آباد تھی۔ کتنے کوچے اس طرح مٹے تھے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ جو باقی رہ گئے تھے ان کا حال ابتر تھا۔ در و دیوار پہ گھاس اگ آئی تھی۔

اگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
میں تو جنگل میں ہوں اور گھر میں بہار آئی ہے

مگر جن گھروں کا یہ حال تھا وہ بھی غنیمت تھے۔ کم از کم اپنے در و دیوار کے ساتھ قائم و موجود تو تھے۔ بیشک در و دیوار خستہ ہو چکے ہوں۔ کتنے گھروں کا تو نام و نشان ہی مٹ چکا تھا۔ جب کوچہ ہی اپنا نام و نشان کھو بیٹھا تو اس کوچے کے گھروں کا نشان کیسے باقی رہ جاتا۔ اب اس کوچہ کے باسی پلٹ کر آئے تو حیران و پریشان تھے کہ ہمارا کوچہ کہاں گیا اور ہمارے مکان کیا ہوئے۔ زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا۔

تو واپس آنے والوں کا عجیب احوال ہوا۔ پہلے شہر سے نکل کر خوار ہوئے تھے۔ اب شہر میں واپس آ کر خوار پھرتے ہیں۔ اچھے رہے وہ غریب الوطن جو وہیں کہیں مرکھپ گئے یا کہیں آگے نکل گئے اور کہیں دیارِ غیر میں جا کر بس گئے۔ واپسی میں خواری ہی خواری تھی۔ پہلے ٹکٹ حاصل کرنے کے چکر میں خراب ہوئے۔ ٹکٹ حاصل کر کے شہر میں واپس آ گئے تو پھر دوسری طرح کی خرابی۔ چلئے گھر کا پتہ پا بھی لیا اور بے گھری بے دردی کی خواری سے نجات حاصل کر بھی لی۔ مگر اب دوسری فکریں ہیں ع

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

اور اب تو وہ سستے کا زمانہ بھی نہیں تھا جب گیہوں روپے من تھا اور گھی روپے کا چار سیر اور گڑ شکر ٹکے سیر۔ اب گیہوں روپے من سے بڑھ کر فی روپیہ تیرہ سیر ہو چکا تھا۔ گھی اب ڈیڑھ سیر فی روپیہ کے حساب سے بک رہا تھا۔ باجرہ روپے کا بارہ سیر، چنا روپے کا سولہ سیر اور ماش کی دال روپے کی آٹھ سیر۔

وہ لوگ اچھے رہے جنہوں نے اس حال میں بھی کہ سر پہ قیامت ٹوٹی ہوئی تھی عاقبت اندیشی سے کام لیا اور اپنی جمع پونجی کسی معتبر کے پاس امانت رکھی اور پھر شہر سے قدم باہر نکالا۔ اور بہر حال چند ایسی معتبر ہستیاں تو تھیں کہ اپنی ٹھیک پہ جمی بیٹھی رہیں۔ ان میں سب سے بڑھ کر حکیم محمود خاں تھے کہ دنیا ادھر سے ادھر ہو گئی وہ شریف منزل میں جمے بیٹھے رہے۔ پھر انہیں ایک سہارا بھی تو تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہی بطور خاص ان کی حویلی اور ان کے کوچے کی حفاظت پر مامور تھے۔ آس پاس والے جب گھروں سے نکلے تو انہوں نے اپنی جمع پونجی پہلے حکیم صاحب کے پاس امانت رکھی اور پھر آگے چلے۔ حکیم صاحب نے ایک

کوٹھری انہیں امانتوں کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اور کوٹھری جانے والوں کی پوٹلیوں سے منھا منھ بھر گئی۔ واپسی پر مصیبت زدوں نے پوٹلیوں کے بیچ سے اپنی اپنی پوٹلی برآمد کی اور پھر چلے اپنے گھر کی طرف۔

مگر کیا عاقبت اندیش اور کیا ناعاقبت اندیش لشٹم پشٹم سب ہی نے جینے کا سامان کر لیا۔ اور جب وہ اپنے اپنے ٹھئے پر بیٹھے اور دل و دماغ ذرا ٹھکانے پہ آئے تب انہوں نے اردگرد نظر ڈالی اور پریشان ہوئے۔ وہاں تو سارا گردوپیش ہی بدل گیا تھا۔ کتنا کچھ گم ہو گیا تھا۔ کتنے نکڑ، کتنے ٹھکانے، کتنے منظر جنہیں وہ دیکھ کر جیتے تھے اب نظر نہیں آ رہے تھے۔ سب سے بڑھ کر جامع مسجد، اس کی سیڑھیاں، اس کا چوک۔ سارا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ مسجد کے دروازے ان پر بند تھے۔ سیڑھیوں پر مسلمان نام کا پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ اور چوک جامع مسجد کہ غالب کے حساب سے وہ ان پانچ مقامات میں سے تھا جن پر شہر دلی کی ہستی منحصر چلی آتی تھی۔ اب وہ مقام ان کی زندگی سے خارج تھا۔ بس جیسے ان کی معاشرتی زندگی میں ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ جیسے ان کی عزیز ترین متاع ان سے چھین لی گئی ہے۔ پہلے وہ ایک ذہنی صدمے سے دوچار ہوئے۔ پھر اداس اور پریشان ہوئے۔ وہ جو ایک لپکا چلا آتا تھا کہ گھر سے نکلے اور چلے لپک جھپک چوک جامع مسجد کی طرف وہ اب ختم تھا۔ پھر کیا کریں، کہاں جائیں۔ جس مرکز کے گرد زندگی گھومتی تھی وہ ہی گم ہو چکا تھا۔

رفتہ رفتہ ایک تحریک پیدا ہوئی کہ اپنے قبلہ کو اغیار کے تصرف سے واپس لیا جائے۔ مسجد کی واپسی کے لیے آوازیں اٹھیں، اپیلیں ہونے لگیں۔ پہلے تو فرنگی حاکموں کے کانوں پہ جوں بھی نہیں رینگی۔ ایک کان سنا، دوسرے کان اڑا دیا۔ مگر رفتہ رفتہ پتھر دل موم ہوئے۔ مگر موم ہوتے ہوتے بھی ڈھائی تین سال لگ گئے۔ کہیں 1862ء کے اواخر میں مسجد کی حیثیت بحال ہوئی۔ سمجھئے کہ پانچ سال کے بعد مسلمانوں نے اس مسجد میں دوبارہ قدم رکھا۔ اور غالب نے خوش ہو کر میر مہدی مجروح کو بذریعہ خط اطلاع دی:

> ''جویائے حالِ دہلی والو سلام لو
>
> مسجد جامع واگذاشت ہو گئی۔ چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا مرغی کبوتر بکنے لگا۔ عشرۂ مبشرہ یعنی دس آدمی مہتمم ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی صدرالدین، تفضّل حسین خاں۔ تین یہ، سات اور''
>
> 16 دسمبر 1862ء

لیجئے پانچ سال کے وقفہ کے بعد جامع مسجد سے پھر اذان کی آواز بلند ہوئی۔ پھر وہاں نمازیوں کی

صفیں آراستہ ہوئیں۔ ادھر مسجد کی سیڑھیوں پر بھی زندگی کی ایک رو سرسرانے لگی۔ بھولے بھٹکے چند کبابی اپنی سنخس لے کر چتلی قبر کی سمت والی سیڑھیوں پر پہنچے اور کباب بنانے شروع کر دیئے۔ پھر مرغی انڈے والے آئے اور مرغی انڈا بیچنا شروع کر دیا۔ پدڑی لال بیناوالے رنگ برنگی پدڑیوں اور لالوں سے بھرے پنجرے لے کر آئے اور سیڑھیوں پر آ کر جم گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے کبوتر والے بھی آن پہنچے۔ لیجئے یہ تو ان سیڑھیوں پر پھر وہی بازار سج گیا جو سن ستاون کی قیامت سے پہلے سجا نظر آتا تھا۔ پھر وہی سیلانیوں کا ہجوم۔ پھر اسی طرح کٹورا بج رہا ہے۔ سقے میاں آب حیات پلاؤں کی صدائیں لگا رہے ہیں۔

وہی قرینہ، وہی نقشہ اگرچہ اس قدر آباد نہیں۔ ہاں ایک اور فرق تھا۔ بیچ بیچ میں کچھ کھانچے نظر آ رہے تھے۔ پچھلا سارا کاروبار پلٹ آیا۔ مگر جو قصہ خواں ان سیڑھیوں سے اٹھ کر گئے تھے وہ واپس نہیں آئے۔ اور ہاں ڈھال تلوار اور گھوڑوں کے سوداگر بھی تو یہاں ہوا کرتے تھے۔ وہ کہاں رہ گئے۔ ان میں سے کوئی نظر نہیں آ رہا۔ شہسوار اور شمشیر زن تو پسپا ہوئے ہی تھے۔ ان کے ساتھ گھوڑے اور تلوار کے سوداگر بھی پسپا ہو گئے۔ سو ہر چند کہ چوک جامع مسجد میں، مسجد کی سیڑھیوں پر زندگی کا نقشہ اسی پرانے طور پر جمتا نظر آ رہا تھا لیکن بیچ بیچ میں کھانچے بھی نظر آ رہے تھے۔ اور یہ کھانچے چغلی کھا رہے تھے کہ زندگی اب وہ نہیں ہے جو پہلے تھی۔

کچھ کردار ایسے بھی تھے کہ پہلے نہیں تھے اب نظر آ رہے تھے۔ ایک کڑیل جوان خوش شکل، خوش ادا، خوش آواز سیڑھیوں کے آس پاس فقیرانہ انداز میں بھٹکتا نظر آتا اور کس سوز بھری آواز میں کیسے لحن کے ساتھ گاتا

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

اس شخص کو گداگر کون کہے گا۔ کریدا تو پتہ چلا کہ لٹا پٹا مغل شہزادہ ہے۔ آگے لال قلعہ میں شہزادے بنے پھرتے تھے۔ اب دادا حضور کی بنائی ہوئی مسجد کی سیڑھیوں پر فقیرانہ شان سے تایا حضور کے شعر سنا کر پیسے بٹورتے ہیں اور پیٹ پالتے ہیں۔

شہزادوں کا تو یہ حال ہوا۔ اور شہزادیاں۔ غالب نے ان کا احوال یوں بیان کیا ''تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو چلتے پھرتے دیکھتے۔ صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائینچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔''
مگر اب وہ زمانہ گذر گیا تھا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ چاندسی صورتیں خلقت کی صورتوں میں رل مل

گئیں۔ اب الگ نہیں پہچانی جاتی تھیں۔ اتفاق سے پتہ چل جائے تو چل جائے۔ مالن پھول بیچتی پھر رہی ہے۔ کسی بھی گھڑی میں اس کی کوئی ادا چغلی کھاتی کہ یہ مالن نہیں ہے۔ کریدا تو پتہ چلا کہ لال قلعہ کے اجڑے ہوئے گلشن کا پھول ہے۔ آگے پھولوں میں تلتی تھی۔ اب پھول بیچ کر گزارہ کرتی ہے۔ کسی کسی گھر میں کوئی بچوں کی انا اپنے اخلاق سے سب گھر والوں کا دل موہ لیتی۔ جب کریدا جاتا تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ راز سے پردہ اٹھتا کہ اجڑی ہوئی شہزادی ہے۔ قلعہ میں تھی تو پالنے میں جھولتی تھی۔ اب مالکن کے بچوں کو پالنے میں جھلاتی ہے۔ ایک شہزادی ربیعہ بیگم نامی نے قلعہ سے نکل کر حسینی نام والے ایک باورچی کے گھر کو آباد کیا۔ ایک شہزادی فاطمہ سلطان ایک عیسائی زنانہ سکول میں معلّمہ بنی۔ یہ وہ شہزادیاں شہزادے تھے جو سرکار کی گنتی میں آ گئے۔ شروع میں گنتی میں آتے تو پھانسی پہ چڑھتے۔ اور اعلانِ معافی کے بعد گنتی میں آئے تو پنشن کے حقدار ٹھہرے۔ پنشن کتنی یہی بس پانچ روپے مہینہ۔

جن کے سر قلم ہوئے یا جلاوطن کیے گئے وہ اس خواری سے بچ گئے۔ وہ خود نہیں رہے۔ ان کے افسانے رہ گئے جنہوں نے ان کی عزت میں اور اضافہ کر دیا۔ سب سے بڑا افسانہ بہادر شاہ ظفر کی ذات تھی۔ دلی کی بیبیوں کے حساب سے وہ دلی کا سہاگ تھے۔ جب وہ رنگون سدھارے تو دلی کا سہاگ اجڑ گیا۔ تو ان بیبیوں کے حساب سے دلی اب رانڈ تھی۔ اس کا پیا پہلے رنگون سدھارا۔ پھر جلاوطنی کے عالم میں دنیا ہی سے سدھار گیا۔ غالب نے 16 دسمبر 1862ء والے خط میں میر مہدی مجروح کو جامع مسجد کے واگذاشت ہونے کی خبر فرحت اثر کے ساتھ ایک وفات حسرت ایات کی خبر بھی سنائی تھی۔

''7 نومبر 14 جمادی الاول سال حال جمعہ کے دن ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ وقید فرنگ وقید جسم سے آزاد ہوئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔''

بہادر شاہ ظفر دلی سے نکل کر دلی والوں کے دلوں میں آباد ہوئے۔ بظاہر رنگون سدھارے تھے۔ اصل میں وہ دلی ہی میں زیادہ رچ بس گئے۔ پہلے تو قلعۂ معلیٰ میں رونق افروز تھے۔ اب خلقت کے دلوں میں شاد آباد تھے۔ ان کے شعر جانے کن کن راستوں سے ہو کر دلی پہنچتے تھے اور فوراً ہی خوشبو کی مثال شہر میں پھیل جاتے تھے۔ غالب، مومن، ذوق، سب شاعر پیچھے رہ گئے۔ اب دلی والوں کے دلوں پر ظفر کی شاعری راج کرتی تھی ؎

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

کلام الملوک ملوک الکلام۔ نہیں، اب بہادر شاہ ظفر کی شاعری عوامی شاعری کی شان رکھتی تھی۔ درد بھرے دل سے نکلی۔ درد بھرے دلوں میں اتری اور اجتماعی حافظہ کا حصہ بن گئی۔

تو بہادر شاہ ظفر کی رخصتی کے بعد بس ان کی شاعری رہ گئی۔ باقی سب کچھ چلا گیا۔ نہ دربار رہا نہ درباری رہے۔ نہ اردو بیگنیاں، قلماقنیاں، ترکنیاں نہ دربان، مردھے، پیادے۔ نہ تام جھام نہ تخت رواں۔ نہ ماہی مراتب نہ روشن چوکی۔ نوبت بجنی بند۔ ہاتھی کی سواری موقوف۔ اس کے ساتھ نیگڈ میر بھی گیا، زربفت کی جھولیں بھی نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ ہاتھی گیا۔ ہاتھی کے ساتھ گھوڑا بھی گیا۔ اور کس غیرت اور وقار کے ساتھ گیا۔ ادھر بہادر شاہ ظفر رخصت ہوگئے ادھر ان کے ہاتھی نے کہ مولا بخش کہلاتا تھا کھانا پینا چھوڑ دیا۔ ہاتھی مولا بخش نے بھی اور اسپ ہمدم نے بھی۔ فیل بان نے سانڈرس صاحب کو اس واقعہ سے مطلع کیا۔ سانڈرس صاحب بنفس نفیس لڈو اور کچوریوں سے بھری ٹوکری لے کر مولا بخش کے تھان پہ پہنچے اور ٹوکری اس کے سامنے رکھ دی۔ مولا بخش نے سونڈھ میں ٹوکری کو لپیٹا اور غصے میں آ کر دور پھینک مارا۔ سانڈرس صاحب کو بھی تاؤ آ گیا۔ حکم دیا کہ ہاتھی باغی ہوگیا۔ اب یہ قلعہ میں نہیں رہے گا۔ اسے بازار میں لے جا کر نیلام کردو۔

بازار میں سب سے بڑھ کر کانے بنسی پنساری نے بولی لگائی اور ڈھائی سو روپے میں اس شاہی سواری کو خرید لیا۔ تب فیل بان نے ٹھنڈا سانس بھرا اور ہاتھی سے مخاطب ہو کر یوں بولا کہ لے بھائی مولا بخش، میری تیری تقدیر پھوٹ گئی۔ شاہی حضوری سے محروم ہوئے۔ اب ہلدی کی گرہ بیچنے والے کی جی حضوری کریں گے۔ ہاتھی یہ سن دھم سے زمین پہ گرا اور فوراً ہی جان دے دی۔

ظہیر دہلوی کا کہنا ہے کہ اسی دن اسپ ہمدم کا بھی خاتمہ بخیر ہوا۔

مولا بخش اور اسپ ہمدم کی موت گویا ایک اعلان تھی کہ ہاتھیوں گھوڑوں کا زمانہ تمام ہوا۔ ان کے سوار کتنے رخصت ہو چکے تھے۔ جو رہ گئے تھے ان کا ان سواریوں سے جیسے جی بھر گیا ہو۔ حکیم محمود خاں آ گے

کس آن بان کے ساتھ گھوڑے پہ سوار ہو کر شریف منزل سے نکلتے تھے۔ اب وہ فٹن میں سوار نظر آتے تھے۔ فٹن 1857ء سے پہلے بس ایک مفتی صدر الدین کی مشہور تھی۔ اب یہ سواری کچھ زیادہ نظر آنے لگی تھی۔ رہ گئی ہاتھی کی سواری تو کتنی حویلیوں کے اونچے در یعنی ان حویلیوں کے جو ڈھینے سے بچ گئی تھیں بتا رہے تھے کہ یہ در ہاتھیوں کے حساب سے تعمیر کیے گئے تھے۔ مگر اب یہ در اجاڑ کھڑے تھے۔ ہاتھی وہاں نظر نہیں آتے تھے۔

ویسے ان حویلیوں کا بھی اب چل چلاؤ تھا۔ حویلیوں والوں میں اب اتنی مقدرت کہاں رہ گئی تھی کہ حویلیوں میں رہیں، کتنوں نے اپنی حویلیاں بیچ ڈالی تھیں۔ کتنے بیچنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

زمانہ بدلا شہر بدلا

1867ء شروع ہو رہا تھا۔ ابھی رات کا ڈیرا تھا۔ دلی کی فضا میں ایک نیا شور سنائی دیا۔ ایک ریل گاڑی اپنے کالے انجن سے دھواں اگلتی، چھک چھک کرتی، سیٹی بجاتی اس عمارت میں داخل ہوئی جو خاص اس گاڑی کی خاطر تعمیر کی گئی تھی۔ ریل گاڑی دلی میں آن پہنچی تھی۔ اس کی سیٹی کی آواز سمجھو کہ دلی کے لیے نئے زمانے کی نوید تھی۔ بس پھر اس اجڑے دیار کے شب و روز بدلتے ہی چلے گئے اور فضا نئے شور سے معمور ہوتی چلی گئی۔ اب تک تو کسی سواری کے دلی میں آنے جانے کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ ان کی رفتار بھی واجبی واجبی ہوتی تھی۔ مگر یہ نئی سواری کہ کل سے چلتی تھی طوفانی رفتار سے دوڑتی کہ زمین تھرا جاتی اور میلوں دور سے اپنی آمد کا اعلان کرتی شور مچاتی پہیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ سٹیشن پر آ کر رکتی۔ بہادر شاہ ظفر کے سامنے جب ریل گاڑی کا منصوبہ رکھا گیا تھا تو وہ بجا طور پر پریشان ہوئے تھے کہ اس سے شہر کے سکون میں بہت خلل پڑے گا اور انہوں نے ہدایت کی تھی کہ سٹیشن شہر سے دور بنایا جائے۔ مگر اب تو یہ منصوبہ ان کے جانے کے بعد پروان چڑھا تھا۔ منصوبہ سازوں نے بلا روک ٹوک چاندنی چوک کے پچھواڑے سٹیشن بنایا۔

لیجیے اجڑی بچڑی دلی کے دلدر دور ہونے کا وقت آن پہنچا۔ ریل گاڑی کی آمد سے تو اس پر خوش حالی کے دروازے کھل گئے۔ شہر کی تجارت کو پر لگ گئے۔ سو طرح کا مال یہاں سے باہر جا رہا ہے، باہر سے یہاں آ رہا ہے۔ تاجروں کے پوبارے ہو گئے۔ ساہوکاروں کی دولت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ ان میں زیادہ تر ہندو تھے یا جینی۔ اکا دکا مسلمان۔ سب سے بڑھ کر لالہ چھنامل تھے کہ اب وہ دلی کی سب سے زیادہ دولت مند آسامی تھے۔ چلو اس سے ان خستہ حال مسلمان شرفا کا بھی کچھ بھلا ہو گیا جو اپنی حویلیاں بیچنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ نواب مظفر خاں کی حویلی پنڈت جوالا ناتھ نے خرید لی۔ حامد علی خاں کی حویلی ہردھیان

سنگھ نے اور شاہ عالم ثانی کے بیٹوں پوتوں کی حویلی کو بشمبر ناتھ نے خریدا۔ اس طرح کتنے شرفا نے اپنی حویلیوں کو اونے پونے بیچا اور کسی دور کی گلی میں چھوٹا موٹا مکان لے کر رہنے لگے۔ پھر کسی نے پرچون کی دکان کھول لی۔ کوئی کرخندار بن گیا۔ کسی نے معلّمی کا پیشہ اپنا لیا۔ ایک نواب گھرانے کا احوال نرائنی گپتا نے یوں بیان کیا ہے کہ اس گھرانے کے دو افراد 1858ء میں بیچ چاندنی چوک میں پھانسی پہ چڑھے تھے۔ پسماندگان لپ چھپ کر اپنی حویلی سے نکلے اور گمنام بن کر گلی رودگراں میں جہاں نچلے طبقہ کے لوگ رہتے تھے جا بسے۔ 1860ء کے برسوں میں اس گھر کا ایک لڑکا کسی موچی کی دکان پر بیٹھ کر موچی کا کام سیکھنے لگا۔ دوسرا کرخندار بن گیا۔ تیسرے نے تارکشی کا کام شروع کر دیا۔ جو دو چھوٹے تھے انہوں نے سکول میں پڑھ لکھ کر کوئی سند لے لی۔ ایک میونسپلٹی میں محرر بن گیا۔ دوسرے کو اکاؤنٹینٹ کی ملازمت مل گئی۔

ایک طرف یہ نقشہ تھا۔ دوسری طرف اسی شہر میں نقشہ الٹ تھا کہ تجارت زوروں پر تھی۔ بیوپاری دولت میں کھیل رہے تھے۔ بیوپار اور کاروبار کے طفیل قریب و دور سے تجارت پیشہ، مزدور، کاریگر غرض ہر طرح کی مخلوق یہاں پہنچ رہی تھی۔ دلی جو سن ستاون اٹھاون میں خالی ہو گئی تھی اب بھری بھری نظر آ رہی تھی۔ 1847ء میں دلی کی آبادی ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ 1857ء تک اس میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہو گا۔ مگر جب 1857ء کی قیامت گذری تو اس کی آبادی ایک لاکھ پینتیس ہزار رہ گئی۔ مگر 1867ء کے بعد آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ 1875ء کے آتے آتے پھر یہ آبادی ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے لگ بھگ ہو گئی۔

کاروبار کا مرکز ہر پھر کر پھر چاندنی چوک ہی ٹھہرا۔ سو آبادی کا دباؤ بھی اسی نواح میں زیادہ تھا۔ ہندو اور جینی تاجروں کی ریل پیل تھی۔ اصل میں تو خود شاہجہاں نے شہر آباد کرتے وقت کتنے ہندو اور جینی تاجروں کو قطعات عطا کیے تھے۔ اب جب زمانہ بدلنے کے ساتھ ان کے کاروبار نے نئی رونق پائی تو انہوں نے لٹے پٹے مسلمان رئیسوں اور نوابوں سے ان کی حویلیاں خرید خرید کر یہاں اپنی جائیدادوں میں مزید اضافہ کر لیا۔

جب اس نواح میں آبادی اس طرح بڑھی اور کاروبار نے نئے سرے سے رونق پکڑی تو اور قسم کی سرگرمیاں بھی یہاں شروع ہو گئیں۔ سوشل سرگرمیاں، تہذیبی سرگرمیاں، سب سے بڑھ کر مذہبی سرگرمیاں۔ صاف صاف لفظوں میں یوں سمجھئے کہ تجارتی کاروبار کے ساتھ ساتھ مذہبی تبلیغ کا کاروبار بھی شروع ہو گیا۔ یہ کاروبار بھی تجارت کے اس مرکز میں خوب پھلا پھولا۔ شاید اس کا آغاز عیسائی تبلیغ کے کاروبار سے شروع ہوا۔ یہاں اب ایک زبردست قسم کا گرجا گھر بھی تعمیر ہو گیا تھا۔ 1865ء میں کلکتہ کے لاٹ پادری صاحب

یہاں تشریف لائے اور سن ستاون کے معرکہ میں جو عیسائی مارے گئے تھے ان کی یادگار کے طور پر ایک گرجا گھر کا سنگ بنیاد رکھا۔ نام اس کا سینٹ سٹیفن چرچ قرار پایا۔ 67ء کے آتے آتے وہ بن کر کھڑا ہو گیا اور فوراً ہی عیسائی تبلیغ کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ چند برس گذرے تھے کہ جینیوں نے بھی یہیں کہیں اپنا ایک شاندار مندر کھڑا کر لیا۔ سکھوں کا مشہور گوردوارہ یہاں پہلے سے موجود تھا۔ جلد ہی آریہ سماجی بھی اپنی تبلیغی عزائم کے ساتھ یہاں آن پہنچے۔ مسلمان کہاں پیچھے رہنے والے تھے۔ ان کا مرکز تو بہت پہلے سے یہاں موجود تھا۔ یہ مرکز تھا مسجد فتحپوری۔ اگر ابھی تک وہ تھوڑے چپ تھے تو اس وجہ سے کہ یہ مسجد لالہ چھنامل کے تصرف میں تھی۔ لالہ نے 1860ء میں انتالیس ہزار چھ سو پچاس روپے میں خریدی تھی۔ مگر اب اس کے واگذاشت ہونے کی خبریں تھیں۔ اسے واگذاشت ہو جانے دو، پھر دیکھو کہ یہاں سے تبلیغ اس زور شور سے شروع ہو گی کہ جامع مسجد بہت پیچھے رہ جائے گی۔ اور اس مسجد کے واگذاشت ہونے کا وقت آن پہنچا تھا۔ لارڈ لٹن بس دربار کے انتظار میں تھے جو جلد منعقد ہونے والا تھا۔

1857ء کے بعد فرنگی حاکموں نے اس شہر کو فتح کرنے کے بعد فراموش کر دیا تھا۔ ان کا صدر مقام کلکتہ تھا۔ مگر کلکتہ میں بند ہو کر ساحل سے لگے وہ کب تک بیٹھے رہتے۔ ہندوستان کے بیچ دلی میں وہ اپنے جھنڈے گاڑ چکے تھے۔ اب رفتہ رفتہ انہیں خیال آیا کہ کلکتہ سے نکلو اور دلی کو اپنا گڑھ بناؤ۔ تو اب انہوں نے نئے سرے سے اس شہر پر توجہ دینی شروع کر دی۔ اس کا آغاز قیصری دربار سے ہوا۔

ملکہ وکٹوریہ ابھی تک خالی ملکہ معظمہ چلی آتی تھیں۔ لیکن اب تو ہندوستان کا وسیع و عریض ملک بھی ان کی سلطنت میں شامل ہو چکا تھا۔ اب ملکہ سے بڑھ کر کوئی لقب ہونا چاہیے۔ سوچ بچار کے بعد ایک لقب نے شرف قبولیت حاصل کیا۔ یہ لقب تھا قیصر ہند۔ طے ہوا کہ یکم جنوری 1877ء کو دلی میں ایک شاندار دربار سجایا جائے۔ وہاں اس خطاب کا اعلان کیا جائے۔

لیجیے دلی میں اب قیصری دربار کی دھوم دھام ہے۔ اس شہر نے اب سے پہلے مغل درباروں کی شان و شوکت دیکھی تھی۔ مغل گئے۔ فرنگی آئے۔ سو اب دربارِ فرنگ کی شان و شوکت دیکھئے۔ ہندوستان بھر کے راجہ مہاراجہ روسا، نوابین جمع تھے۔ راجگان ہاتھیوں پر بیٹھ کر آئے۔ ہاتھی قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ اور کیا شان والے ہاتھی تھے۔ ہودے کیا تھے سونے چاندی کے تخت تھے۔ لارڈ لٹن وائسرائے تھے۔ کمپنی کا زمانہ تو سن ستاون کے ساتھ لد گیا۔ اب ملکہ کا زمانہ تھا۔ لارڈ لٹن ملکہ معظمہ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ملکۂ معظمہ جو اب قیصر ہند بننے والی تھیں۔ فرمانِ قیصری پڑھ کر سنایا گیا۔

''مابدولت وکٹوریہ، بفضل خدا سلطنت متحدہ کی ملکہ اور قیصر ہند اپنے نائب السلطنت کی معرفت اپنے سب سرداروں، اہل قلم، اہل سیف، روسا، امرا اور رعایا کو جو دہلی میں اس وقت مجتمع ہیں اپنی شاہی اور قیصری دعا دیتی ہیں اور اپنی توجہ دلی اور شفقتِ شاہانہ سے ہند کی رعایا کو مطمئن فرماتی ہیں۔''

حاضرین سروقد کھڑے ہوئے۔ تالیاں بجائیں۔ مبارکبادیاں دیں۔ مہاراجہ سندھیا نے کھڑے ہوکر سب راجاؤں نوابوں رئیسوں کی طرف سے مبارکباد دی ''شہنشاہِ بادشاہاں، والیانِ ہند آپ کو مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ آپ کی بادشاہت اور طاقت ہمیشہ کے لیے برقرار رہے۔''

تو قیصری دربار ہوگیا۔ اس خوشی میں مسجد فتحپوری واگذاشت ہوگئی۔ مسلمان خوش ہوگئے۔ نہیں، خوش کہاں ہوئے۔ ستم ظریفوں نے ایک چیز دی، دوسری چیز چھین لی۔ اسی موقع پر دلی کالج کے بند ہونے کا بھی اعلان ہوا۔ کہا گیا کہ دلی کالج کی کلاسیں لاہور کے کالج میں ضم کردی گئی ہیں۔ جسے پڑھنا ہو وہاں جاکر داخلہ لے۔ دلی کالج نے کیسا کیسا بھلے مانس پیدا کیا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد۔ مگر فرنگی سرکار کے دماغ میں جانے کیا سمائی کہ تعلیم کے اس باب کو بند کردیا۔

اور لیجیے مسجد فتحپوری سے خدا خدا کرکے اذان کی آواز سنائی دی۔ نمازی آنے لگے۔ صفیں بندھنے لگیں۔ رکوع و سجود ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ تبلیغی سرگرمی بھی شروع ہوگئی۔ جامع مسجد تو سرکاری اثر میں تھی۔ انتظامی کمیٹی اسی کی طرف سے قائم تھی۔ اور پھر اس مسجد کی اپنی روایات بھی ایسی تھیں جو اعتدال کی راہ سے اسے ہٹنے نہیں دیتی تھیں۔ مگر مسجد فتحپوری کا مزاج مختلف تھا۔ یہاں حنفیوں سے بڑھ کر اہل حدیث کا زور تھا۔ پنجابی سوداگران کا اثر ورسوخ تھا۔ تو اس مسجد میں رکوع و سجود پر قناعت نہیں کی گئی تھی۔ مناظرہ بازی کا شوق بھی فزوں تھا۔

لارڈ کرزن نے ایک اور گل کھلایا۔ لفٹنٹ گورنر سر چارلس ریواز رفتہ رفتہ اس پر آمادہ ہوگئے کہ جامع مسجد کے انتظام میں حکومت دخل نہ دے۔ مسلمان خود ہی انتظامی کمیٹی تشکیل دے لیں۔ لارڈ کرزن اڑ گئے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ جامع مسجد قومی یادگار ہے۔ حکومت اس کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کو کیسے فراموش کرسکتی ہے۔ ساتھ ہی موصوف نے یہ شوشہ چھوڑا کہ اب جو یورپین مسجد کو دیکھنے جائیں گے وہ بیشک مسلمانوں کے جذبات کے احترام میں کفش پوش پہن کر مسجد کے اندر قدم رکھیں۔ مگر اس طرح کی پابندی ان پر عائد نہیں کی جاسکتی مسلمانوں نے اس کا برا مانا۔ اور اس سوال نے کہ کیا مسجد میں جوتے پہن کر داخل

ہو جا سکتا ہے؟ ایک تنازعہ کی شکل اختیار کر لی۔ اور ایک وقت ایسا آیا کہ مسجد میں داخل ہونے والے کچھ فرنگی سپاہیوں پر اینٹیں پھینکی گئیں۔

تو کیا دلی کے مسلمانوں میں اب اتنی جرأت پیدا ہو گئی تھی کہ فرنگیوں کے خلاف اس طرح کا مظاہرہ کریں۔ ہاں۔ سن ستاون کی قیامت کے بعد کتنے سالوں تک وہ سہمے سہمے رہے۔ مگر زمانہ بدلتا چلا جا رہا تھا۔ اور سن ستاون کے اثرات زائل ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس کا اثر اس طرح بھی تو ظاہر ہونا تھا کہ مسلمانوں پر جو فرنگی کا خوف مسلط ہو گیا تھا وہ رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا گیا۔ اس کا اظہار اس طرح بھی ہوا کہ جامع مسجد اور مسجد فتحپوری کی جو انتظامی کمیٹیاں حکومت کی طرف سے قائم تھیں ان کے اراکین پر سخت اور درشت تنقید ہونے لگی۔ مرزا حیرت دہلوی ایک بلا تھے۔ انہوں نے الزام تراشیاں شروع کر دیں۔ پنجابی سوداگران ان کی پشت پر تھے۔ انہوں نے ان ممبران کے خلاف الزامات کا ایک طومار کھڑا کر دیا۔

صرف مسجدوں کے مسئلہ پر موقوف نہیں تھا۔ اب ہر معاملہ میں مسلمان اپنی آواز اٹھاتے نظر آتے تھے۔ پہلے تو کسی بھی معاملہ میں ان غریبوں کی آواز ہی سنائی نہیں دیتی تھی۔ مگر قیصری دربار کے بعد سے تو لگتا تھا کہ انہیں بھی زبان مل گئی ہے۔ جب اردو ہندی کا قضیہ شروع ہوا تو انہوں نے اچھی خاصی بیان بازی شروع کر دی۔ 1884ء میں دلی والوں کی طرف سے اردو کی حمایت میں تابڑ توڑ تین بیان جاری ہوئے۔ ایک بیان پر زیادہ دستخط ہندوؤں کے تھے۔ دوسرے بیان پر مسلمانوں کے زیادہ دستخط نظر آئے۔ تیسرے بیان پر دس ہزار دستخط تھے جن میں دلی سے باہر والے بھی شامل تھے۔

مقامی اخباروں نے بھی تقریباً سب ہی نے بڑھ چڑھ کر ہندی کے مقابلہ میں اردو کی حمایت کی۔ ساٹھ کی دہائی میں دلی سے بارہ اخبار نکل رہے تھے۔ ان اخباروں کے مالک سب کے سب سرکار انگلیشیہ کے وفادار تھے اور افسران سے ربط وضبط رکھتے تھے۔ اسّی کی دہائی میں اس تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ اور اب یہ اخبار ایسے لوگ نکال رہے تھے جو سرکار پر اچھی خاصی تنقید کرتے تھے۔

چوک جامع مسجد میں بھی اب رونق بہت ہو گئی تھی۔ ستاون کی رستاخیز نے تباہ تو اشراف کو کیا تھا۔ کرخنداروں کا کیا بگڑنا تھا۔ اور دلی کے دستکاروں کے بارے میں تو یہ مثل مشہور چلی آتی تھی کہ ان کی دس انگلیاں دس چراغ۔ کیا کیا دستکاری ان کی انگلیوں میں آ کر کیا سے کیا بن گئی۔ اور تارکشی، سلمہ ستارے کے کام جیسی دستکاریوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اس ہنر کی باریکیاں تو ان پر ختم تھیں۔ مردوں سے بڑھ کر عورتیں اس ہنر میں طاق تھیں۔ اور اب تو کتنی لٹی پٹی شہزادیاں بھی اس میدان میں اپنا ہنر دکھا رہی تھیں۔ تو ان

کاریگروں، دستکاروں، کرخنداروں کا معاملہ تو یہ تھا کہ دن بھر کام کیا۔ شام کو نہائے دھوئے، بال بنائے، کان میں عطر کی پھریری رکھی، گلے میں بیلے موتیا کا گجرا ڈالا اور چلے چوک کی طرف۔ سیڑھیوں پر پورا بازار سجا ہوا۔ چٹوروں کے لیے دہی بڑے، چاٹ بارہ مسالے والی، حلیم، کھیر، فیرنی۔ پرندوں کے شوقینوں کے لیے لال پدڑی طوطا مینا کبوتر۔ اور اب تو اِکا دُکا خستہ حال مغل بچہ بھی یہ کاروبار کرتا نظر آتا تھا۔

وقت بھی کتنی تیزی سے گذرتا ہے۔ کہاں یہ حال تھا کہ وہ گذرنے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ خانہ بربادوں کے لیے تو جیسے وہ رک کر کھڑا ہو گیا ہو۔ سن ستاون کی صورت حال میں ایسے پھنسے تھے کہ نکل ہی نہیں پا رہے تھے۔ اور اب یہ لگ رہا تھا کہ سن ستاون تو بہت پیچھے رہ گیا۔ ارے اب تو صدی کا آخیر آن لگا تھا۔ انیسویں صدی ختم ہو رہی تھی۔ اس صدی نے بھی کیا کیا گل کھلائے۔ انگریزوں کے قدم صدی کے آغاز میں آئے تھے۔ اور ان کے سبز قدم ایسے آئے کہ دلی ہی اجڑ گئی۔ وہ دلی جو جہان آباد سے عبارت تھی اور اپنی جگہ ایک تہذیب تھی۔ جنرل لیک نے 14 ستمبر 1803ء کے دن دلی فتح کی تھی۔ اور کیسی نامبارک گھڑی میں اس نے لال قلعہ میں قدم رکھا تھا کہ دیکھتے دیکھتے اونٹ خیمے کے اندر تھا اور عرب خیمے سے باہر۔ چون پچپن برس کے اندر اندر مغلیہ سلطنت کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔ مغل بادشاہ نے لال قلعہ کو سلام کیا اور نکل گیا۔ لال قلعہ ہی سے نہیں، دلی سے، ہندوستان سے۔ بادشاہ گیا۔ اور ملکہ معظمہ کا راج آ گیا۔ اور اسی کے ساتھ ملکہ معظمہ کے تاج میں ایک سرخاب کا پر لگ گیا۔ آگے وہ ملکہ برطانیہ تھیں۔ اب قیصر ہند بھی بن گئیں۔ یہ سارا انقلاب انیسویں صدی میں آیا۔ اور اب انیسویں صدی ختم ہو رہی تھی۔ مگر انیسویں صدی نے عجب انداز سے کوچ کیا کہ ساتھ میں ملکہ برطانیہ قیصر ہند کو بھی لے گیا۔ ادھر انیسویں صدی ختم ہوئی اور ادھر اس کے ٹھیک بیس دن بعد یعنی 21 جنوری 1901ء کو ملکہ وکٹوریہ دنیا سے سدھار گئیں۔

یادش بخیر دہلی کالج

1867ء کے طلوع کے ساتھ دلی والوں نے ریل گاڑی کی سیٹی کی آواز سنی اور جانا کہ زمانہ بدل گیا۔ مگر دلی کی تاریخ میں اس سے بھی زیادہ بڑا واقعہ اب سے بیالیس برس پہلے 1825ء میں گذرا تھا جب دہلی کالج قائم ہوا تھا۔ بس اسی کے ساتھ اس مٹی میں نئے زمانے کا بیج پڑ گیا تھا۔ اسی کالج کا ظہورہ تھا کہ جو زبان کل تک بس شاعری کی زبان تھی اب جدید سائنس سے مکالمہ کرتی نظر آ رہی تھی۔ مدرسہ غازی الدین جو 1792ء میں قائم ہوا تھا۔ اب پس منظر میں چلا گیا۔ سمجھو کہ مٹ گیا۔ اب اس مدرسہ کی عمارت میں انگریزی کا بول بالا تھا اور مغرب سے آئے ہوئے نئے علوم پڑھائے جا رہے تھے۔ بنگالی تو اس تعلیم سے پہلے ہی مانوس ہو چکے تھے۔ آغاز تو اس تعلیم کا وہیں سے ہوا تھا۔ اور راجہ رام موہن رائے نے اس کے حق میں زبردست تحریک چلائی تھی۔ مگر دلی والوں کے لیے یہ نیا واقعہ تھا اور نا قابل قبول۔ کرسٹانوں کی زبان اور ان کے آوردہ علوم کی تعلیم پر دلی کے شرفا بہت متوحش ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے والد ماجد نے بیٹے کی سخت سرزنش کی اور کہا کہ میرے بیٹے انگریزی پڑھنے سے مرجانا بہتر ہے۔ مگر بیٹے نے باپ کی ایک نہیں سنی۔ دلی کے کتنے بیٹے باپوں سے باغی ہوئے اور دہلی کالج میں جا کر نئے سبق نئی زبان پڑھنے لگے۔

باغیوں کی پہلی کھیپ پر ذرا نظر ڈالیے۔ سید احمد خاں تو خیر اس کالج میں نہیں پڑھے تھے۔ مگر دوسروں پر نظر ڈالیے۔ محمد حسین آزاد، نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، مولوی ضیاء الدین، ماسٹر رام چندر، پیارے لال آشوب، ماسٹر نند کشور۔ ان باغیوں نے اس کالج سے نکل کر جو گل کھلائے اس سے مسلمانوں کے روایتی معاشرے میں ایک قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کچھ بزرگ بھی اس تعلیم کے گرویدہ ہو گئے۔ وہ اس کالج میں جا کر استاد بن گئے۔ ایسے بزرگ جن کے علم و فضل کا دلی میں لوہا مانا جاتا تھا جیسے مفتی صدر الدین آزرده،

مولوی امام بخش صہبائی، مملوک العلی نانوتوی۔

اس کالج کے کچھ امتیازی اوصاف تھے جن کے سبب یہ درسگاہ ایک ذہنی انقلاب کی نقیب بن گئی۔ مولوی عبدالحق کے حساب سے یہ اوصاف تین تھے۔ اول یہ کہ ''یہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مشرق ومغرب کا سنگم ہوا اور ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم وادب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔ اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے، معلومات میں اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں بڑا کام دیا ہے۔ اور نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کر دی جس میں سے ایسے پختہ کار، روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ہماری زبان اور سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔''

دوسرا امتیاز اس درسگاہ کا یہ تھا کہ یہاں ذریعۂ تعلیم اردو تھی۔ تمام مغربی علوم اردو ہی میں پڑھائے جاتے تھے۔

تیسرا امتیاز یہ تھا کہ اس سے وابستہ ایک ورنیکولر ٹرانس لیشن سوسائٹی یا مجلس ترجمہ تھی۔ اس مجلس کے زیر اہتمام جو ترجمے اور تالیف کے کام ہوئے ان کی تعداد سوا سو کے لگ بھگ ہے۔ ترجمہ کرنے والے اس کالج کے استاد تھے یا ان کے شاگرد۔ یہ ترجمے اور تالیفات ''تاریخ، جغرافیہ، اصول قانون، ریاضیات اور اس کی مختلف شاخوں کیمسٹری، میکانیات، فلسفہ، طب، جراحی، نباتیات، معنویات، معاشیات وغیرہ علوم وفنون نیز ادبیات پر مشتمل ہیں۔''

دلی کے آثارِ قدیمہ پر تحقیق کے لیے جو مجلس قائم ہوئی اسے بھی اسی کالج کا فیض جانئے۔ اس کا نام تھا ارکیولوجیکل سوسائٹی۔ اس کے اراکین میں کچھ انگریز افسر تھے۔ باقی زیادہ دہلی کالج کے فرزند تھے۔ سرسید احمد خاں، مولوی ضیاء الدین، ماسٹر رام چندر۔ ان میں سب سے زیادہ متحرک سرسید احمد خاں تھے جنہوں نے بہت تحقیق و تفتیش کے بعد ایک رپورٹ تیار کی اور مجلس کے سامنے پیش کی۔ بعد میں اس رپورٹ سے گذر کر انہوں نے پوری ایک کتاب 'آثار الصنادید' کے نام سے لکھ ڈالی جسے دلی کے آثار قدیمہ پر ایک مستند تحقیقی کام کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ گارسیں دتاسی نے اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کر ڈالا۔

اسی دوران میں ایک واقعہ اور ہوا۔ پتھر کی چھپائی کے فن نے نمود کی اور لتھوگرافی پریس قائم ہو گیا۔ ایک پریس، دوسرا پریس، تیسرا پریس۔ چھاپے خانے قائم ہوئے۔ کتابیں چھپنے لگیں۔ اخبار نکلنے لگے۔ مولوی محمد باقر دہلی کالج میں پڑھے تھے اور پھر دہلی کالج میں فارسی کے استاد بھی رہے۔ انہوں نے دہلی اردو اخبار نکالا۔ یہ شمالی ہند میں پہلا اردو اخبار تھا۔ 1837ء میں وہ 'اخبار دہلی' کے نام سے نکلا تھا۔

1840ء میں اس کا نام 'دہلی اردو اخبار' ہوگیا۔ جنگ آزادی کے ہنگام اس کا نام 'اخبار الظفر' ہوگیا۔ اس کے بعد نہ ایڈیٹر رہا نہ اخبار کہ مولوی محمد باقر کو انگریزوں نے پھانسی دے دی۔ ان کے بیٹے محمد حسین آزاد شہر سے نکل گئے۔

اسی کے آس پاس کے زمانے میں سرسید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے 'سید الاخبار' کے نام سے ایک اخبار نکالا۔

ماسٹر رام چندر نے دہلی کالج میں بیٹھ کر 1846ء میں 'فوائد الناظرین' کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ 1847ء میں 'محبِّ ہند' جاری کیا۔ خود دہلی کالج نے 'قران السعدین' کے نام سے ایک علمی جریدہ نکال رکھا تھا جس کے مدیر کالج کے پرنسپل ڈاکٹر الائس اشپرنگر تھے۔ اشپرنگر صاحب جرمن تھے۔ ایک دوسرے استاد تھے بترو صاحب۔ یہ فرانسیسی تھے۔ الائس اشپرنگر صاحب تو تین ساڑھے تین سال گذار کر رخصت ہوگئے۔ پھر ٹیلر صاحب نے کالج کی پرنسپلی سنبھالی۔

نئی تعلیم سے دلی میں ایسی فضا پیدا ہوگئی تھی کہ سی ایف اینڈریوز نے اسے نشاۃ الثانیہ سے تعبیر کیا۔ مگر اچانک 1857ء کی قیامت آن ٹوٹی۔ ٹیلر اور کالج کے دوسرے یورپین استاد اور منتظمین اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کالج بند ہوگیا۔

پھر کہیں 1864ء میں جا کر یہ کالج دوبارہ کھلا۔ مگر اب زمانہ اور تھا۔ کالج کی لائبریری تباہ و برباد ہوچکی تھی۔ غازی الدین مدرسہ کی عمارت پر پولیس نے قبضہ کر رکھا تھا۔ کالج نے اب گلی قاسم جان کے ایک مکان میں ٹھکانا بنایا۔ ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ علمی کتابوں کے جس زور شور سے یہاں اردو میں ترجمے ہورہے تھے وہ زور شور اس زمانے کے ساتھ چلا گیا۔ ترجموں کا بازار ٹھنڈا تھا۔ اب تو اردو ہی پس منظر میں چلی گئی تھی۔ زور اب انگریزی پر تھا۔

اس سب کے باوجود کالج چل پڑا تھا۔ طلبا جوق در جوق آنے لگے تھے۔ لیکن ایک انگریز ماہر تعلیم نے بیٹھے بٹھائے اس کالج سے بیر باندھ لیا۔ یا شاید یوں تھا کہ دلی والوں کو جہاں اور سزائیں دی گئیں وہاں تعلیمی سطح پر بھی ایک سزا دینی مقصود تھی۔ یہ ماہر تعلیم ڈاکٹر لائٹنر تھا جو ہاتھ دھو کے کالج کے پیچھے پڑ گیا۔ جب پنجاب یونیورسٹی کے تحت لاہور میں ایک اسی نوعیت کا کالج کھلا تو لائٹنر نے تجویز پیش کی کہ دو دو کالجوں پر کیوں پیسہ خرچ کیا جائے۔ کیوں نہ دہلی کالج کو لاہور کے کالج میں ضم کر دیا جائے۔ مگر دہلی میں اس تجویز کے خلاف سخت ردعمل ہوا۔ اس لیے اس تجویز کو بہت جلدی رد کر دیا گیا۔ لفٹنٹ گورنر میکلوڈ نے دہلی سوسائٹی

کو اطمینان دلایا کہ اس کالج کی حیثیت برقرار رہے گی۔

مگر لائٹنر ہار ماننے والا کب تھا۔ 1874ء میں اس نے پھر اپنی تجویز پر اصرار کیا۔ اب لفٹنٹ گورنر ایجرٹن تھا۔ اس نے بھی اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ادھر دہلی کالج روز بروز ترقی کر رہا تھا۔ نتائج بھی اچھے آ رہے تھے۔ مگر لائٹنر کو جیسے اس کالج سے للّہی ہو گئی ہو۔ اس نے اب دلی کے ایک فرزند حامد علی خاں سے مل کر ایک سازش کی۔ نرائنی گپتا کی تحقیق کے مطابق حامد علی خاں نے لائٹنر کی شہ پر یہ شوشہ چھوڑا کہ اعتماد الدولہ فنڈ جس سے دہلی کالج کو امداد ملتی تھی صرف شیعہ طلبا کے لیے قائم ہوا تھا۔ دہلی کالج کو یہاں سے کس خوشی میں امداد ملتی ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ یہ فنڈ پنجاب یونیورسٹی کی نگرانی میں دے دیا جائے اور صرف شیعہ طلبا کو اس فنڈ سے وظائف دیے جائیں۔ اور لائٹنر صاحب نے ٹکڑا لگایا کہ دہلی کالج کو چلانے کے لیے اب فنڈ کہاں سے آئیں گے۔ بہتر ہے کہ اسے لاہور کالج میں ضم کر دیا جائے۔

آخر لائٹنر کی سازش کامیاب ہوئی۔ فروری 1877ء میں دہلی دربار کے موقع پر لفٹنٹ گورنر صاحب نے اعلان کر دیا کہ دہلی کالج کو لاہور کالج میں ضم کر دیا جائے گا۔ لیجیے دہلی کالج بند ہو گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

اور لیجیے ادھر دہلی کالج بند ہوا ادھر علی گڑھ میں دہلی کے ایک فرزند نے ایک نئی درسگاہ کا ڈول ڈالا۔ مسلم اینگلو اورینٹل کالج کھل گیا۔ آگے چل کر کیا دلی کیا لاہور سارے مسلمانوں کی تعلیمی تقدیر اسی درسگاہ سے وابستہ ہو گئی۔

نیا راج نئی راجدھانی

نئی صدی نیا بادشاہ۔ انیسویں صدی ملکہ وکٹوریہ کے نام لکھی گئی تھی۔ وہ صدی گئی تو ملکہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اب بیسویں صدی شروع ہے۔ ملکہ کا زمانہ گیا۔ بادشاہ کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اب ایڈورڈ ہفتم انگلستان کے بادشاہ ہیں۔ اور ساتھ میں قیصر ہند بھی۔ انگلستان میں تاجپوشی کی رسم ہو چکی۔ اب یہ رسم ہندوستان میں ادا کی جائے گی۔ ڈونڈی پٹ گئی کہ 1903ء کے آغاز کے ساتھ دلی میں دربار سجے گا اور تاجپوشی کی رسم ادا ہوگی۔ بادشاہ سلامت خود نہیں آئیں گے۔ ان کے وائسرائے لارڈ کرزن یہ دربار سجائیں گے۔ بادشاہ سلامت کے برادر عزیز ڈیوک آف کناٹ ڈچز آف کناٹ کی ہمراہی میں یہاں پہنچیں گے۔ اور دربار کو عزت بخشیں گے۔

تو ایک فرنگی دربار انیسویں صدی میں آراستہ ہوا تھا۔ دوسرا دربار بیسویں صدی کے تیسرے برس کے آغاز کے ساتھ آراستہ ہوا۔ وہ قیصری دربار کہلایا تھا۔ اس دربار نے کرزن دربار کے نام سے شہرت حاصل کی۔ کرزن صاحب اپنی لیڈی کے ہمراہ ہاتھی پہ سوار ہو کے دربار پہنچے۔ راہ میں روسا و امرا ہاتھیوں پر سوار استقبال کے لیے صف بصف کھڑے تھے۔ جس راہ سے گذرتے ہاتھی سونڈ اٹھا کر انہیں سلامی دیتے۔ عجب نظارہ تھا۔ جدھر دیکھو ہاتھی ہی ہاتھی۔ مغل دربار کے اجڑنے کے ساتھ ہاتھی بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ جیسے مولا بخش ہاتھی کی موت کے ساتھ ہاتھیوں کا زمانہ ختم ہو گیا ہو۔ مگر کرزن دربار کے طفیل ایک مرتبہ پھر ہاتھیوں نے زور باندھا۔ بلکہ دلی میں تو آگے چل کر یہ دربار ہاتھیوں کے دربار کے نام سے مشہور ہوا۔ مگر اس نگر میں یہ ہاتھیوں کی آخری بہار تھی۔ نیا زمانہ شروع ہو چکا تھا۔ نئی روشنی کی آمد آمد تھی۔ ساتھ میں ایک نئی سواری کی بھی نمود ہونے کو تھی۔ اور وہ نئی سواری ہاتھی کو ایسی ٹکر مارے گی کہ پھر ہاتھی سرکار

دربار میں کہیں نظر نہیں آئے گا۔ سو جب اگلا دربار آراستہ ہوگا تو وہاں موٹر کی جلوہ گری ہوگی اور وہ دربار موٹروں کا دربار کہلائے گا۔ بہر حال اس وقت ہاتھیوں کی بہار تھی۔ اور کرزن دربار کے ٹھاٹ باٹ تھے۔ اور اس دربار کے واسطے سے کرزن صاحب نے کیا ناموری حاصل کی کہ ان کے نام سے ایک اخبار نکلنا شروع ہو گیا۔ مرزا حیرت دہلوی نے اپنے ہفتہ وار کا کرزن گزٹ نام رکھا اور صحافت کے میدان میں شروع ہو گئے۔ ہاں کرزن صاحب کے ساتھ ان کی لیڈی صاحبہ کا نام بھی اس دربار کے ساتھ خوب اچھلا۔ وہ اس تقریب سے کہ محفل رقص جب آراستہ ہوئی تو لیڈی کرزن ایک خاص لباس میں جو مور کے پروں کا لباس سمجھا گیا نمودار ہوئیں اور اپنے انداز سے رقص کیا۔ اکبرالہ آبادی اس مضمون کو لے اڑے اور شعر لکھا۔

ہال میں ناچیں لیڈی کرزن
چھن چھن چھن چھن، چھن چھن چھن چھن

اور کرزن دربار اپنے جلو میں کیا کچھ لایا۔ کچھ دربار شروع ہونے سے پہلے کچھ دربار کے بعد۔ بڑا واقعہ تو یہ ہوا کہ نئی روشنی آ گئی۔ جہان آباد کے بچے کھچے جھاڑ فانوس جھلملانے لگے تھے۔ دلی میں بجلی کی روشنی آن پہنچی تھی۔ الیکٹرسٹی دلی میں 1902ء میں آئی۔ اور اسی کے پیچھے پیچھے ایک نئی سواری بھی آ گئی۔ ٹرام کی سواری۔ قدامت پسندوں نے ان پر بہت اعتراض کیے۔ بجلی کی روشنی کے متعلق کہا کہ یہ محض فضول خرچی ہے۔ اور اس کی ضرورت کیا ہے۔ دلی کلکتہ تھوڑا ہی ہے۔ یہاں تو چاندنی چوک کی دکانیں شام پڑے بند ہو جاتی ہیں۔ ہم جو مٹی کے تیل سے لالٹینیں اور لیمپ جلاتے ہیں یہ روشنی ہماری ضروریات کے حساب سے کافی ہے۔ ٹرام کے متعلق ایک نک چڑھے نے کہا کہ ہماری گلی کے سامنے سے ٹرام گذرتی ہے۔ مگر جتنی دیر میں وہ یہاں سے چاندنی چوک پہنچتی ہے اس سے پہلے میں وہاں پیدل سٹ پٹ کرتا پہنچ جاتا ہوں۔ ایک اور سواری دو پہیوں والی نمودار ہوئی جس کا نام سائیکل تھا۔ مگر سب سے بڑھ کر سواری وہ تھی جس کا نام موٹر کار ہے۔ یہ سواری کم کم نظر آتی تھی مگر بہر حال شہر میں آن پہنچی تھی۔ اور کم کم تو اس وقت نظر آ رہی تھی۔ اگلے دربار تک اس کی بہار دیکھنا۔ اور اگلا دربار اب کونسا دور تھا۔ اس کے لیے تقریب جلدی ہی پیدا ہو گئی۔ ایڈورڈ ہفتم کی بادشاہی لمبی نہیں کھنچی۔ اور عمر بھی ایسی کونسی لمبی پائی۔ بادشاہی کی مدت سمجھ لو کہ نو سال ساڑھے تین مہینے۔ 6 مئی 1910ء کو انتقال ہوا۔ سڑسٹھ سال کے لگ بھگ اس وقت ان کی عمر تھی۔

ایڈورڈ ہفتم کے بعد جارج پنجم تخت پہ بیٹھے اور برطانیہ کی بادشاہی کے ساتھ ہندوستان کی قیصری کے بھی حق دار ٹھہرے۔ ملکہ وکٹوریہ اور ایڈورڈ ہفتم نے اتنا ہی کافی سمجھا تھا کہ ان کے نام کا دربار ہندوستان

میں منعقد ہو جائے۔ مگر جارج پنجم نے طے کیا کہ ہم خود دیارِ ہند میں جا کر اپنا دربار منعقد کریں گے۔ مئی 1910ء میں وہ تخت پر بیٹھے تھے۔ اگلے برس 12 دسمبر 1911ء کو دلی میں دربار منعقد کرنے کا اعلان کر دیا۔

جارج پنجم اپنی ملکہ کے ساتھ 2 دسمبر 1911ء کو بمبئی کے ساحل پر اترے۔ 7 دسمبر کو دلی میں وارد ہوئے۔ 12 دسمبر کو دربار منعقد کیا۔ اس دربار کے ساتھ پہلی بار لال قلعہ پر یونین جیک لہرایا گیا۔ اور لیجیے اس کے ساتھ قصیدے کی روایت کی بھی تجدید ہوگئی۔ دربار میں بار پایا ہو یا نہ پایا ہو بہرحال پنڈت برج موہن دتاتریہ نے پرانی درباری روایت کے حساب سے قصیدہ لکھ ڈالا ؎

آج ہے ہند میں کیا عیش و مسرت کا عمل
مقدم شاہ سے نقشہ گیا عالم کا بدل
قیصر و قیصرہ با کام رہیں دنیا میں
قاف سے قاف تک ان کا رہے دنیا میں عمل
جارج پنجم رہیں تاحشر سلامت یارب
خرم و شاد رہیں راج رہے ان کا اٹل

اور آخر دلی کی قسمت کا فیصلہ بھی جو ٹلتا چلا آ رہا تھا آج ہو گیا۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ برطانوی ہندوستان کا دارالسلطنت اب دلی کو بنایا جائے گا۔ مگر ساتھ ہی میں وضاحت کی گئی کہ یہ شرف موجودہ شہر کو نہیں ملے گا۔ اس کے لیے اسی شہر کے بغل میں نیا شہر بسایا جائے گا۔ اگلے ہی دن نئے شہر کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ اسے آگے چل کر نئی دہلی کے نام سے مشہور ہونا تھا۔

مگر اسی کے ساتھ ایک بدشگنی بھی ہو گئی۔ بدشگنی تو دلی والوں کے حساب سے دربار سجنے سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔ جو شامیانہ بڑے اہتمام سے بطور خاص بادشاہ سلامت کے استقبال کے لیے تانا گیا تھا اس میں آگ لگ گئی۔ دلی والے اس واقعہ کو لے اڑے۔ خاص طور سے بیبیوں کا ماتھا ٹھنکا ''اچھی بی' یہ تو اچھا شگن نہیں ہے۔ فرنگی بادشاہ کے قدم دھرنے سے پہلے ہی بدشگنی ہو گئی۔''

اور اب اس سے بڑی بدشگنی۔ جب نئی دلی کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا تو ایک جلوس نکلا۔ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ بڑے کروفر سے ہاتھی پر سوار لال قلعہ کی طرف رواں تھے۔ مگر ہوا یوں کہ جلوس چاندنی چوک سے گذر رہا تھا کہ ایک گولہ لاٹ صاحب کی سواری پر آ کر گرا۔ مگر لارڈ ہارڈنگ کی ابھی قضا نہیں آئی تھی۔ زخمی ایسے ہوئے کہ بیہوش ہو گئے۔ مگر جان بچ گئی۔

پھر لارڈ ہارڈنگ کو تو ہاتھی سے اتار کر موٹر میں ڈال کر گورنمنٹ ہاؤس بھیج دیا گیا۔ ادھر برات بغیر دولھا کے لال قلعہ میں داخل ہوئی۔

اس طرح پھر پرانی تاریخ دہرائی گئی۔ یہاں ہمیشہ یہی ہوا کہ جب بھی کسی نئے حکمراں نے اپنے شاہانہ غرور میں اپنے نئے دارالسلطنت کی بنیاد رکھی کوئی نہ کوئی بدشگنی ہوگئی۔ اس دفعہ بھی یہی ہوا۔ یہ اس دھرتی کی ریت چلی آتی تھی۔ فرنگیوں میں کونسا سرخاب کا پر لگا تھا کہ یہ دھرتی اس کی خاطر اپنی ریت کو بدل دیتی۔

بہر حال دلی راجدھانی بن گئی۔ مگر ساتھ میں دو نیم ہوگئی۔ دلی کے بغل میں ایک اور دلی کو بسنا تھا۔ وہ نئی دہلی ہوگی۔ یعنی اب دلی کو سوکن کے ساتھ گذر بسر کرنی ہوگی۔ اور خود وہ پرانی دلی کہلائے گی۔ اور پرانی دلی کا معاملہ یہ تھا کہ وہ بیشک پرانی تھی۔ ماقبل تاریخ اور تاریخ کی گنتی صدیاں اس کے اندر سانس لے رہی تھیں۔ لیکن اب تو زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ وہ خود نیا رنگ پکڑتی جا رہی تھی۔ جھاڑ فانوس، موی شمعیں، مشعلیں، کڑوے تیل سے جلتے دیئے، اب روشنیوں کے اس پورے قافلہ کا چل چلاؤ تھا۔ کچھ روشنیاں بجھ گئی تھیں، کچھ مندی پڑ گئی تھیں۔ نئی روشنی شہر میں آن پہنچی تھی۔ بجلی کی چکا چوند پھیلتی جا رہی تھی۔ نئی روشنی نئی سواریاں۔ اب جب ریل چھک چھک کرتی دلی کی حدود میں داخل ہوتی تو اس کی سیٹی کی آواز چاندنی چوک تک پہنچتی تھی۔ شہر کے اندر ٹرام کی پٹریوں کا جال پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ عجلت پسندوں نے اکے ٹم ٹم کو سلام کر لیا تھا۔ اب وہ سائیکل نام کی دو پہیوں والی سواری پر دوڑتے پھرتے تھے۔ سب سے بڑھ کر موٹر کی سواری۔ اور موٹر کی سواری نے جارج پنجم والے دربار کے ساتھ ایسا زور باندھا اور اس فراٹے سے چلی کہ ہاتھی کی سواری باد بہاری بمعہ سونے چاندی کی عماری بہت پیچھے رہ گئی۔ اور یہ دربار تو دلی والوں کے حساب سے تھا ہی موٹروں کا دربار۔ جو راجہ مہاراجہ اس دربار کے ہنگام ہاتھی پر سوار نظر آئے تھے۔ آگے چل کر وہ بھی موٹروں ہی میں سوار نظر آئیں گے۔ سمجھو کہ ہاتھی معہ ہودا غائب۔ اور ایک ہاتھی ہی پر موقوف تھوڑا ہی تھا۔ رتھ پالکی نالکی ساری ہی روایتی سواریاں موٹر کے مقابلہ میں آ کر چھکڑا بن گئیں اور بس جیسے معدوم ہوا چاہتی ہوں۔ ادھر اکہ تانگہ سے مار کھا گیا۔ شہسواروں کے پٹ جانے سے گھوڑے کی خود مختار حیثیت پہلے ہی ختم ہوگئی تھی۔ اب گھوڑا تانگہ میں جت کر ان راہوں پر دوڑ رہا تھا جہاں آگے سپاہی پیشہ گھوڑوں پہ سوار نظر آیا کرتے تھے۔

حویلیاں کہ اپنی جگہ ایک تہذیب تھیں بنگلوں اور کوٹھیوں کے لیے جگہ خالی کر رہی تھیں۔ اور حویلیاں اب یہاں کہاں رہ گئی تھیں۔ سن ستاون کی قیامت میں فرنگی احکامات کے تحت کیسی کیسی حویلی

ڈھائی گئی کہ ایک ایک حویلی کے انہدام کے بعد وہاں پورا پورا محلّہ آباد ہوا۔ جو حویلیاں منہدم ہونے سے بچ گئیں ان کے مکین اب اتنے خستہ حال ہو گئے تھے کہ اپنی حویلیوں کو اونے پونے بیچ کر انہوں نے اپنے آئندہ کے گذارے کا سامان کیا۔ خریدنے والے مختلف مزاج رکھتے تھے۔ انہوں نے ان حویلیوں کو ڈھا کر بنگلے تعمیر کیے' دکانیں بنائیں۔ اور جب حویلیاں گئیں تو ان کے ساتھ دیوان خانے بھی گئے۔ دیوان خانوں کے ساتھ جھاڑ فانوس گئے' حقہ پیچوان گئے' پاندان پیک دان گئے۔ دیوان خانے اب شہر میں رہ ہی کتنے گئے تھے۔ ایک دیوان خانہ نواب فیض احمد خاں کا' ایک دیوان خانہ لالہ سری رام کا' ایک دیوان خانہ لالہ پارس داس خزانچی کا اور ایک دیوان خانہ خاندان شریفی والوں کا۔ بس لے دیکے انہیں دیوان خانوں میں یہ نقشہ دیکھا جا سکتا تھا کہ چھت میں جھاڑ فانوس لٹکے ہوئے' دیواروں پر بزرگوں کی قلمی تصویریں آویزاں۔ ان کے برابر برابر کچھ طغرے کچھ کتبے۔ فرش پر دری' دری پر چاندنی' وسط میں ایرانی قالین۔ ان پر دیواروں کے برابر برابر گاؤ تکیے رکھے ہوئے۔ ان پر پھول دار غلاف چڑھے ہوئے۔ درمیان میں حقہ پیچوان پاندان پیک دان قرینے سے دھرے ہوئے۔ دہلیز میں پائے دانوں کی جگہ مرگ چھالیں بچھی ہوئیں۔ دروازوں پر کھاروے کے پردے لٹکے ہوئے۔ باہر پالکی کھڑی ہوئی یا فٹن۔ اب ان دیوان خانوں کی بجائے بنگلے اور کوٹھیاں نمود کر رہی تھیں اور ان کے ڈرائنگ روم جہاں صوفے کرسیاں اور میزیں آراستہ تھیں۔ چاندنی غائب۔ قالین البتہ تھے۔ حقے پیچوان کی جگہ سگریٹ۔ باہر پورچ میں موٹر کھڑی ہوئی۔ مگر موٹر ابھی تک زیادہ تر فرنگیوں کی پورچوں ہی میں نظر آتی تھی۔ دربار کے ایک ڈیڑھ سال بعد ڈاکٹر انصاری دلی میں آ کر رہے تو انہوں نے دریا گنج میں رہنے کے لیے ایک کوٹھی خریدی اور سواری کے لیے ایک موٹر۔ اور نرائنی گپتا کی تحقیق یہ ہے کہ اس وقت شہر میں صرف دو ہندوستانیوں کے پاس موٹر تھی۔ ڈاکٹر انصاری کے پاس اور ڈاکٹر ایچ سی سین کے پاس۔

ڈاکٹر انصاری کے دلی میں آ کر رہنے کا مطلب یہ تھا کہ یونانی طب کے اس گہوارے میں نئی طب ایلوپیتھک نے بھی راہ پائی تھی۔ اور کس شان سے راہ پائی کہ ایک ڈاکٹر تو حکیموں کے گھر ہی میں پیدا ہو گیا۔ حکیم نابینا نامی گرامی حکیم۔ ان کے بھائی مختار احمد انصاری نے ڈاکٹر بن کر نام پیدا کیا۔ اور اب اس شہر میں خالی حکیموں کے مطب ہی نہیں تھے بلکہ کئی ایک ہسپتال بھی کھل گئے تھے۔ ان میں ایک دو زنانہ ہسپتال بھی تھے۔ ہر چند کہ دلی کی خلقت علاج معالجہ کے لیے حکیم اجمل خاں کی طرف لپکتی تھی یا حکیم نابینا کی طرف دوڑتی تھی مگر اب مریض ڈاکٹروں سے بھی رجوع کرتے اور ہسپتالوں کی طرف لپکتے بھی نظر آتے تھے۔

اب سے پہلے کون یہ تصور کرسکتا تھا کہ اس شہر میں جہاں یونانی طب کا طوطی بولتا ہے ڈاکٹروں کی بھی پوچھ ہوگی۔ مگر اب وہ وقت آ گیا تھا کہ طبیبوں کی عوامی مقبولیت کے باوصف ڈاکٹروں کا بھی اثر ورسوخ بڑھ رہا تھا۔ بس اسی سے اندازہ لگا لیجیے کہ دلی اب کتنی بدل گئی تھی اور نیئے زمانے نے اس روایتی شہر میں کتنا رسوخ حاصل کرلیا تھا۔

مگر چوک جامع مسجد جوں کا توں تھا۔ وہی نقشہ تھا اور کم وبیش اتنا ہی آباد دکھائی دیتا تھا۔ کٹورا بجتا ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ آدمی سے آدمی بھڑ کر چلتا ہے۔ سیلانیوں کی ریل پیل ہے۔ بانکوں چھیل چھبیلوں کی چہل پہل ہے۔ کیا آن بان ہے۔ کیا سج دھج ہے۔ بر میں پھول دار چکن کا کرتا' سر پہ ترچھی ٹوپی سلمہ ستارے اس میں ٹنکے ہوئے۔ کلائی میں بیلے موتیا کا ہار لپٹا ہوا۔ کان میں عطر کا پھویا ٹھنسا ہوا۔ کلے میں گلوری دبی ہوئی۔ البلے گہلے پھرتے ہیں۔ کبھی لال پدڑیوں پر ریجھتے ہیں کبھی کبوتروں کا بھاؤ تاؤ کرتے ہیں۔ کبھی تیتر بٹیر کے پنجروں کی طرف لپکتے ہیں۔ پرندوں کے پنجروں سے ہٹ کر رنگا رنگ خوانچے سجے ہیں۔ چاٹ بارہ مسالے والی۔ چنا جور گرم بابو۔ دہی بڑے' بڑے چٹپٹے۔ فیرنی کی طشتریاں' قلفیاں' شربت فالودہ' چٹورے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ سیخ کباب گرما گرم۔ کباب ادھر سیخ سے اترا' ادھر چٹورے کے منھ میں گیا۔ ہونٹ چاٹتے اٹھے۔ قریب سے گذرتے سقے کو پکارا ''بہشتی میاں' اپنے آب حیات سے ہماری بھی پیاس بجھاؤ۔'' بہشتی میاں نے مشک کا دہانہ کھول کر چاندی ایسے چمچماتے کٹورے میں ٹھنڈا ٹھنڈا پانی انڈیل کر پیش کیا۔ غٹا غٹ پانی پیا اور آگے بڑھ لیے۔ آگے لکڑ والا ایک بڑا سا حقہ لیے کھڑا ہے۔ حقے کی نے ہونٹوں کے بیچ دبائی۔ گرڑ گرڑ چار گھونٹ لیے۔ طبیعت سیر ہوگئی۔ تنبولی سے ایک ایک گلوری لے کر کلے میں رکھی۔ عطر فروش سے ایک ایک پھویا خس کے عطر کا لیا اور کان میں ٹھونس لیا۔ خس کی مہک جواڑی تو دماغ عرش معلی پہ پہنچ گیا۔ تان اڑائی ؏

وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دست ناتواں سے

یہ تو تھی کرخنداری مخلوق۔ ان کی اپنی ادا ہے۔ اپنی زبان اپنا لہجہ۔ مگر یہ جو ایک بزرگ ہیں۔ لمبا قد' گوری رنگت' چوڑا ماتھا' بڑی بڑی ابلی ہوئی آنکھیں۔ اردوئے معلی میں بات کرتے ہیں۔ مگر تھوڑا ہتلاتے ہیں۔ لوگ انہیں مرزا چپاتی کہتے ہیں۔ اصل میں تو وہ صاحب عالم مرزا فخر الدین تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے بھانجے۔ مرزا فخر الدین سے مرزا فخرو ہوئے۔ مرزا فخرو سے مرزا چپاتی بن گئے۔ قلعہ میں پلے بڑھے۔ بادشاہ کی طرف سے اولیا اللہ کے مزاروں پر عرس کے موقعوں پر چپاتیاں تقسیم کرنے پر مامور تھے۔ مانگنے

والے شور مچاتے' مرزا چپاتی' مرزا چپاتی۔ بس پھر مرزا چپاتی ہی ان کا لقب پڑا۔ آگے قلعہ معلیٰ میں عیش کرتے تھے۔ اب چوک جامع مسجد میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ مگر بچ کیسے گئے۔ بس قسمت اچھی تھی یا کہہ لو کہ قسمت میں خواری لکھی تھی۔ جب قلعہ خالی ہونے لگا تو ایک رفیق کی ہمراہی میں بادشاہ سے الگ نکل بھاگے اور آگرہ میں جا کر دم لیا۔ امن وامان ہوا تو پھر دلی میں آن دھمکے۔ اب زمانہ اور تھا۔ شہزادگی کا دور ختم۔ اب بے در بے گھر ہیں۔ مگر شہزادگی کے زمانے کے سارے شوق برقرار ہیں۔ شطرنج بازی' پتنگ بازی' کبوتر بازی' مرغ بازی۔ یعنی مرغ بھی بہت لڑائے۔ اور کبوتر اڑاتے اڑاتے نیا شوق پالا کہ طوطے بھی اڑانے شروع کر دیئے۔ جب تک پیسہ رہا سارے شوق پورے کیے اور اللے تللے سے گذاری۔ مگر پھر عسرت نے آلیا تو پھر اپنی پتنگ بازی کے شوق ہی سے گذر بسر کی صورت پیدا کی۔ ایک چھوٹی سی دکان کھول لی اور پتنگیں بنا بنا کر بیچنی شروع کر دیں۔ برکھارت میں اپنا ٹانڈا بانڈا لے کر قطب پہنچ جاتے ہیں۔ پہلے یہاں آ کر پیچ لڑاتے تھے۔ اب کسی گوشے میں بیٹھ کر پتنگیں بنا بنا کر بیچنی شروع کرتے ہیں۔

شاعر ایسے کہ ذرا اشارہ کرو اور فوراً رواں ہو جائیں گے۔ دلی کی ڈیرہ دار طوائف دونی جان۔ جوانی میں کیا ٹھسا تھا۔ کیا طرح داری تھی۔ مگر اب عمر ڈھل رہی تھی۔ مرزا صاحب نے کیا خوب چوٹ کی ؎

گھٹتے گھٹتے ہو گئی اتنی ملٹ
چار پیسے کی دونی رہ گئی

ایک یار نے مرثیے کا مصرعہ کہا ع

سرِ عدو کا ہو نہیں سکتا مرے سر کا جواب

اور پھر مرزا چپاتی کی طرف دیکھا۔ مرزا چپاتی نے فوراً گرہ لگا کر شعر پورا کیا۔

شہ نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے
سرِ عدو کا ہو نہیں سکتا مرے سر کا جواب

یہ تھے مرزا چپاتی۔ اور ذرا انہیں دیکھو۔ کھلتا ہوا رنگ' پتلی سی ناک' میانہ قد' دبلے پتلے' سفید چگی ڈاڑھی' بر میں انگرکھا' چست پاجامہ' سر پہ دو پلی۔ سامنے چاندی کی کٹوری میں افیون گھلی رکھی ہے۔ ابھی چسکی لگائیں گے اور پھر داستان شروع کریں گے۔ یہ ہیں میر باقر علی داستان گو۔ اقبال نے داغ کو جہان آباد کا آخری شاعر کہا تھا۔ انہیں جہان آباد کا آخری داستان گو جانو۔ جہان آباد کا قصہ تمام ہوا۔ ان کی داستان جاری ہے۔ اور پھر وہ خود بھی تو ایک اچھی خاصی داستان ہیں۔ ایک وقت تھا کہ ان کی داستان گوئی

کی دھوم دور دور تک تھی۔ ریاست پٹیالہ کے دربار میں یاد کیے گئے۔ اس دربار کا ایک دستور یہ تھا کہ جو بھی دربار میں حاضری دیتا اس کے لیے لازم تھا کہ سر پہ صافہ باندھ کر حاضری دے۔ میر صاحب نے یہ سنا تو کہا کہ جس شخص کو میرے حلیے پر اعتراض ہے اس سے میرے ہنر کی قدر دانی کی کیا توقع ہوسکتی ہے۔ یہ کہا اور واپس دلی جانے کے لیے تیار ہوئے۔ مہاراجہ کو یہ اطلاع ملی تو اس نے میر صاحب کے لیے صافے کی شرط ختم کر دی۔ اور میر باقر علی کلابتون کی گول ٹوپی سر پہ سجا کر دربار میں پہنچے۔ کتنے زمانے تک اس دربار سے وابستہ رہے۔ مہاراجہ گذر گئے تو واپس دلی آ گئے۔ پھر کتنے زمانے تک لالہ چھنامل کے یہاں داستان سنانے کا فرض ادا کرتے رہے۔ ان کا یہ مربی بھی جب گذر گیا تو پھر بے آسرا ہو گئے۔ اب کبھی حکیم اجمل خاں کے دیوان خانے میں کبھی نواب فیض احمد خاں کے دیوان خانے میں داستان سناتے نظر آتے۔ اور داستان سنانے کے سلسلہ میں کیا اہتمام ہوتا تھا۔ چاندنی بچھی ہے۔ سامعین چاندنی پہ بیٹھیں گے۔ داستان گو کے لیے ایک چھوٹا سا تخت بچھایا گیا ہے۔ پان اور حقے کا دور چل رہا ہے۔ میر صاحب نے ایک کٹورا پانی طلب کیا۔ جیب سے چاندی کی ڈبیا نکالی اور چاندی کی چھوٹی سی کٹوری۔ ڈبیا سے افیون کی گولی نکال کر اسے روئی میں لپیٹا۔ پیالی میں تھوڑا پانی انڈیل کر روئی میں لپٹی افیون گھول کر چسکی لی۔ پھر چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ اور لیجیے اب داستان شروع ہوتی ہے۔

مگر زمانہ بدلتا چلا جا رہا ہے۔ داستان کے رسیا زمانے کے ساتھ رخصت ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اب میر باقر علی نے کتری ہوئی چھالیاں بیچنی شروع کر دی ہیں۔ کوئی پوچھتا تو کہتے کہ دلی والے پان کھانے کا سلیقہ بھول چکے ہیں۔ انہیں یہ بھولا سلیقہ سکھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ساتھ میں چھوٹی چھوٹی داستانیں لکھ کر خود ہی چھاپتے ہیں، گلی گلی گھوم کر خود ہی بیچتے ہیں۔ داستان سننے کے لیے کوئی نہیں بلاتا تو خود ہی گھر میں محفل سجانی شروع کر دی ہے۔ جو سننا چاہے وہ ایک آنہ ادا کرے اور محفل میں شریک ہو جائے۔ نماز عشا کے بعد نو بجے داستان سنانا شروع کریں گے۔ گیارہ بجے تک سنائیں گے۔ ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

یہ ہوئی پرانی دلی یعنی جہان آباد کی تلچھٹ۔ اس تلچھٹ سے فرنگی حاکموں کو کیا اندیشہ ہوسکتا تھا۔ میر باقر علی داستان گو اور مرزا چپاتی بھلا ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ مگر ہوا یہ کہ ادھر دلی کے راجدھانی بننے کا اعلان ہوا ادھر نئے زمانے کی سوغاتیں شہر میں پہنچنا شروع ہو گئیں۔ نئی روشنی اور نئی سواریاں تو خود فرنگی اپنے شوق سے یہاں لائے تھے۔ مگر بنگال کے شورش پسند اور دہشت پرست اپنے زور پر یہاں پہنچے۔ فرنگیوں کی

ایک مصلحت اس شہر کو راجدھانی بنانے کی یہ بھی تھی کہ اس طرح بنگال کے شورش پسندوں سے پیچھا چھوٹے گا۔ دلی والوں کا دم خم سن ستاون کے ساتھ چلا گیا۔ اب تو وہاں راوی چین لکھتا تھا۔ لیکن چین تو بس جامع مسجد کی سیڑھیوں تک تھا جہاں البلے گہلے پھرتے سیلانیوں کو پتہ ہی نہیں تھا کہ زمانہ کس رخ جا رہا ہے۔ ادھر یہاں سے چار قدم کے فاصلہ پر چاندنی چوک میں نقشہ کچھ سے کچھ ہو چکا تھا۔ اب یہ جہان آباد والا چاندنی چوک تھوڑا ہی تھا جہاں بیچوں بیچ نہر بہتی تھی اور دائیں بائیں آم جامن برگد نیم اور مولسری کے مہکتے درختوں کی چھاؤں میں پالکیاں نالکیاں، شاہانہ عماریوں والے ہاتھی، کیسی کیسی سواری باد بہاری رواں دواں نظر آتی تھی۔ اب وہ نہر خشک ہو چکی تھی اور درخت کٹ چکے تھے۔ اب یہاں مختلف مذاہب کے مناظرہ بازوں نے مورچے قائم کیے ہوئے تھے۔ مناظروں کا شور تھا۔ جلد ہی ایک شور اور اس میں شامل ہو گیا۔ سیاسی جلسوں کا شور۔ 1911ء کے دربار کے آتے آتے کچھ اور گل کھلے۔ حاکم اپنی نئی راجدھانی میں بعد میں پہنچے۔ پہلے بنگالی شورش پسند لپ چھپ کر یہاں پہنچے اور مورچے جما کر بیٹھ گئے۔ ادھر مولانا محمد علی بھی اپنے 'کامریڈ' کا تام جھام لے کر یہاں آن پہنچے۔ اور یہاں آکر انہوں نے ساتھ میں ایک اردو اخبار بھی 'ہمدرد' کے نام سے نکال لیا۔ ڈاکٹر انصاری پہلے ہی آن پہنچے تھے اور محض ڈاکٹر بنے رہنے پر قانع نہیں تھے۔ سیاست میں کودنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ ادھر حکیم اجمل خاں بھی اب اپنے مطب تک محدود رہنے کے قائل نظر نہیں آتے تھے۔

ادھر کچھ نوجوان نئی تعلیم کے شوق میں علی گڑھ گئے تھے۔ سر سید احمد خاں نے اس شہر میں بیٹھ کر مسلمانوں کے لیے انگریزی تعلیم کا ڈول ڈالا تھا اور اس مقصد سے ایک کالج کھولا تھا۔ یہ نوجوان وہاں سے ایک نیا شعور اور ایک نئی ٹوپی لے کر پلٹے۔ سر پہ دو پلی ٹوپی منڈھ کر گئے تھے۔ اب ایک پھندنے والی اونچی لال ٹوپی سر پہ سجا کر پلٹے۔ دلی والوں نے اس پر انگلیاں اٹھائیں اور اسے نیچری ٹوپی کہہ کر بدنام کیا۔ مگر جلد ہی اس کا نام بدل کر ترکی ٹوپی ہو گیا۔ اور وہ مسلمانوں کی اسلامی شناخت بن گئی۔ ہندوؤں نے اس کے مقابلہ میں فیلٹ کیپ کو اپنایا۔ لیجیے ہندو ٹوپی الگ، مسلمان ٹوپی الگ۔ یہ بھی نئے زمانے کا شاخسانہ تھا ورنہ دلی میں ہندو مسلمان کی ٹوپی ہی کیا پورا لباس یکساں تھا سوائے اس کے کہ ہندو ہوا تو انگرکھے کی گھنڈی دائیں طرف، مسلمان ہوا تو بائیں طرف۔ مگر اب تو انگرکھا ہی رخصت ہو رہا تھا اس کی جگہ اچکن آ گئی تھی۔ ساتھ میں جوتی بھی بدل گئی۔ سلیم شاہی رخصت۔ اس کی جگہ فیتے والے شو نے لے لی۔ اور اب دیوانوں بیٹھکوں میں گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھنے کا رواج تو ختم ہو رہا تھا اس لیے جوتا اتار کر داخل ہونے کا تکلف بھی

گیا۔ ڈرائنگ روم کی تہذیب یہ تھی کہ جوتوں سمیت وہاں داخل ہوکر صوفے پر ڈٹ جایئے۔

تو چوک جامع مسجد والا پرانا نقشہ بھی تھا اور نیا نقشہ بھی جمتا چلا جارہا تھا۔ یعنی اب دلی میں نئے پرانے کی کھچڑی بن چلی تھی۔ مگر فرنگی حاکموں نے نئی دہلی کی بنیاد رکھ کر دلی پر پرانی دلی کی مہر لگادی تھی۔ اور نئی دہلی کے ظاہر ہونے میں اب کونسی دیر رہ گئی تھی۔ تعمیر شروع ہوچکی تھی۔ نئی دہلی کے ظہور کا وقت قریب آن پہنچا تھا۔ پرانی دلی اپنے ماضی کو لیے بیٹھی رہے۔ مستقبل نئی دہلی کا ہے۔ اور ماضی کو بھی وہ کب تک لیے بیٹھی رہے گی۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر لال پدڑیاں طوطا مینا تیتر کبوتر کب تک بکیں گے۔ ابھی تو نصف صدی کے آتے آتے ایک اور قیامت اس نگر پہ ٹوٹنی ہے۔ کوئی نئی بات نہیں۔ گذرتا زمانہ سدا سے یہی کھیل کھیلتا چلا آرہا ہے ؎

ظفرؔ احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ ہیں اور کیا کیا پیشتریاں تھے

محبت کا آخری ابال

جہاں آباد ایک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔ مغلیہ سلطنت کے آفتاب کے چڑھنے کے ساتھ چڑھی تھی۔ وہ غروب ہوا تو یہ بھی اتر گئی۔ مگر قیامت گذر جانے کے بعد جب پھر سے دھیرے دھیرے کر کے زندگی کا نقشہ جما تو ایک شائبہ سا پیدا ہوا کہ جہاں آباد کی دھوپ ابھی کچھ کچھ باقی ہے۔ مگر 1911ء میں منعقد ہونے والے دربار میں جب دلی کو دارالسلطنت بنانے کا اعلان ہوا اور نئی دہلی کی بنیاد رکھی گئی تو یہ شائبہ سمجھو کہ ختم ہو گیا۔ مگر ادھر چوک جامع مسجد کی گہما گہمی میں کسی کو پتہ ہی نہ چلا کہ اس دربار کی دھوم دھام میں ان کے شہر کے ساتھ کیا واقعہ گذر گیا۔ چچا کبابی اپنی اسی آن کے ساتھ سیخ کباب بناتے رہے۔ اور مرزا چپاتی اپنی اسی وضع کے ساتھ پتنگیں بناتے اور مانجھا سوتتے رہے۔ مرغی انڈا اسی طرح بکتا رہا۔ اسی طرح لال پدڑی کبوتر کا کاروبار جاری رہا۔ چوک کی رونق میں ذرا جو درہمی پیدا ہوئی ہو۔ باقی شہر کی معاشرتی زندگی اور تہذیبی فضا میں جو فرق پڑنا تھا پہلے ہی پڑ چکا تھا۔ پرانی دلی نئی بنتی چلی جا رہی تھی۔ مگر پرانا نقشہ سمٹ سمٹا کر جن گوشوں میں رہ گیا تھا وہاں اپنی اسی آن بان کے ساتھ قائم تھا۔ سو نواب فیض احمد خاں، لالہ سری رام، لالہ پارس داس اور خاندان شریفی کے دیوان خانوں میں جھاڑ فانوس اب بھی جھلملا رہے تھے اور ان دیوان خانوں میں جمع ہونے والے بزرگوں کی وضع برقرار تھی۔

خاندانِ شریفی کے دیوان خانے کی رونق اب حکیم اجمل خان کے دم سے تھی۔ ذرا تصور کی آنکھ سے دیکھو کیسا کیسا وضعدار بزرگ اس دیوان خانے میں آ کر شریک محفل ہوتا ہے۔ امام جامع مسجد، نواب فیض احمد خاں، نواب سائل دہلوی، نواب تاباں دہلوی۔

نواب سائل دہلوی کیا خوب بزرگ تھے۔ شاہد احمد دہلوی نے انہیں دیکھا تھا۔ سو یوں بیان کیا

ہے "میدہ و شہاب رنگ، گول چہرہ، سفید براق ڈاڑھی، سنہری فریم کی عینک، سر پر چوڑی زرکار لیس کی مخملی ٹوپی، قریب سے دیکھو تو اس پر زردوزی میں سائل دہلوی لکھا ہوا، چست پجامہ، چوڑیاں پنڈلیوں تک چڑھی ہوئیں، پاؤں میں سلیم شاہی، بائیں ہاتھ میں چاندی کی مٹھ کی چھڑی، دائیں ہاتھ میں چھ انچ لمبا سگار۔" شاعری میں اپنے وقت کے استاد۔ داغ کے داماد۔ اپنی شاعری کو اسی دامادی کا انعام جانتے تھے اور فخر کرتے تھے ع

جناب داغ کے داماد ہیں ہم دلی والے ہیں

اپنی غزل اور دامادی دونوں کے حساب سے اپنے آپ کو داغ کا جانشین جانتے تھے۔ مگر شہر میں غزل کا ایک اور استاد بیٹھا تھا جس نے داغ کے رنگ میں کہہ کہہ کر کشتوں کے پشتے لگا دیئے تھے۔ وہ بھی داغ کی جانشینی کے مدعی تھے۔ تو لیجیے استادوں میں ٹھن گئی۔ اور دو گروہ بن گئے۔ کچھ سائل کے فدائی، کچھ بیخود کے پروانے۔ جب یہ لڑائی زیادہ بڑھی تو سائل صاحب نے مشاعروں میں جانا ہی چھوڑ دیا۔

شاعری اپنی جگہ پتنگ بازی اپنی جگہ۔ غزل بھی خوب کہتے تھے، پتنگ بھی خوب بناتے تھے۔ اسی حساب سے مانجھا سونتتے تھے۔ کڑہائی بھی اچھی کرتے تھے اور کہتے ہیں کہ ہنڈیا پکانے بیٹھتے تو وہ بھی خوب پکاتے تھے۔ باقی رہی نوابی تو اب تو بس نام کے نواب تھے کہ نوابی کے حق سے تو ان کے والد صاحب اپنے وقت ہی میں محروم ہو گئے تھے۔ انگریز نے اس شک میں کہ انہوں نے جنگ آزادی میں کسی طور حصہ لیا تھا، لوہارو کی نوابی ان سے چھین کران کے چچا کو بخش دی۔ سو آخر عمر میں یہ وقت آ گیا کہ سائل صاحب نے ایک رکشا رکھ لی تھی۔ اسی میں گھومتے پھرتے تھے۔ شومئی قسمت کہ ایک دن رکشا الٹ گئی اور ان کی کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ روتے تھے اور کہتے تھے "ایک وقت تھا کہ ابا حضور کا ہاتھی ڈیوڑھی پر آتا تو میں لپک کر اس کی دم پکڑ کر اوپر جا بیٹھتا۔ اب رکشا کی سواری قسمت میں لکھی گئی جس سے یہ نوبت آ گئی کہ دوسروں کے سہارے اٹھتا بیٹھتا ہوں۔"

نواب سائل کے بڑے بھائی نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں۔ وہی بھائی والا رنگ و روپ، وہی ڈیل ڈول، وہی سج دھج۔ مگر مزاجوں میں زمین و آسمان کا فرق۔ وہ حلیم الطبع، یہاں غصہ ناک پہ دھرا رہتا تھا۔ مزاج کے خلاف ذرا سی کوئی بات ہوئی اور یہ تن پھن ہوئے۔ ان کے غصے کا سب سے بڑا ہدف تو خود سائل صاحب تھے۔ وہ سخت سُست کہہ رہے ہیں اور یہ سر جھکائے سن رہے ہیں اور سخت سُست بھی ایسی ویسی۔ گالیوں پر یہ اتر آتے تھے۔ اور ایک سے ایک نئی گالی تراشتے تھے۔ سائل صاحب کی کیا مجال کہ

جواب دیں۔ چھوٹے بھائی جو ہوئے۔ بس اتنا ہی کہتے تھے ''بھائی جان' آدھی مجھ پر پڑ رہی ہیں' آدھی خود آپ پر۔''

مگر یہ بھی ہوتا تھا کہ سائل صاحب نے جان کر چھیڑا اور تاباں صاحب ابل پڑے۔ محفل گرم تھی۔ حکیم اجمل خاں نے تاباں صاحب کو چپ بیٹھے دیکھا۔ دل میں گدگدی پیدا ہوئی۔ سائل صاحب کو اشارہ کیا۔ سائل صاحب نے اشارہ سمجھا اور تاباں صاحب سے مخاطب ہوئے ''بھائی صاحب۔ گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ ہمارے استاد داغ نازک خیالی اور جذبات آفرینی میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ قادر الکلامی ان پر ختم تھی کہ گھنٹے بھر میں پچاس پچاس شعر کہہ ڈالتے تھے۔''

داغ سائل صاحب کے استاد تھے۔ ہوا کریں۔ مگر شاید اسی وجہ سے تاباں صاحب داغ سے خار کھاتے تھے۔ بھائی کی بات سنی اور تاؤ میں آ کر بولے ''داغ کیا جانیں کہ شعر کیا ہوتا ہے۔ قلم برداشتہ لکھنا کوئی معیار سخن دانی تو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو کہہ مصرعہ۔ ابھی گرہ لگاتا ہوں۔

سائل صاحب نے فوراً ایک مصرعہ داغا ع

شفق بن کر چڑھا ہے چرخ کے سر پر لہو میرا

تاباں صاحب نے فوراً گرہ لگائی ؎

عدو میرا' نہ تو میرا' نہ چرخ فتنہ جو میرا
شفق بن کر چڑھا ہے چرخ کے سر پر لہو میرا

اہل محفل پھڑک اٹھے۔ بیساختہ داد دی۔ مگر تاباں صاحب کا دیکھتے دیکھتے پارہ چڑھ گیا۔ بھائی کو بے نقط سنائیں۔ اور بھائی ہے کہ چھیڑ کر سر جھکائے چپ بیٹھا ہے۔

جو شخص داغ کو خاطر میں نہیں لاتا تھا وہ مولانا شبلی کو کیا گانٹھتا۔ مگر مولانا شبلی جب دلی آئے اور حکیم اجمل خاں کے مہمان ہوئے تو تاباں صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ حکیم صاحب نے کیا خوب عقلمندی دکھائی کہ خود ان کے ساتھ نہیں گئے۔ کسی اور صاحب کو ان کے ہمراہ کر دیا۔ خیر تاباں صاحب بڑی گرمجوشی سے ملے۔ اپنی طرف سے بہت تواضع کی۔ مولانا شبلی کی فرمائش پر اپنی غزل بھی سنائی۔ مگر انہوں نے دیکھا کہ ہم شعر سنائے چلے جا رہے ہیں اور مولانا ہیں کہ شعر سنتے ہیں اور پی جاتے ہیں۔ ذرا جو کسی شعر پہ داد دی ہو۔ ایک شعر سناتے ہوئے کہا ''حضرت والا' یہ شعر توجہ کا طلبگار ہے۔'' مولانا شبلی نے اب ذرا ہنکارا بھرا اور شعر پر داد دی۔ بس تاباں صاحب ابل پڑے۔ لال پیلے ہو کر بولے ''ابے او لنگڑے شبلی' میں

نے تو تین دن سر کھپا کر یہ شعر لکھا۔ تو نے منٹ بھر میں اسے کیسے سمجھ لیا۔ یہ شعر العجم 'نباشد' غزل ہے۔ کہہ کے دیکھو......'' آگے جو ٹکڑا لگایا وہ اچھی بھلی گالی تھی۔ بیچارے مولانا شبلی کو لینے کے دینے پڑ گئے۔

ادھر استاد بیخود دہلوی اپنی استادی کی ٹر میں تھے۔ استاد سائل ہوا کریں داغ کے داماد۔ داغ کے جانشین تو آخر کے تئیں یہی ٹھہرے۔ غزل کہتے تھے' کبوتر اڑاتے تھے' شکار کھیلتے تھے۔ تینوں ہی مشغلوں میں استاد ہونے کے مدعی تھے۔ اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے گپ ہانکنی پڑے تو وہ بھی خوب ہانکتے تھے۔ شکار کے ہنر میں اپنے کمال کی کیا خوب مثال پیش کی۔ سنایا کہ ایک دفعہ وہ مہاراجہ گوالیار سے کہ ان کا مداح تھا ملاقات کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ گوالیار پہنچ کر خیال آیا کہ مہاراجہ کو تو اپنے آنے کی اطلاع ہی نہیں دی۔ ابھی یہ سوچتے تھے کہ آسمان پر نظر گئی جہاں کونجوں کی ایک ڈار اڑتی نظر آئی۔ امین الدین سے کہ ساتھ میں آئے تھے کہا کہ لانا میری بندوق۔ بندوق ہاتھ میں آئی تو اس شان سے فائر کیا کہ بقول ان کے ایک کونج ان کے قدموں میں گر کر تڑپنے لگی۔ دوسری اس گھر میں گری جہاں انہیں قیام کرنا تھا۔ اور تیسری راج محل میں عین مہاراج کے سامنے گری۔ میزبان سمجھ گیا کہ ہو نہو۔ استاد بیخود کا کارنامہ ہے۔ سو جب ان کے گھر پہنچے تو وہاں دستر خوان پہ بھنی ہوئی کونج سجی تھی۔ ادھر مہاراجہ نے کونج کو دیکھ کر تاڑ لیا کہ بیخود صاحب گوالیار میں وارد ہو گئے ہیں۔

اگلے دن مہاراجہ کے ہمراہ شیر کے شکار کے لیے نکلے۔ اس کا قصہ یوں سنایا ''شیر سامنے آیا تو سب سے پہلے مہاراجہ نے گولی چلائی۔ مگر نشانہ خطا ہو گیا۔ شیر نے بپھر کر چھلانگ لگائی اور مہاراجہ کے ہاتھی سے جا چمٹا تب میں نے گولی چلائی اور شیر دم کے دم میں ڈھیر ہو گیا۔''

شکاری بلا کے۔ کبوتر باز قیامت کے۔ جب چھت پر جا کر کبوتر اڑاتے تو پھر ان کی جان کبوتروں میں ہوتی۔ ایسے میں کوئی ملنے والا آ جاتا تو استاد سے سخت سُست سن کر ہی اس گھر سے نکلتا۔ ایک واقف کار ایسے وقت میں اپنے صاحبزادے کو لے کر ان کے یہاں پہنچے جب وہ چھت پر تھے اور ان کی ٹکڑی آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ بہت بے مزہ ہوئے۔ بڑبڑاتے ہوئے نیچے آئے۔ واقف کار نے مٹھائی کی ٹوکری نذر کی اور کہا کہ ''ہمارا صاحبزادہ شعر کا شوق رکھتا ہے۔ اسے اپنی شاگردی میں لے لیجیے۔''

بولے ''صاحبزادے' اپنی کہی ہوئی کوئی غزل سناؤ۔''

صاحبزادے نے شعر ناموزوں پڑھا۔ بس بھڑک اٹھے ''نکل میرے گھر سے۔'' ایسے برسے کہ باپ بیٹے کو بھاگتے ہی بن پڑی۔

اور مرزا حیرت دہلوی۔ آفت کی پڑیا۔ بلا کے فتنہ پرور۔ پہلے ہی کیا کم تھے۔ کرزن گزٹ' نکال کر تو قیامت بن گئے۔ جس پر لکھا اس کے خلاف ہی لکھا۔ اور خلاف بھی ایسا ویسا۔ جس پر لکھتے اس کی پگڑی اچھالتے۔ بس یہی کرتے رہتے تھے۔ آج حکیم اجمل خاں کے لتے لے رہے ہیں۔ کل مولانا محمد علی کی خبر لے رہے ہیں۔ ارے انہوں نے تو امام مظلوم کو بھی نہیں بخشا۔ واقعہ کربلا سے ہی انکار کر دیا۔ استدلال یوں کیا کہ یہ واقعہ روایت کے مطابق گرمی کے موسم میں ہوا لیکن ذرا موسمی حساب کر کے دیکھو۔ ہجری کے جس برس میں کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ گذرا اس برس محرم کا مہینہ جاڑوں کے موسم میں آیا تھا۔

ان کے اس موقف پر بہت لے دے ہوئی۔ مگر اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی کمال دیکھو کہ ذاکری خوب کرتے تھے۔ اور ملا واحدی کے بیان کے مطابق ذکر شہادت اس سوز سے کرتے تھے کہ مجلس میں گریہ کا شور بپا ہو جاتا تھا۔

مگر ایک دن اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا۔ ان کی جو شامت آئی تو خواجہ حسن نظامی سے ٹکر لے بیٹھے۔ مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی میں ٹھنی ہوئی تھی۔ مرزا صاحب مولانا محمد علی کے طرفدار بن کر اس جھگڑے میں کود پڑے۔ خواجہ صاحب کے خلاف انہوں نے جو کچھ لکھا اس کا جواب جلدی ہی مل گیا۔ اپنی دکان پر بیٹھے تھے۔ کوئی بگڑا دل آ کر ان سے بھڑ گیا۔ اور ایسا بھڑا کہ پاؤں سے جوتا نکال کر ایسا تاک کر مارا کہ مرزا صاحب کے منہ پر جا کر لگا۔

یہ تو دلی کے بزرگ تھے۔ مگر ان کے بیچ اب مولانا محمد علی نے بھی آ کر اپنے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ انگریزی کا اخبار' کامریڈ' تو ساتھ لے کر آئے تھے۔ یہاں آ کر اردو کا بھی ایک اخبار' ہمدرد' کے نام سے نکال لیا۔ یک نہ شد دو شد۔ ان کے اخباروں نے شہر کا مزاج ہی بدل دیا۔ وہ شہر میں سیاسی نعرے لگاتے داخل ہوئے تھے۔ ادھر وہ آئے ادھر جنگ طرابلس شروع ہوگئی۔ دلی کے مسلمان بھڑک اٹھے۔ نزلہ اس کا ترکی ٹوپی پر گرا۔ مسجد فتحپوری کے سامنے ترکی ٹوپیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ اس ڈھیر میں آگ لگا کر دلی والوں نے اٹلی کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ دلی کے مسلمانوں نے کتنی ہچر مچر کے ساتھ اس ٹوپی کو قبول کیا تھا ورنہ شروع میں تو اسے انہوں نے نیچری ٹوپی کہا اور رد کر دیا۔ رفتہ رفتہ اسے قبولیت ملی۔ مگر ابھی وہ سر چڑھی ہی تھی کہ سروں سے اتری اور احتجاجی الاؤ کا ایندھن بن گئی۔ بات یہ ہے کہ یہ ٹوپی اٹلی سے درآمد ہوتی تھی۔ اٹلی کے خلاف اپنا غصہ دکھانے اور نکالنے کی یہی صورت لوگوں کو نظر آئی کہ جو مال وہاں سے برآمد ہوتا ہے اسے نذرِ آتش کیا جائے۔

مگر دلی میں یہ پہلی آگ نہیں تھی۔ ترکی ٹوپی سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد کی 'امہات الامۃ' کا ڈھیر لگا تھا اور اسے آگ لگائی گئی تھی۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھو کہ ڈپٹی نذیر احمد سچے پکے مسلمان۔ قرآن شریف کے مترجم مگر محاورے کے چسکے میں امت کی مقدس ماؤں کے بارے میں کچھ اس رنگ سے لکھا کہ مسلمانوں نے اسے ان مقدس بیبیوں کی شان میں گستاخی جانا۔ بس بھڑک اٹھے۔ جب تک اس کتاب کو ڈھیر کر کے آگ نہ لگا دی اس وقت تک ان کے غصے کی آگ نہیں بجھی۔ ویسے اس کتاب کی تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ آگے چل کر جب دوسری دفعہ چھپی تو پھر اس کا یہی انجام ہوا۔

جنگ طرابلس کے موقع پر غم و غصے کا مظاہرہ تو صرف آغاز تھا۔ اس کے بعد تو دلی والوں کا پارہ چڑھتا ہی چلا گیا۔ 14ء میں جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ یہ جنگ اپنے جلو میں سلطنت عثمانیہ کی تباہی کا سامان لے کر آئی۔ سلطنت کے پارہ پارہ ہونے کے ساتھ ترکی کی جان کے لالے پڑ گئے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس سے جانا کہ خلافت خطرے میں ہے۔ اس مرحلہ پر آ کر مسلمان ایک مرتبہ پھر انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو گئے ورنہ جنگ کے شروع میں تو انہوں نے برطانیہ کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔ انگریزوں کے خلاف اس صف آرائی نے مسلمانوں اور ہندوؤں میں ایک اتحاد کی فضا پیدا کر دی۔ دلی میں اس اتحاد کا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ جب مارچ 1917ء میں اس شہر میں حکیم اجمل خاں کی سرکردگی میں طبی کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کی صدارت پنڈت مدن موہن مالویہ نے کی اور جب 24 مارچ کو مدرسۂ طبیہ کا سالانہ اجلاس ہوا تو اس کی صدارت سر سنکرن نائر کر رہے تھے۔ حکیم اجمل خاں اس شہر میں ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار بن کر نمایاں ہوئے۔ اور جب اگلے برس دلی میں مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس پہلو بہ پہلو منعقد ہوئے تو ان کا ایک پیر مسلم لیگ کے اجلاس میں تھا' دوسرا پیر کانگریس کے اجلاس میں۔ اور دونوں جلسوں میں فضا ایک ہی رنگ سے گرم تھی۔ دونوں جگہ نظر بندوں کی رہائی کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ نظر بند کون۔ سب سے بڑھ کر علی برادران۔

1919ء میں رولٹ ایکٹ پاس ہوا۔ اسے ہندوؤں مسلمانوں دونوں ہی نے کالا قانون جانا۔ گاندھی جی نے اعلان کر دیا کہ 30 مارچ کو ہڑتال ہو گی۔ اس اعلان کے ساتھ پورے ہندوستان میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا مگر دوسرے شہروں میں طوفان بعد میں آیا۔ سب سے پہلے بلکہ وقت مقررہ سے پہلے دلی میں طوفان کھڑا ہوا۔ ہوا یوں کہ ہڑتال کی تاریخ پہلے 30 مارچ مقرر ہوئی تھی لیکن پھر اسے ملتوی کر کے 6 اپریل مقرر کی گئی۔ مگر دلی شہر عجلت پسند نکلا۔ جو طوفان ہندوستان کے باقی شہروں میں 6 اپریل کو آیا وہ دلی

میں 30 مارچ ہی کو اٹھ کھڑا ہوا۔ بازار بند' دکانیں مقفل' سواری غائب نہ اکے تانگے' نہ ٹریم' نہ کاریں' چوک جامع مسجد ویران' چاندنی چوک میں سناٹا' چاوڑی چوپٹ' نہ ہزاری بزاری نہ چھیل چھبیلے سیلانی' نہ کٹورا بجتا ہے نہ بیلا موتیا مہکتا ہے۔ ہاں جلوس نکلتے ہیں' نعرے لگتے ہیں۔ فرنگی انتظام معطل ہے۔ ایک حکیم اور ایک سوامی مل کر شہر پر راج کر رہے ہیں۔ ان کے منہ سے بات نکلی اور ہندو مسلمان دونوں کے لیے حکم کا درجہ اختیار کر گئی۔ حکیم ہیں اجمل خاں اور سوامی ہیں شردھانند۔ ان دنوں دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ اور مسلمان سوامی جی سے اتنے خوش ہوئے کہ انہیں جامع مسجد میں لے گئے اور سوامی جی نے ایک مقبول رہنما کی حیثیت سے شاہجہانی مسجد میں قدم رکھا اور مسلمانوں کو جو وہاں کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے خطاب کیا۔

ادھر امرتسر میں جلیانوالہ باغ والا سانحہ گذر گیا۔ لیجیے ایک نئی قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ دلی کے چیف کمشنر کو بجا طور پر فکر ہوئی کہ اس خبر سے دلی میں کہیں قیامت نہ مچ جائے۔ شہر کی معتبر شخصیتوں کو اکٹھا کر کے مشورہ طلب کیا۔ یہ اجتماع ٹاؤن ہال میں ہوا۔ لوگوں کو پتہ چل گیا۔ وہ تو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ یہ اشارہ ملا تو گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ دیکھتے دیکھتے ٹاؤن ہال کے گرد ایک مجمع اکٹھا ہو گیا۔ کسی نے اڑا دی کہ جو رہنما یہاں آئے ہیں انہیں حراست میں لے لیا جائے گا۔ مجمع آگ بگولا ہو گیا۔ ٹاؤن ہال کا گھیراؤ کر لیا۔ اس نازک موقع پر یہی دو رہنما حکیم اجمل خاں اور سوامی شردھانند چیف کمشنر کے آڑے آئے۔ انہوں نے باہر نکل کر مجمع کو خطاب کیا۔ آگ بگولا مجمع رام ہو گیا۔

اگلے دن یہ دونوں رہنما شہر کے گشت پر نکلے۔ دکانداروں کو سمجھایا بجھایا کہ دلوں کا غبار نکل گیا۔ اب دکانیں کھولو اور اپنا کاروبار شروع کرو۔ سوامی شردھانند قصابوں کے پاس گئے کہ بھائی بہت ہو گئی۔ ہڑتال ختم کرو اور اپنا کام شروع کرو۔ قصابوں نے ان کی بات مانی اور اپنا کام شروع کر دیا۔ یہی کہ جانور ذبح کیے اور گوشت بیچنا شروع کر دیا۔

لیجیے ہڑتال ختم ہوئی۔ بازار کھل گئے۔ کاروبار شروع ہو گئے۔ سودا سلف بکنے لگا مگر حاکموں کی رگِ حاکمیت پھڑکی۔ اپنی حاکمیت کے غرے میں پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ پولیس بازاروں میں آن دھمکی۔ پھر تناؤ پیدا ہو گیا۔ بازار کھلے نہ تھے کہ بند ہونے لگے۔ پھر خلقت ٹاؤن ہال کے سامنے جمع ہو گئی۔ احتجاجی مظاہرہ شروع ہو گیا۔ پولیس نے اب زور دکھایا اور بندوقیں تان لیں۔ گولی چلی۔ ایک شخص گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ باقی بہت سے زخمی ہو گئے۔

مرنے والے کا جنازہ دھوم سے نکلا۔ پچاس ہزار سوگواروں نے میت کو کاندھا دیا۔

یہ تھا اب دلی کا نقشہ۔ شعر و شاعری کی محفلیں موقوف۔ اب جلسوں جلوسوں کا زور تھا۔ فضا نعروں سے گونج رہی تھی۔ جلیانوالہ باغ کے سانحہ پر جو طوفان اٹھا تھا وہ تھوڑا ٹھنڈا پڑا تو خلافت کا مسئلہ گرم ہو گیا۔ اور کیا قیامت کی تحریک اٹھی کہ کتنے رفیقوں کتنے بزرگوں کی جیسے کایا کلپ ہو گئی ہو۔ اور علی برادران' وہ کیا تھے کیا ہو گئے۔ پہلے تو دونوں ہی مسٹر تھے' مولانا اب بنے۔ مسٹر شوکت علی جب دیکھو سوٹ بوٹ میں ملبوس۔ ڈاڑھی صاف' مونچھیں لمبی لمبی' لمبے تڑنگے' بھاری بھرکم۔ کرکٹ کے منجھے ہوئے کھلاڑی۔ افیون کے محکمے میں افسر۔ خلافت تحریک نے کیسی کایا کلپ کی کہ سوٹ بوٹ اتار پھینکے' ڈاڑھی بڑھالی' مونچھیں مختصر کیں۔ اب حلیہ یہ تھا بر میں ڈھیلا ڈھالا کرتا' اس کے ساتھ چوڑے پائینچوں والا پجامہ' سر پر چاند تارے والی ٹوپی۔ لمبے قد بھاری بھرکم جثے پر یہ لباس خوب سجا۔ خلافتئے' ساتھ میں خادم کعبہ کا لقب۔ کیسی کرکٹ۔ اب خلافت میں سر دھڑ کی بازی لگائی ہوئی تھی۔ لاہور کے میاں فیض الدین نقیب خلافت بن کر ان کے ساتھ شہر شہر گھومتے پھرتے تھے۔ یہ فلک شگاف نعرے لگاتے تھے۔ خادم کعبہ مولانا شوکت علی گھن گرج کے ساتھ تقریر کرتے تھے۔

ان کے بھائی محمد علی۔ آگے یہ بھی مسٹر محمد علی تھے۔ گوری رنگت' ڈاڑھی صاف' مونچھیں چڑھی ہوئیں۔ کوٹ پتلوان ڈانٹے ہوئے۔ جب سیاست میں آئے اور خلافتئے بنے تو دم کے دم میں نقشہ ہی بدل گیا۔ کوٹ پتلون سے کنارہ کیا۔ کرتا پائجامہ' سر پہ چاند تارے والی ٹوپی۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی۔ اب وہ مولانا تھے اور تقریر اور تحریر دونوں میں رواں۔ ابھی گرج برس رہے تھے۔ اب رو رہے ہیں۔ آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ جذباتی جو ہوئے۔

اور دونوں کی والدہ بی اماں۔ تحریک خلافت نے ماں بیٹوں کو کیا شہرت اور عزت بخشی کہ ان کے حوالے سے نئی طرح کی شاعری ہونے لگی جسے چاہو تو تحریک خلافت کی لوک شاعری کہہ لو ؎

بولیں اماں محمد علی کی' جان بیٹا خلافت پہ دیدو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی' جان بیٹا خلافت پہ دیدو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا' کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحاں میں اترنا' جان بیٹا خلافت پہ دیدو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے' کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دین احمدؐ کے رستے' جان بیٹا خلافت پہ دیدو

حشر میں حشر برپا کروں گی، پیش حق تم کو لے کر چلوں گی
اس حکومت پہ دعوے کروں گی، جان بیٹا خلافت پہ دیدو

تحریک زوروں پر تھی۔ مختلف صوبوں میں خلافت کمیٹیاں قائم ہو چکی تھیں۔ ایک خلافت کمیٹی دلی میں قائم ہوئی۔ اس کمیٹی کے صدر حکیم اجمل خاں تھے۔ اس کے زیر اہتمام 23 اور 24 نومبر 1919ء کو کل ہند خلافت کانفرنس کا اہتمام ہوا۔ اس میں گاندھی جی کو بھی مدعو کیا گیا اور سوامی شردھانند کو بھی۔ انہیں بتایا گیا کہ ایجنڈے میں خلافت کے تحفظ کے ساتھ گئور کھشا کا مسئلہ بھی شامل ہے۔

گاندھی جی نے کتنی کشادہ دلی سے جواب دیا کہ اگر خلافت کا مسئلہ جائز ہے اور میرے خیال میں تو وہ جائز ہے تو ہندوؤں کو مسلمانوں کا ساتھ بہر حال دینا چاہیے۔ گائے کا سوال درمیان میں لانا جائز نہیں۔

مگر مسلمان رہنماؤں نے اس سوال کو بھی درمیان میں لانا جائز سمجھا۔ اور یوں خلافت کے ساتھ گائے بھی تحریک خلافت کا حصہ بن گئی۔ اور کیا خوب بنی کہ کیا گائے کیا بکری بی اماں نے اپنے گھر میں گوشت کی ہنڈیا ہی پکانی چھوڑ دی۔ اور حکیم اجمل خاں نے دلی کے مسلمانوں کو سمجھانا شروع کیا کہ ہندوؤں کے ساتھ اتنی مروت تو برتو کہ گائے کا گوشت کھانا چھوڑ دو۔ گوشت کھانا ہی ہے تو بکری کا گوشت کھاؤ۔ مولانا محمد علی نے مسئلہ کا حل یہ سوچا کہ بکری کا گوشت اتنا سستا ہو جائے کہ وہ گائے کے گوشت کی قیمتوں کی سطح پر آ جائے۔ پھر لوگ خود ہی گائے کا گوشت کھانا چھوڑ دیں گے۔ گائے کا گوشت تو اسی وجہ سے کھایا جاتا ہے کہ وہ سستا ملتا ہے۔

بہر حال دلی کی حد تک اس مہم کا اچھا خاصا اثر ہوا۔ نرائنی گپتا کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ دلی میں 1919ء میں 250 گائیں ذبح ہوئی تھیں۔ 1920ء میں کل ملا کر 29 گائیں ذبح ہوئیں۔

ادھر گاندھی جی کہہ رہے تھے کہ خلافت مسلمانوں کی مقدس گائے ہے۔ ہمیں اس کے تحفظ کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ اور سوامی شردھانند دلی کی مسجدوں میں جا جا کر تقریریں کر رہے تھے۔ گھن گرج کے ساتھ ایک تقریر اگر جامع مسجد میں کی تو اتنی ہی گھن گرج کے ساتھ دوسری تقریر مسجد فتحپوری میں جا کر کی۔ ان تقریروں کی مقبولیت دیکھ کر حکومت نے پابندی لگا دی کہ مسجد میں بس نماز ہوگی، تقریریں نہیں ہوں گی۔ تو یوں سمجھو کہ مذہبی رواداری اور وسیع المشربی جو جہان آباد کی تہذیب، کا خاصہ تھی دلی کی زندگی میں واپس آ گئی تھی۔

مگر آگے چل کر پتہ چلا کہ یہ بس باسی کڑی کا ابال تھا۔ یا کہہ لیجئے کہ بندھا تھا عہد بودا۔ ایک جھٹکے میں ٹوٹ گیا۔ گاندھی جی کا اعلانِ التوا بس ایسا ہی جھٹکا تھا۔ تحریک خلافت کے ساتھ جو سول نافرمانی شروع ہوئی تھی اس کے قائد تو گاندھی جی تھے۔ سول نافرمانی بہت زور شور سے شروع ہونے لگی تھی۔ مگر اچانک اس میں تشدد کا رنگ پیدا ہو گیا۔ چوری چورا کا واقعہ گذر گیا۔ گورکھپور کی اس چھوٹی سی بستی میں مظاہرین ایسے مشتعل ہوئے کہ تھانے کو آگ لگا دی۔ کتنے پولیس والے اس آگ میں جل مرے۔ یہ عمل تو گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد کی نفی تھا۔ بس انہوں نے فوراً ہی تحریک کے التوا کا اعلان کر دیا۔

اس اعلان نے تو سب کچھ تلپٹ کر دیا۔ اتحاد و یکجہتی کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ خلافت کانفرنس کانگریس سے خفا۔ کانگریس کے رہنما ایک دوسرے سے بگڑے ہوئے۔ ہندو مسلمان سے بدکا ہوا۔ مسلمان ہندو سے بیزار۔ خلافتی لیڈر کہ کل تک گاندھی جی کا دم بھرتے تھے کہ جہاں ان کا پسینہ گرتا وہاں اپنا خون دینے کے لیے تیار ہو جاتے اب ان سے روٹھے روٹھے پھرتے تھے۔ کل تک اس مہاتما پر انہیں کتنا اعتبار تھا۔ اب اس کی نیت میں کھوٹ نظر آنے لگا۔

ہندو مسلمانوں میں کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔ بس اسی میں فساد شروع ہو گئے۔ پہلے کوہاٹ سے فساد کی خبر آئی۔ پھر ملتان سے۔ اور کوہاٹ کا فساد کیسا ظالم تھا کہ مولانا شوکت علی اور گاندھی جی میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ گاندھی جی کے سب سے بڑے فدائی تو یہی دو بھائی تھے۔ محمد علی اور شوکت علی۔ اب وہ ان سے فرنٹ ہو گئے۔

گاندھی جی نے ہندو مسلم ایکتا کے لیے مرن برت کر کے بھی دیکھ لیا۔ اس کا بھی کتنا اثر ہوا۔ وقتی طور پر تو بہت ہوا۔ یہ مرن برت گاندھی جی نے دلی میں آ کر مولانا محمد علی ہی کے گھر بیٹھ کر کیا تھا۔ مولانا محمد علی نے بہت منت سماجت کی کہ گاندھی جی اپنی جان پر رحم کرو اور برت توڑ دو۔ جب وہ کسی صورت ٹس سے مس نہ ہوئے تو بازار سے ایک گائے خرید کر لائے اور گاندھی جی کے سامنے اسے لا کر کھڑا کر دیا۔ گاندھی جی نے گائے کو بہت محبت اور پیار سے دیکھا مگر برت پھر بھی نہ توڑا۔ جب کانگریس کے سب رہنماؤں نے بمعہ علی برادران، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری قسمیں کھائیں کہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے ہم اپنی جانیں قربان کر دیں گے تب انہوں نے برت توڑا۔ مگر برت سے پیدا ہونے والی فضا کتنے دن برقرار رہی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد تو کوہاٹ کا فساد ہو گیا جس نے آخر کے تئیں گاندھی جی اور علی برادران کے بیچ تفرقے کا بیج بو دیا۔

ملتان کے فساد نے پنڈت مدن موہن مالویہ کو ایسا مشتعل کیا کہ انہوں نے مسلمانوں پر تین حرف بھیجے اور سنگھٹن کی تحریک شروع کر دی۔ اس کے جلو میں شدھی کی تحریک آئی۔ سوامی شردھانند نے اپنے آپ کو اس تحریک سے وابستہ کر لیا۔ دلی میں مسلمانوں کے ساتھ جو سوامی جی کا رومانس چل رہا تھا وہ ختم۔ حکیم اور سوامی کی یاری کٹ ہو گئی۔ مسلمانوں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ سنگھٹن اور شدھی کے جواب میں تبلیغ اور تنظیم کے ناموں سے اتنے ہی جارحانہ رنگ سے تحریکیں شروع کر دیں۔

مسجدوں میں جانا اور تقریریں کرنا' بی اماں کے باورچی خانے سے گوشت کی ہنڈیا کا دیس نکالا' علی برادران کا سبزی خور بن جانا' گاندھی جی کا تحریک خلافت کے ساتھ ہنی مون۔ بس دیکھتے دیکھتے یہ سب کچھ رفت گذشت ہو گیا۔ اب زمانہ اور تھا۔ بی اماں نے پھر سے گوشت کی ہنڈیا پکانی شروع کر دی تھی اور محمد علی شوکت علی سبزی خوری سے توبہ کر کے پھر سے گوشت خور بن گئے تھے۔ گوشت کا سالن کھاتے تھے اور گاندھی جی کو بے نقط سناتے تھے۔ سوامی شردھانند اب شدھ ہندو تھے اور شدھی کے بہت بڑے پرچارک۔ وہ مسلمانوں کے دشمن۔ مسلمان ان کی جان کے بیری۔ مولانا ظفر علی خاں کا شعر وردِ زبان ؂

پڑا ہے سنگھٹن سے اور شدھی سے ہمیں پالا
ادھر اس بھڑ نے کاٹا ہے ادھر وہ سانپ ڈستا ہے

بس پھر دونوں طرف پارہ چڑھتا ہی چلا گیا۔ فساد آج یہاں کل وہاں۔ دلی کیسے بچی رہتی۔ فضا کشیدہ ہوتی چلی گئی۔ حکیم اجمل خاں کی کوششوں سے ہندو مسلم رہنما شریف منزل میں جمع ہوئے۔ کشیدگی کو کم کرنے کے لیے بہت تجویزیں پیش ہوئیں اور بہت تقریریں ہوئیں۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ 1924ء کے بیچ جولائی میں فساد پھوٹ پڑا۔ آگے بقر عید تھی۔ اب سے بڑھ کر فساد اس موقع پر ہوا۔ امن چاہنے والے رہنماؤں کی کوششوں پہ پانی پھر گیا۔ حکیم اجمل خاں کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ نرائنی گپتا نے اس پر یوں تبصرہ کیا ہے۔

''1924ء کے فساد کے بعد اجمل خاں نے امن کے لیے جو کوششیں کیں وہ سب بے اثر گئیں۔ ناکامی ایک پورے دور کے خاتمہ کا اعلان تھا۔ اس واقعہ کے بعد یوں سمجھو کہ شاہجہاں آباد کی روح جیسے ٹمٹماتا چراغ ہو جس کی لو اب اور مدھم پڑ گئی۔''

فساد کے ساتھ یہ لو مدھم ہوئی تھی۔ مگر اس کے بعد ایک دھماکہ ہوا۔ شہر میں تہلکہ پڑ گیا۔ لو جو مدھم پڑ گئی تھی بالکل بجھ گئی۔ پتہ چلا کہ وہ جو پچھلے برسوں میں ہندو مسلم اتحاد کے روح پرور مظاہرے ہوئے تھے

اور سوامی جی نے مسجدوں میں جا جا کر تقریریں کی تھیں اور نمازیوں کے دلوں کو گرمایا تھا وہ چراغ کے بجھنے سے پہلے بھڑک اٹھنے کی مثال تھی۔ چراغ بھڑک کر بجھ گیا۔ یا کہہ لو کہ جہاں آباد کے تابوت میں آخری کیل ٹھنک گئی۔ ہندو مسلمان کے بیچ نفرت کی خلیج پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی۔ اب اس بیچ خون کی لکیر بھی کھنچ گئی۔ اب اس لکیر کو مٹنا کہاں تھا۔ اسے تو آگے چل کر خون کی ندی بننا تھا۔

دوسری طرف اب شمع پوری طرح روشن تھی۔ بارہ کھمبے سے اس طرف نئی دہلی کا نقشہ جم چکا تھا۔ انگریز کی راجدھانی شاد آباد نظر آ رہی تھی۔ سچ مچ کا ایک نیا نگر نئے چراغوں' بجلی کے قمقموں کی روشنی میں جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ نئے بازار اپنی کشادہ راہوں اور کشادہ دکانوں کے ساتھ آراستہ تھے۔ وسیع و عریض پارک' چوڑی گلیاں' روشن کوچے' نئی طرز کے مکان یعنی آنگن' چھجے' چوبارے' اونچے پھاٹک سب غائب۔ اب نئے طرز کے گیٹ تھے۔ اندر قدم رکھو تو پہلے گھاس کے تختے' آگے پورچ۔ یہ مکان نہیں کوٹھیاں تھیں۔ اندر جاؤ تو دیوان خانہ غائب۔ نہ چاندنی نہ مسند نہ گاؤ تکیے۔ نہ حقے اور اگالدان' نہ گلوریوں سے سجی طشتریاں۔ نہ مہمانوں میزبانوں کی وہ پرانی سج دھج یعنی نہ بر میں انگرکھا نہ سر پہ پگڑی یا ٹوپی نہ پیروں میں سلیم شاہی جوتی۔ ساتھ میں جوتیاں باہر اتارنے کا تکلف بھی گیا۔ سوٹ ان کا ملبوس' پیروں میں بوٹ' سر پر ہیٹ۔ بے تکلف ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور صوفوں کرسیوں پر ڈٹ گئے۔ باہر نکلے تو موٹر پورچ میں کھڑی ہے۔ ہاتھیوں گھوڑوں کا زمانہ گذر گیا۔ ساتھ میں پالکی نالکی بھی گئی اور ڈولی یہاں کیوں نظر آئے گی ع

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا
جو صاحب کی سواری وہی میم صاحب کی سواری۔

یہ نیا دارالسلطنت ہے۔ نئی اس کی تہذیب ہے۔ جہان آباد قصہ ماضی ہوا۔ رہے نام اللہ کا۔

کتابیات

1- آثار الصنادید — سر سید احمد خاں
2- واقعات دار الحکومت دہلی — بشیر الدین احمد
3- سیر المنازل (اردو ترجمہ) — مرزا سنگین بیگ
4- داستانِ غدر — ظہیر دہلوی
5- چراغِ دہلی — میرزا حیرت دہلوی
6- بزمِ آخر — منشی فیض الدین
7- لال قلعہ کی ایک جھلک — سید ناصر نذیر فراق دہلوی
8- دلی کا آخری دیدار — سید وزیر حسن دہلوی
9- قلعۂ معلیٰ کی جھلکیاں — عرش تیموری
10- دلی کی چند عجیب ہستیاں — اشرف صبوحی
11- میرے زمانے کی دلی — مُلّا واحدی
12- اجڑا دیار — شاہد احمد دہلوی
13- بزمِ خوش نفساں — شاہد احمد دہلوی
14- چند ادبی شخصیتیں — شاہد احمد دہلوی
15- عالم میں انتخاب...... دلی — مہیشور دیال
16- اوراقِ مصور — پروفیسر خلیق احمد نظامی
17- مرحوم دلی کی ایک جھلک — مرتبہ شمیم احمد
18- دلی والے — مرتبہ ڈاکٹر صلاح الدین

19- ذکرِ میر — اردو ترجمہ، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی
20- کلیات میر — مرتبہ: کلب علی خاں فائق
21- آب حیات — مولانا محمد حسین آزاد
22- خطوط غالب — اسد اللہ خاں غالب
23- مضامین فرحت — فرحت اللہ بیگ
24- رسوم دہلی — سید احمد دہلوی
25- بیلہ میں میلہ — راشد الخیری
26- سیر دہلی — خواجہ حسن نظامی
27- قدیم لکھنؤ کی آخری بہار — مرزا جعفر حسین
28- گذشتہ لکھنؤ — عبدالحلیم شرر
29- اجمل اعظم — انتظار حسین
30- کلیاتِ سودا — مرزا رفیع سودا
31- فرہنگ آصفیہ — سید احمد دہلوی

رسائل و جرائد

32- دلی کالج میگزین — دلی نمبر مطبوعہ 1959ء
مرتبہ: سید مظفر علی
33- خیال، لاہور — سن ستاون نمبر
مرتبہ: ناصر کاظمی
انتظار حسین

انگریزی کتابیں

1- Mahabharate — English Translation
By Pratab Chand Roy

2- Mediaeval India	Stanley Lane Poole
3- City of Djinns	William Dalrymple
4- Zakaullah of Delhi	C.F.Andrews
5- Chronicles of the Mutiny	P.J.O.Taylor
6- A Star Shall Fall	P.J.O.Taylor
7- Cry For Freedom	Compiled by Salimuddin Qureshi
8- Bahadur Shah	S.M.Burke & Salimuddin Qureshi
9- Delhi Between Two Empires	Narayani Gupta

انتظار حسین

چراغوں کا دھواں

اجمل اعظم

مجموعہ: جنم کہانیاں

قصہ کہانیاں

ناول: بستی

تذکرہ

چاند گہن

آگے سمندر ہے

افسانے: خیمے سے دور

زمین اور فلک اور

آخری آدمی

کنکری

دن اور داستان

خالی پنجرہ

گلی کوچے

کچھوے

شہر افسوس

شہرزاد کے نام

ملاقاتیں

تراجم: گھاس کے میدانوں (ناول) چیخوف

فلسفہ کی نئی تشکیل (فلسفہ) جان ڈیوی

An Unwritten Epic & other Stories

سفرنامے: نئے شہر پرانی بستیاں

زمین اور فلک اور

Rs. 250.00

www.sang-e-meel.com
ISBN 969-35-1491-2
9789693514919